

لاہور کی ایڈیشن

ہنگام

خدیجہ مستور

نہیں روٹے

۵۰ پیسے

لائبریری اڈیشن

آنگن

ناول

خدیجہ مستور

کتابی دنیا - لکھنؤ

معیاری ادب

ارزاں قیمت

ندیم لالہ

کے

نام

ٹیلیفون

۲۶۳۳۵

پبلشر :- انظر نگرامی - کتابی دنیا - لکھنؤ
پرینٹر :- سرفراز قومی پریس لکھنؤ

(۱)

سردیوں کی رات کتنی جلدی سُنان ہو جاتی ہے۔ آج بھی شام سے بادل
 چھا گئے تھے۔ خنکی بڑھ گئی تھی۔ کھڑکی کے پاس لگے ہوئے بجلی کے کھمبے کا بلب خاموشی سے جل
 رہا تھا۔ گلی کے اس پار اسکول کی ادھ بنی عمارت کے قریب درختوں کے جھنڈ سے آلو کے بولنے
 کی آواز آرہی تھی اس کی آواز کی نحوست رات کو اور بھی سُنان کے جا رہی تھی۔
 پاس کے بڑے کمرے میں اب قطعی خاموشی تھی۔ تھپی کے کورڈ میں بدنے کی آہٹ بھی محسوس
 نہ ہوتی تھی۔

سودھی ہو مزے میں۔ عالیہ نے بڑی حسرت سے سوچا۔ اسے نیند نہ آرہی تھی۔
 رات کو نیند نہ آنا کتنا تکلیف دہ احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس اس وقت تو اور بھی شدید ہوتا
 ہے جب بالکل نئی جگہ ہو۔ شاید نئی جگہوں کی پہلی رات اسی طرح بے خوابی سے گزرتی ہوگی
 اس نے ایک بار پھر سو جانے کی کوشش کی۔ کھڑکی کے پٹ پھیرنے سے ننھے سے کمرے میں
 بالکل اندھیرا چھا گیا اور وہ لحاف میں مُنہ چھپا کر اس طرح لیٹ گئی جیسے واقعی سو رہی ہو
 دیر تک بے سُدھ پڑے رہنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ ساری جدوجہد بے کار گئی
 نیند کا تو کو سول پتہ نہ تھا۔ ماضی کی یادیں بگولے کی طرح دماغ میں ٹوٹیں لگا رہی تھیں۔

وہ بڑی بے بسی سے اپنے بستر پر ملتھی مار کر بیٹھ گئی۔ کھڑکی کے پٹ کھول کر باہر دیکھنے لگی گلی کے اس پار اسکول کی عمارت، آم اور پیل کے گھنے درخت، سب اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شام کو یہ سب کچھ کتنا صاف اور خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی میں بیٹھ کر اس نے یہ سب کچھ ذرا دیکھی سے دیکھا تھا مگر اس وقت اندھیرے میں درخت سیاہ پہاڑوں کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ اور جب ہوا کا تیز جھونکا چلتا تو یہ درخت بچپن میں سنی ہوئی کہانیوں کے بھوتوں کی طرح خون ناک معلوم ہوتے تھے۔

اس طرح تو نیند آنے سے رہی۔ اس نے سوچا اور کھڑکی کے پٹ کھینچ کر بند کر دیئے بیٹھے ہوئے اسے اپنا جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ سارے دن کی سفر کی بے چینی نے کہیں کا نہ رکھا تھا۔

ہائے بھئی۔ وہ کراہی۔ اب نیند نہیں آتی۔ جب تک دماغ کی دنیا دیران نہ کی جائے نیند کا کہاں سے گزر ہو۔ ماضی کی یادیں ہر طرف سے درآتی چلی آ رہی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ماضی کو بھول جاؤ۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے میں کیا رکھا ہو۔ آگے بڑھے جاؤ۔ پر اسے تو ورثے میں صرف اپنا ماضی ہی ملا تھا۔ ماضی جس سے اس نے کیا کچھ نہیں سیکھا اب وہ اس سے کس طرح رامن بچائے۔ جن حالات میں وہ یہاں آئی تھی ان کی وجہ سے تو اور بھی یادوں نے سر اٹھا رکھا تھا۔

جانے اماں بھی سوئی ہوں گی یا نہیں۔ گھر میں کیسی خاموشی طاری تھی گلی میں کوئی راہ گیر ٹھٹھری ہوئی آواز میں گاتا گزر گیا۔

مفت ہوئے بد نام سنور یا تیرے لیے

یہ رات کس طرح گزرے؟ آبا جیل میں تمھاری رائیں کس طرح گزر رہی ہوں گی! اس نے جیسے بیلا کر گھٹنے پیٹ میں اڑا لیے۔ دور کہیں سے گھڑ پال کے گیارہ بجانے کی آواز

آ رہی تھی۔

ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ یہ ہوا کے جھونکوں میں آتی ہوئی بو چھارکھڑکی کے
ٹیپوں پر تھم لے میں گنگنا رہی تھی۔

اب یہ زندگی کیسی ہوگی؟ اس نے جیسے ڈر کر سوچا۔ کمرے میں اتنا
اندھیرا تھا۔ اسے اپنے سوال پر اسی طرح اندھیرا چھایا ہوا محسوس
ہوا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ نیند تو اب بھی کوسوں دور تھی پر ماضی کی یادیں اس کی
رات کوٹانے کے لیے پاس آ بیٹھی تھیں۔

وہ ایک اجازت ضلع تھا۔ سُرخ سُرخ اینٹوں کے مکانات اس طرح بنے ہوئے تھے
کہ کسی ترتیب کا خیال ہی نہ آتا۔ بس ایسا محسوس ہوتا کہ کسی نے اٹھا کر بکھیر دیے ہیں وہاں
اس چھٹی سی جگہ میں کتنے بہت سے مندر تھے۔ ان کے سُنہرے کلس سر اٹھائے جیسے
بھگوان کی پرارتھنا کرتے رہتے۔ مندروں میں صبح دشا م گھنٹے بجتے۔ پجاریوں کے بھجن
گانے کی تھم تھم آواز گھرنک آتی۔

وہاں درخت کس قدر تھے۔ دُھول سے اٹی ہوئی کچی سڑکوں پر دونوں طرف آم
جامن اور پیل کے گھنے درخت تھے ان درختوں کے سائے میں راہ گیر انگوچھے بچھائے
گھڑیاں سر کے نیچے رکھے مزے سے سویا کرتے۔ ان دنوں ہمارا موسم تھا۔ آموں میں
بور آچکا تھا، کوئل ہر وقت کوکا کرتی۔ انھیں دنوں تو وہ وہاں آئی تھی۔

جب اس نئی جگہ پر آبا کا تبادلہ ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ بالکل تنہا اور اداس
ہو رہی اس کا شعور جاگا تھا اور کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نے جنم لیا تھا۔

اس دن جب سب لوگ نئے گھر میں اترے تھے۔ تو سامان کے بڑے بڑے بٹل
صحن میں ہر طرف رکھے ہوئے تھے جنہیں آبا کے کھلنے کی طرف سے ملے ہوئے چیرا ہی کی درد سے

کھلوار ہے تھے۔ اماں گھر اور سامان کی طرف سے بالکل بے تعلق سی معلوم ہو میں پھر بھی اُنھوں نے کئی بار گھوم پھر کر اونچے اونچے اور بچے محراب دار برآمدوں کمروں اور غسل خانے وغیرہ کو دیکھا تھا۔ تہینہ آپا نظریں جھکائے چھوٹا موٹا سامان اُٹھا اٹھا کر کمروں میں لے جا رہی تھیں اماں سخت بیزار سی آرام گروسی پر نیم دراز تھیں صدف بھائی اپنے کمزور شانے جھکائے برآمدے کی محراب میں اکڑوں بیٹھے تھے۔

”تم بھی اپنے ماموں کی مدد کرو۔“ اماں نے بڑی حقارت سے صدف بھائی کی طرف دیکھا تھا۔

”رہنے دو وہ کمزور ہو گیا ہی بخار سے، پھر سفر میں بھی تھک گیا ہی۔“ ابانے آہستہ سے کہا۔

”یہ تو ہمیشہ ہی تھکا رہتا ہی۔“ اماں بڑبڑائیں اور پھر جیسے جان کر آبا کے ساتھ سامان کھلونے لگیں۔ تہینہ آپا نے گھبرا کر صدف بھائی کو دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں وہ کچھ خوف زدہ سی ہو گئیں۔

ایک دن تو اسے احساس ہوا کہ گھر کی فضا کھنچی کھنچی ہے۔ وہ سب کے بگڑے تیور دیکھ کر اور بھی رنجیدہ ہو گئی اسے تو اپنی وہی پرانی جگہ یاد آرہی تھی۔

وہاں تو لائن سے سارے افسروں کے پیلے پیلے بنگلے بنے ہوئے تھے۔ بنگلوں سے ذرا دور آموں کا باغ تھا۔ پاس چھوٹا سا تالاب اور اس تالاب میں بچے اور بھینسیں ساتھ ساتھ نہایا کرتیں۔ وہاں اس کی ہم سن بہت سی لڑکیاں اور لڑکے تھے۔ سارا دن مزے مزے کے کھیل کھیلتے اور کچھ نہیں تو پانی میں بیٹھی ہوئی بھینسوں کو ڈھیلے ہی کھینچ کھینچ کر مارے جاتے۔ باغ میں گھس کر کیڑوں کی چوری کی جاتی۔ تو باغ کا رکھوالا انھیں کچھ بھی نہ کہتا بلکہ زمین پر ٹہکی ہوئی کچی کیڑیاں خود ہی چن کر انھیں دے دیتا۔

”اپنے بابو بوردوں کے بچے ہیں۔ وہ بڑے پیار سے ان کے سرروں پر ہاتھ پھیرتا
 کلا اور ادا سے منہ چراتی۔ اس کے بڑے دانتوں کا مذاق اڑاتے۔ مگر وہ نہ بگڑتا
 رات کو خانامن بوا اس کی ضد پر کہانیاں سناتے۔ شہزادے اور شہزادی
 کی کہانیاں جو ایک ہی بستر پر بیچ میں تلوار رکھ کر سو جاتے تھے۔ وہ اس کہانی سے سخت فکر مند
 ہو جاتی اگر کسی نے ذرا سی بھی کڑھٹی تو کہیں شہزادے یا شہزادی کا جسم نہ کٹ جائے۔
 خانامن بوا اُسے سمجھاتے کہ ”بھئی کہانیوں میں جسم نہیں کٹا کرتے“ پھر بھی اس کی فکر کم
 نہ ہوتی۔ سوتے ہیں بھی وہ خوف سے کڑھٹی نہ بدلتی۔ جانے وہ تلوار اس کے بستر پر کہاں
 سے آجاتی۔

خانامن بوا اور بھی کیسے مزے کی کہانیاں سناتی تھیں، راجہ بھوج اور گنگو
 تیلی کی کہانی، کٹھ تیلی کی کہانی جو راجہ کے محل کی ہر چیز کھا گئی تھی۔ کٹھ تیلی کی کہانی بھی
 کتنی اچھی تھی۔ کٹھ تیلی کی بڑی حرکتوں کی اطلاع جب راجہ کو دی جاتی تو بڑے میٹھے انداز
 سے گایا جاتا۔

کٹھ کی کٹھ تیلی سے راجہ گئی سب گھوڑے کھائے جی

”خانامن بوا۔ جب راجہ کو گا کر بتاتے تھے تو وہ ناراض نہیں ہوتا تھا۔“

وہ حیرت سے پوچھتی تھی۔

”نہیں بیٹا، راجہ لوگ بڑے نازک مزاج ہوتے ہیں، ان کے سامنے ہر بات
 اچھی طرح کہنی پڑتی ہے نہیں تو وہ بال بچوں سمیت کوہو میں نہ پلوا دیتے۔“ اسے خوف
 سا محسوس ہوتا تو خانامن بوا سے اپنے لپنے سے چیپتے ہوئے سینے سے لگاتے۔

اماں سے تو اس کا صوف آنا ہی تعلق تھا کہ وہ کھلتے کھلتے باہر سے آتی تو ان کے

لپٹ جاتی وہ اسے پیار کر کے پھر سے کھیلنے کی ہدایت کرتے۔ آبا تو اسے صرف

دُور ہی دُور سے نظر آتے۔ صبح دُور چلے جاتے اور شام کو ہٹھک دوستوں سے بھر جاتی۔ وہ سب زور زور سے باتیں کرتے، ہتھکے لگاتے اور خاننا من بوا ان کے لیے چائے بناتی رہتیں۔

اس کے بعد وہ اسکول میں داخل کر دی گئی۔ اب تو اس کی دنیا اور بھی وسیع ہو گئی تھی اس کی کئی ساتھی لڑکیاں اسکول میں آگئی تھیں اور دوسری نئی نئی لڑکیوں سے دوستیاں بڑھ رہی تھیں۔ جب وہ پڑھ کر آتی تو صفر بھائی اپنے پاس بلاتے۔ پڑھنے کے سلسلے میں سوالات کرتے۔ اس کے ہر جواب پر زور سے ہنستے۔ واہ تم کو تو کچھ نہیں آتا۔ وہ اُسے سخت بُرے لگتے۔ اور وہ جلدی سے بھاگنے کی کوشش کرتی۔

جب وہ پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی تو اُس نے خاننا من بوا کے شورے سے سلیقے والے کھیل کھیلنا شروع کر دیئے تھے۔ صحن کے ایک کونے میں گڑیوں کا ایک بڑا سا گھروندہ بنایا گیا۔ اس گھروندے میں گڑیوں کی شادی ہوتی، دھوم سے بہات نکلتی گڑیوں کے بچے پیدا ہوتے، آپا سے دھول کی ہوئی کترنوں کترنوں سے کپڑے مٹھے جلتے، خاننا من بوا شادیوں اور پیدائشوں پر کھجوریں بنا کر دیتیں۔ کبھی کبھی زردہ بھی پکتا۔ اس دن کھلا، اوشا اور رادھا چھوٹ نہ مانتیں، وہ سب کھلے خزانے زردہ کھاتیں۔

مگر یہاں تو کچھ بھی نہ تھا، اس نے باہر نکل کر ہر طرف نظر دُورائی۔ چرواہے بکریاں ہانکنے کے لیے جا رہے تھے۔ دو چار رنگ دھڑنگ بچے بیٹھے مٹی سے کھیل رہے تھے۔ دُور چھوٹے چھوٹے کچے مکان دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے گھر کے پاس تو صرف ایک ہی در منزلہ مکان تھا یا پھر جیڑسی کا گھر جو سیلی مٹی سے بنا ہوا تھا۔ وہ بڑی دیر تک ادبے دُور منزلہ مکان کو دیکھتی مگر وہاں سے کوئی لڑکی نہ اُتری جسے وہ اپنا دست بنا سکتی۔ ایک مرد سفید برقع دھوتی کا پتو تھا مے تیزی سے نیچے اُترا اور چلا گیا اس کے بعد گھر کی ادبھی

منزل سے ہارمونیم پر گانے کی آواز آنے لگی۔ اس نے گیت کے بول دہرائے مگر اُسے وہ بول کتنے غیر دلچسپ لگے تھے۔

درختوں پر پرند زور زور سے چہچہا رہتے تھے۔ وہ بڑی سیزاری سے بیٹھک کی دہنیر پر بیٹھی رہی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب چنچ چنچ کر دے، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور یہاں سے بھاگ جائے۔

”بیٹا، ہمارے پاس آ جاؤ۔“ چیرا سی کی بیوی صحن کی کچی نیچا دیوار پر اُچک اُچک کر اسے بلا رہی تھی۔

”ہنہ! وہ اندر آگئی۔“

بہت سا سامان ٹھکانے لگ چکا تھا۔ صحن میں آرام کر سبیاں کچھ گئی تھیں اور چیرا سی چار بنا چکا تھا، آبا۔ صفدر بھائی، آبا اور اماں سب تھکے سے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اس سے کسی نے بات بھی نہ کی۔ بیچ صحن میں مہندی کا جھوٹا سا پودا لگا تھا جس کی پتیاں خوب ہری ہو رہی تھیں۔ اس نے لوٹے میں پانی بھر کر پودے میں ڈالنا شروع کر دیا۔

”چائے پوٹو“ صفدر بھائی نے اس دن پہلی بار کچھ ایسے پیار سے بات کی کہ وہ ان کے پاس چلی گئی۔ اور ان کے قریب الی کر سی پر بیٹھ گئی۔

”گھبرا رہی ہو پوٹو“ نئی جگہ ہی۔ کوئی ساتھ کھینے والا بھی نہیں۔ ”صفدر بھائی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ بھوٹ بھوٹ کر رونے لگی۔ ایک صفدر بھائی تھے جو اس بات کو سمجھ سکے تھے وہ اپنی کر سی پر بیٹھے بیٹھے ان کی گود میں جھبک گئی۔ اماں نے بڑی سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھیں بند کر کے جیسے ان نظروں سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا۔ اماں بڑے کو سخت لہجے میں چیرا سی کو سمجھانے لگیں۔ ”تمہارے ذمے باہر کے کام ہیں۔ تم گھر کے کام نہیں کر سکتے، فوراً ایک ماما کا انتظام کرو۔ مگر خیال

رکھنا کہ جوان نہ ہو۔ ایسی عورتیں دو کوڑی کا کام نہیں کرتیں۔“

بس کل تک آپ کی مرضی کا انتظام ہو جائے گا۔ سرکار۔“

شام ہو رہی تھی۔ آبا اپنی پتلی سی چھتری اٹھا کر باہر گھومنے چلے گئے۔ اماں نے

ایک بار لکھیوں سے صفدر بھائی کو گھورا۔ ”جاؤ اب کھیلو“ اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر

اٹھایا اور جیسے رٹا ہوا جملہ استعمال کیا۔ وہ پھر باہر دہلیز پر جا کھڑی ہوئی۔ دو منزلے

مکان کی پوری منزل سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ مندروں سے گھنٹوں کی تیز آوازیں

آ رہی تھیں۔

”ہنہ! کھیلو، کس سے کھیلو، یہاں اس جنگل میں کون ہے؟“ اس کا جی بھر رہا تھا۔

”گھر کے اندر ہو یا پھر اس دہلیز پر بیٹھو اور کھیلو کھیلو کے جاؤ۔“ وہ بڑبڑا رہی تھی۔“

اس پر سب لوگ منہ بنا کر بیٹھے ہیں۔ ”وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔“

”اڈ بٹیا روٹی کھاؤ۔“ چیرا سی کی بیوی دیوار پر اچک رہی تھی۔ اس نے جلدی

سے آنسو پونچھ کر منہ پھیر لیا۔

”عالیہ، بٹو۔“ آبا بڑی بڑی آنکھیں جھکا۔ اس کے پیچھے آکھڑی ہوئیں۔ ”چلو اندر“

اب اندھیرا ہو رہا ہے، ہائے کتنی خوبصورت جگہ ہے۔ یہ بھی ”انہوں نے بھی ٹھنڈی سانس بھر

کر دُور دُور دیکھا اور پھر اسے اپنی کمر سے لٹائے اندر آگئیں وہ بیٹھک کے پاس والے

چھوٹے کمرے سے گزر رہی تھیں تو ایک لمحے کو ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئیں۔ صفدر بھائی مینر

پر رکھی ہوئی لائٹن کے پاس جھکے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔

صحن میں قطار سے پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ آپا کا پلنگ مہندی کے پودے کے

پاس بچھا ہوا تھا۔ ان کے پاس اس کا پلنگ تھا وہ اپنے بستر پر خاموشی سے لیٹ گئی۔ چاند

اُبھر رہا تھا، آسمان روشن تھا مگر آپا کا چہرہ صحن کے ہلکے سے اندھیرے میں آسمان سے

بھی کہیں زیادہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اسے تو اس دن احساس ہوا کہ آپا ہر وقت گم رہتی ہیں۔ اس وقت بھی وہ اپنے بستر پر بیٹھی بڑے کھوکھے انداز سے مہندی کی تیاں توج توج کر بھیر رہی تھیں۔

والان کی مہراب کی بیچ میں رکھی ہوئی لائٹین کی لو بہت نیچی تھی چیرا ہی باورچی خانے میں کھانا پکا رہا تھا۔ اماں دوسری لائٹین ہاتھ میں اٹھائے کمروں میں جانے کیا کرتی پھرتی تھیں۔

”جب تم اسکول میں داخل ہوگی تو پھر بہت سی لڑکیاں دوست بن جائیں گی۔“ آپا نے اس کی طرف کر دٹے کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور ہولے ہولے سہلانے لگیں مگر دکھ کے شدید احساس نے آپا کی محبت کا ذرا بھی اثر نہ لیا۔ ہاتھ چھڑا کر اس نے منہ پھیر لیا پھر آسمان پر اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھنے لگی اور اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب ننیر کا جھونکا آگیا۔

”ارے بٹو بچیر کھانا کھائے سو رہی ہو؟“ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ صفدر بھائی اس پر جھکے ہوئے تھے۔

”کیا ضرورت تھی ابھی سے جگانے کی؟“ اماں اس لہجے میں بولیں جیسے وہ چیرا ہی کو بہت دے رہی تھیں۔ صفدر بھائی اس کے پاس سے ہٹنے والے تھے کہ اس نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھیر لپٹے لپٹے جھک کر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ صفدر بھائی نے دو ایک بار اماں کو نیچی نیچی نظروں سے دیکھا اور پھر اس کا سر گود میں رکھ کر بیٹھ گئے۔

”کہانی سنائیے۔ صفدر بھائی، یہاں تو خاناسنن بوا بھی نہیں۔“ اس نے بھرائی

آواز میں کہا۔

”کون سی کہانی بٹو؟“

”اسی شہزادی کی۔ جس کے ابا نے اُسے ڈولے میں بٹھوا کر جنگل میں پھینک دیا تھا

اس نے اماں کی پرفا کیے بغیر کہانی کی فرمائش بھی کر ڈالی۔ آپا جیسے حسرتاً اپنے
بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

”میں تم کو دوسری کہانی سُناتا ہوں۔ ایک غریب لڑکا جو شہزادی سے محبت کرتا
تھا، ہاں تو سُنو، ایک تھا اڑکا۔“
آپا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔

(۲)

بارش اب تیز ہو گئی تھی۔ ہوا جیسے دروازوں پر دستک دے رہی تھی۔ چھٹی
سوتے میں جلنے کیا کیا بڑبڑا رہی تھی۔ اس نے لکانہ میں مٹھ چھالایا۔ اسے کتنی تفصیل سے
ذرا ذرا سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

صفدر بھائی کتنے وجیہ مگر کیسی مسکین صورت کے تھے۔ ان کی مسکینی کی وجہ اماں کی
بھرپور نفرت تھی۔ آبا ان سے اس قدر محبت کرتے تھے۔ ان کی ذرا ذرا سی ضرورتوں کا خیال
رکھتے۔ آپا صفدر بھائی سے بات تو نہ کرتیں مگر چوری چھپے ان کا خیال ضرور رکھتیں۔ اماں
کو کس قدر دکھ تھا کہ صفدر بھائی ان کے شوہر کی پیسے سے پڑھ پڑھ کر ایف اے پاس
کہلاتے ہیں اور روزگار کی پرفا کیے بغیر ٹھاٹ سے الم غلم کتابیں پڑھا کرتے ہیں۔ اماں
سارا دن جل جل کر کہا کرتیں کہ یہ کتابیں کس کی روزی کا سامان بن سکتی ہیں۔ یہ نکما مجھے کھا
کر گھر سے نکلے گا۔“

وہیں اس نے ایک نیا نام سُناتا تھا۔ ”نخبہ پھوپھی، یہ آبا کی سب سے چھوٹی بہن
تھیں۔ جو علی گڑھ کالج میں پڑھتی تھیں اور وہیں ہوسٹل میں رہتی تھیں۔ چھٹیوں

میں وہ اپنے سب سے بڑے بھائی کے گھر چلی جاتی تھیں اماں کی صورت سے سیرا تھیں
مگر اماں جب انھیں یاد کرتی تو نفرت کا سانپ ہر طرف پھینکارتے لگتا۔ خیر وہ تو نظر دل
سے دور تھیں مگر صفدر بھائی تو ہر وقت آنکھوں کے سامنے تھے اور اماں کو ان سے
بیچا اچھا نہانا ممکن نظر آتا تھا۔

اماں اپنے دکھوں میں مگن رہیں اور ابا انہی دنیا میں مگن، دنترے آنے
کے بعد وہ گھنٹہ آدھا گھنٹہ گھر میں گزارتے۔ اماں کسی نہ کسی بات پر لڑتیں اور ابا
باہر کی راہ لیتے قسم قسم کے دوست آجاتے جن سے گھنٹوں جوش و خروش سے
باتیں ہوتیں۔

ایک بار اس نے ابا کی باتیں سننے کی کوشش کی تھی۔ مگر آزاد ہی لگتا تھی
اور آزاد وغیرہ کے ناموں کے سوا اس کے پلے کچھ بھی نہ پڑا تھا۔ وہ اکتا کر دروازے
کے پاس سے ہٹ گئی تھی۔ ہاں صفدر بھائی کو ان باتوں سے کچھ لہی دیکھی تھی کہ گھنٹوں
سر جھکائے بیٹھے رہتے۔ دروازے کی ادٹ میں کھڑے ہو کر وہ اشاروں سے انھیں اٹھانا
چاہتی مگر صفدر بھائی پر کوئی اثر نہ ہوتا وہ صفدر بھائی سے روٹھ جاتی، ان دنوں تو
صفدر بھائی اس کی خوشیوں کا سہارا تھے۔

صفدر بھائی سے کیسی عام سی کہانی دلہستہ تھی۔ یہ کہانی سناتے ہوئے اماں کتنی
منگور معلوم ہوتیں۔ اس دن بھی جب وہ اور آبا اماں کے پاس بیٹھی تھیں تو اماں نے
صفدر بھائی کی کہانی چھیڑ دی تھی۔

”اس صفدر بد ذات کا باپ ایک غریب کسان کا بیٹا تھا۔ اس کا دادا اور باپ
تمہارے دادا مرحوم کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ گھر کے کاموں کو بھی
نوکریوں کی طرح انجام دیتے۔ جانے کیسے یہ بد بخت تمہاری دادی کے سر چڑھ گئے

تھے جو گھر میں کوئی ان سے پردہ بھی نہ کرتا۔ ویسے تمھاری دادی کی طبیعت تو کاڈوں بھری
 مشہور تھی۔ ان کی سختی کا یہ عالم تھا کہ جب کسی کو چاکر سے ناراض ہو میں تو بٹی ہوئی
 سٹی لے کر اس کی کھال اُدھیڑ دیتیں۔ ہائے کیا غرور تھا، کیا عجب تھا۔ چہرے سے
 گزریں لوگوں کی روح قبض ہو جاتی۔ مگر صفدر کے باپ دادا سے ہمیشہ عنایت سے
 بولا کرتے تھے۔ تمھاری دادی کا تو یہ حال تھا کہ کبھی اپنے شوہر سے سیدھے منہ بات نہ کی
 اور افسوس مرہوم کو سنبھلے انھوں نے تمھاری دادی کو دکھ بھی بہت دیئے تھے ان کی دو
 دشتائیں تھیں جن کے تین لڑکے تھے۔ دادا نے اپنی دشتاؤں کے لیے الگ الگ
 مکان بنوا رکھے تھے۔ انھیں تمھاری دادی کی حویلی میں آنے کی اجازت نہ تھی
 ہاں ان کے بچے حویلی میں آتے جنھیں تمھاری دادی ناموں کے ساتھ حرامی کہہ کر
 پکارتے۔ ویسے ان دنوں دشتاؤں میں رکھنا اتنی بری بات نہ سمجھی جاتی تھی۔ اسی لیے
 تمھاری دادی یہ سب کچھ برداشت کر لیتی۔ جاؤں بیوی کی شان تو اسی طرح دو بالا رہتی
 زمینداری کا سارا کام تمھاری دادی کے سپرد تھا۔ دونوں دشتاؤں کے
 کھانے پینے کا سامان اپنے سامنے تلوا کر بھجوا دیا کرتے تھے۔

”شادی کا معاملہ بھی خود تمھاری دادی طے کرتے تھے۔ انھوں نے تمھارے

باپ اور چچاؤں کی شادی اپنی مرضی سے کی تھی۔ بہوؤں کو بہت دبا کر رکھتے مگر
 انھوں نے مجھ سے کبھی زیادتی نہ کی۔ میں ان کی طرح بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ میرا بھائی
 انگلینڈ میں پڑھتا تھا۔ مجھ میں تمھاری دادی جیسا عجب تھا۔ تمھاری بڑی اور کھلی
 بچی ان کے سامنے ہوں نہ کر پاتیں۔ تمھاری دادی اگر کسی کے سامنے جھکتی تھیں
 تو وہ تمھارے سب سے چھوٹے چچا تھے۔ جب خلافت کی تحریک چلی تو وہ ترکا چلے
 گئے۔ پھر ان کا پتہ نہ چلا کہ کہاں چلے گئے۔ پھر بھی تمھاری دادی نے کسی کے

سامنے ایک آنسو نہ بہایا۔ بیٹے کو یاد کر کے ایک آہ نہ بھری کہ کہیں ان کے رعب داب
کی نظریں نیچی نہ ہو جائیں مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا تمھاری سلمہ بھوپھی نے چودہ سال
کی عمر میں ان کا منہ کالا کر دیا تمھاری دادی نے ایک دن اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ
وہ صفدر کے باپ کا ہاتھ پکڑے سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ اس دن دادی نے سلمہ بھوپھی
کو کمرے میں بند کر کے اتنا مارا کہ سارا جسم نیلا ہو گیا۔ جب میں ان کے جسم پر پاہری چونا
لگانے بیٹھی تو کانپ کانپ گئی پھر بھی یہ سنا تمھاری سلمہ بھوپھی کے لیے کتنی کم نفی۔
ابھی تو زندہ دفن دینا چاہیے تھا۔

” دوسرے دن انھوں نے صفدر کے باپ دادا کو زینوں سے نکال دیا اور دو
سچاروں کو بلا کر حکم دیا کہ انہیں سب کے سامنے جوئے مار کر گاؤں سے نکال دیں۔ اسی دن
شام کو ناؤن نے آکر بتایا کہ جانے صفدر کے باپ دادا سے کیا قصور ہوا کہ سب کے سامنے
جوئے سے مارے گئے۔ وہ دو دن گاؤں سے چلے گئے۔ اس خبر کو سن کر دادی ایسے
بے پناہ رعب سے اٹھ کر چلیں کہ سب کانپ گئے مگر تمھاری سلمہ بھوپھی جیتے جی مر گئیں۔
اس قصہ کے بعد انھوں نے نہ تو ڈھنگ سے کپڑے پہنے اور نہ بالوں کی کنگھی کی، تمھاری دادی
انھیں ہر وقت نظروں میں رکھتیں۔“

” ایک دن میں نے ان کو بڑی عجیب حالت میں دیکھ لیا۔ سر دیوں کے دن تھے، تمھاری
سلمہ بھوپھی دھوپ کھانے چھت پر گئی ہوئی تھیں۔ ان کے قریب چھت کی منڈیر پر جنگلی
کبوتر بیٹھا غٹ غٹ کر رہا تھا۔ اور سلمہ اُس سے کہہ رہی تھی۔ ”اے کبوتر تو شہزادوں کے پیغام
لے جا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ میرے حال پر رحم کر۔ ایک پیغام میرا بھی لے جا ان سے کہو کہ سلمہ تیرے فراق
میں ٹپتی ہے۔“

کبوتر تو خیر لایا ہی پھر سے اڑ گیا۔ مگر میں نے تمھاری دادی کو بے شرمی کی تہا

کہہ سائیں۔ انھوں نے بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ دوسری بہنوں کو یہ باتیں معلوم نہ ہوں پھر بھی یہ بات تو سب کو معلوم ہو کر رہی اللہ جانے وہ کبوتر تھا کہ جن۔

”اس دن تمہارے دادا کہیں باہر گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ رات مہمان خانے

میں رہیں گے۔ دادی نے اس دن سونے سے پہلے گھر میں تالا لگا کر چابیاں اپنے سر ہانے

رکھنی تھیں مگر صبح ان کی آنکھ کھلی تو چابیوں کا گچھا اور تمہاری سلمہ پھوپھی دونوں

غائب تھے۔ تمہاری دادی دم بخود بیٹھی تھیں انھوں نے سب کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے

کہہ ہی ہوں کہ اگر مُنف سے اُن کی تو زندہ گاڑ دوں گی، کتوں سے نچوڑ دوں گی۔ دوسرے

دن شام کو دادا واپس آئے تو دادی نے بند کمرے میں دیر تک باپیں کیں۔ جب وہ

باہر نکلے تو ان کا چہرہ شرم اور غصہ سے سُرخ ہو رہا تھا۔

اتفاقاً کہہ کر اماں نے بڑی حسرت سے کہا تھا کہ — ”کاش سلمہ میری بیٹی ہوتی

تو پہلے ہی دن اسے اپنے ہاتھوں سے رہ کر کھلا دیتی۔“

تمہارے دادا جانے کیا کرتے مگر اسی دن تمہارے آباچند دن کی چھٹی لے کر آگئے

اور بڑی بے شرمی سے سلمہ کے حق میں اپنے آبا سے لڑتے رہے۔ میرا غیرت سے بُرا حال

تمہارے کاش تمہارے باپ سے میری شادی نہ ہوئی ہوتی۔ تمہاری دادی غصے سے ٹھہلتی رہیں

مگر تمہارے آبا کی مونچھوں کی لاج رکھتے ہوئے مُنف سے کچھ نہ بولیں، مگر تمہارے دادا کو

جانے کیا ہوا کہ اسی وقت اپنی دستاؤں کو گھروں سے نکال دیا اور گاؤں سے چلے جانے

کا حکم بھیجا دیا۔ دادی کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے حکم دیا کہ صرف دستائیں جائیں

گی۔ مگر ان کے بچے نہیں جائیں گے۔ اس لیے کہ وہ ان کے شوہر کا خون تھے۔

”تنیوں لڑکے گھر آگئے۔ تو بہ، اُن کی صورتیں دیکھ کر گھن آتی تھی۔ دونوں چھوٹے

لڑکے سارا دن بلوں کی طرح روئے۔ بڑا لڑکا دڈر دڈر کر گھر کے کام کرتا۔ دونوں چھوٹے لڑکے

ایسے نزدیک تھے کہ برسات کے دنوں میں مکھیوں کی ٹھنکی ہوئی تھوٹی گٹھلیاں چوس چوس کر پیسے میں مر گئے۔ ورنہ کیا پتہ کہ تمہارے آبا اخصیں بھی آج کلیمے سے لگا کر کسی کالج میں پڑھوا رہے ہوتے۔

سلمہ نے بھاگ کر نکاح کر لیا۔ تمہارے آبا کی دھکیوں سے ڈر کر تمہارے دادا نے بظاہر کچھ نہ کیا مگر جہاں کہیں سلمہ کے میاں نوکری کرتے۔ اُسے چھڑوا دیتے۔ سلمہ اور وہ دونوں بھوکے مرتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انھیں تو کتوں کی طرح بھوکا مرنا چاہیے تھا۔ مگر تمہارے آبا نے انھیں انبانوں کی طرح مرجانے دیا۔ صفدر کی پیدائش پر سلمہ کو دق ہو گئی اور کچھ دن بعد پڑ پڑیاں گر گڑ گڑ کر مر گئی۔

جب دادی کو سلمہ بچو بچی کی موت کی خبر لگی تو جانے ان کی شرم کہاں گئی۔ اپنی بے حیا بیٹی کی موت پر سینہ کوٹ کوٹ کر رونے لگیں۔ کچھ سے تو قسم لے لو جو میری آنکھ سے ایک آنسو بھی گرا ہو۔ حیران ہو کر تمہاری دادی کو دیکھ رہی تھی جو نوکروں جاکروں کے بیچ میں لوٹ لوٹ کر رُد رہی تھیں۔ اسی رقت انھوں نے اپنے تینوں بیٹیوں کو تار کر دینے تمہارے آبا اور بڑے چچا اس کلمو ہی کی موت پر بھاگے چلے آئے مگر تمہارے منجھلے چچا نے سب کی عزت رکھنی انھوں نے اس جنم جلی کے موتے پر آنے سے انکار کر دیا۔

تمہاری دادی رردھو کر چپ ہو گئیں مگر میری نظروں میں ان کی ذرا بھی عزت نہ رہ گئی تھی۔ بس مجبور تھی جو خاموش رہی۔ تمہارے آبا اور بڑے چچا اس گاؤں چلے گئے جہاں سلمہ رہتی تھی۔ اور جب تمہارے آبا وہیں آئے تو اس کلمو ہے صفدر کو سینے سے لگا لائے۔

سلمہ کو مرے چاہئیں دن بھی نہ ہوئے تھے کہ تمہارے دادا سجدے کے لیے ٹھکتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے گھر تباہ ہو گیا۔ تینوں بیٹیوں نے اس گاؤں

رہنا پسند نہ کیا اور جاگیر کو کھڑے کھڑے ایک ذواب کے ہاتھوں بیچ کر اپنی اپنی ملازمتوں پر واپس چلے گئے۔ اگر وہ جائیداد ہوتی تو آج میں دادی کی جگہ ماما بن کر بیٹھتی مگر نصیب میں تو یہ لکھا تھا اب تمہاری دادی اپنے بڑے بیٹے کے ٹکڑوں پر پڑی اڑیاں رگڑ رہی ہیں اور اس فساد کی جرّ کی اولاد میری چھاتی پر مونگ دل رہی ہے۔ ہائے ہائے۔

اماں جب بھی آپا کو یہ قصہ سناتیں تو بڑے غور سے ان کی طرف دیکھتیں اور آپا جیسے گھبرا کر ان سے نظریں سجالتیں۔ اماں آپا سے تو کچھ نہ کہتیں مگر اُسے سمجھانے لگتیں "میری جان تم اس کلنک کے ٹیکے کے پاس زیادہ نہ اٹھا بیٹھا کرو۔ اس کے باپ دادا نے میرا راج پاٹ پھین لیا۔"

اماں کی اس نصیحت کا اُس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا تھا۔ اُسے تو غصہ آتا کہ جب صفدر بھائی اتنے اچھے ہیں تو اماں ان سے کیوں ناراض رہتی ہیں۔ ایک دن تو وہ اماں کی شکایت بھی کرنا چاہتی تھی مگر جب صفدر بھائی کے پاس گئی تو کچھ نہ کر سکی "صفدر بھائی آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ وہ ان کی تعریف کرنے لگی۔ "مگر میں بڑا کسے لگتا ہوں؟"

"کسی کو بھی نہیں! اور وہ جلدی سے بھاگ آئی۔"

جانے کون بجلی منترل کے دروازے کی زنجیر کھڑکھڑا رہا تھا۔ اس نے لکان سے منہ نکال کر دیکھا۔ کمرے میں گھورا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چچی جان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"ان شاعروں کا بُرا ہو، اتنی سردی میں لوگ اپنے گھروں سے کب نکلتے ہوئے؟" بادلوں کی گرج میں وہ اور کچھ نہ سن سکی۔

اللہ! اس نے جیسے پھینپی سے کروٹ بدلی۔ "ہو! اگر نیند آہی جہے تو کیا اچھا ہو۔"

(۱۳)

صحن میں کنیوس کی آرام کرسیاں سجھ گئی تھیں۔ چھوٹی میز پر آپ کے ہاتھ کا کڑھا ہوا
 میز پوسٹس پڑا تھا۔ ماما میز پر چائے کے برتن لگا رہی تھی۔ اور اماں ایک سال بد تہیں دے جا رہی تھیں
 آپا ہندی کے چھوٹے سے پودے پر پانی چھڑکنے کے بعد اماں کے پاس آئیں صدف
 بھائی آبا کے پاس والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ آبا کے پاس کھڑی تھی۔ مگر کوئی بھی تو اس
 کی طرف متوجہ نہ تھا۔ سب بیزار تھے۔ اس نے کئی بار آبا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا لیکن وہ صرف
 مسکرا کر رہ گئے۔ اماں صدف بھائی کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں

آپا نے اس طرح جلدی جلدی چائے پی جیسے کسی ضروری کام سے جا رہی ہوں، مگر
 اس کی چائے پڑی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ اس نے مارے غصہ کے پیالی کو ہاتھ بھی نہ لگایا وہ
 کتنی سخت رنجیدہ ہو رہی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی گھر ہے۔ جہاں سب لوگ ٹھنڈے چائے پی
 ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہ اس جگہ نہ آئی ہوتی۔ یہیں آ کر تو اس نے سب کے پھولے ہوئے
 مندر کیے تھے۔ وہ نہ جانے اور کیا کیا سوچ کر سب سے ناراض ہو گئی تھی اور وہاں سے
 ہٹ کر ہندی کی تپیاں نوچنے لگی۔

تم چائے نہیں پیو گی بیٹی؟" آبانے پوچھا مگر وہ چپ رہ کر اپنی خفگی کا اظہار کر رہی تھی
 اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب زور سے چیخے۔ "نہیں پیتے، بلا سے ٹھنڈی ہو جائے کسی کا

اجارہ ہی۔ ۹۹

"کوڑا کیوں کر رہی ہو؟" اماں نے سختی سے پوچھا اور وہ اٹھ کر آپا کے پیچھے
 ہوئی جو لمبے لمبے قدم رکھتی اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔

سب منہ بنائے بیٹھے رہتے ہیں آپا۔ "اس نے بڑے دکھ سے فرمادی کی۔" یہاں تو لڑکیاں

بھی نہیں جن کے ساتھ کھیلوں کو دہلی تو جی بہل جائے۔

”ارے ہوتے اتنی بڑی ہو رہی ہو اور تم کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ جب گھر میں لڑائی ہو تو سب چُپ رہتے ہیں، دو پہر میں اماں اور ابا میں کھٹ پٹ ہوگئی۔ اس دن پہلی بار آبا اس کو بڑا سمجھ کر سنجیدگی سے باتیں کر رہی تھیں۔

لڑائی ہوئی؟“

”بس یہی کہ اماں کو صفدر بھائی سے نفرت ہے جب تک وہ اس گھر سے نہیں جاتے یہ لڑائیاں بھی نہیں ختم ہوتیں۔“

پھر کمرے کے ہنگے سے اندھیرے میں آبا سے اپنے پاس بٹھا کر سرگوشیاں کرنے لگیں۔
 ”خطی تمہارے صفدر بھائی چوتھے درجے میں پڑھتے تھے تو میں بالکل چھوٹی سی تھی مگر مجھے سب یاد ہے، ایک بابا اماں نے ان کو بلے جدا کیا تھا۔ جب آبا کو معلوم ہوا تو وہ اماں سے روٹھ کر ٹھا کر صاحب کے گھر چلے گئے تھے پھر ٹھا کر صاحب نے بڑی مشکل سے آبا کو رضی کو کے گھر بھیجا تھا بس اس وقت سے اماں صفدر بھائی سے اور بھی نفرت کرنے لگیں۔ کیسے بے شرم میں یہ تمہارے صفدر بھائی بھی جو یہاں سے جاتے ہیں، اب تو اس لائق بھی ہو چکے ہیں کہ کہا کھائیں۔ مجھے ابھی طرح یاد ہے کہ اماں کی ہڈی پر نوکرانی صفدر بھائی کو گرمیوں میں دو دو وقت کا سٹرا ہوا کھانا کھلاتی تھی، چلو بھر دو دھ میں ڈھیروں پانی ملا کر پیئے کو دیتی اور گوشت پر کے پھیپڑے کاٹ کر ان کے لیے قیر لپکا دیتی۔ مگر صفدر بھائی کبھی ابا سے شکایت نہ کی۔ ایک دن خود آبا کو جانے کیا سوچھی کمان کا کھانا دیکھنے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد صفدر بھائی کو اپنے ساتھ کھانا کھلانے لگے۔ اس کے بعد بھی صفدر بھائی کی صحت خراب ہی رہی۔“

”ہے، پھیپڑے تو کتوں کو کھلاتے ہیں، وہ تمہارے آبا بہارا چھوٹا سا کتا ٹامی، اُسے بھی تو پھیپڑے اُبال کر دیئے جاتے تھے؟“ اس نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر آبا ایک دم سسکنے

لگیں اور وہ حیران ہو کر رہ گئی۔

”تم صدف بھائی سے زیادہ نہ بولا کرو۔“ آپا نے آنسو بچھ کر جلدی سے کہا اور پھر منسنے

لگیں۔

وہ آپا کی بہت کی پردا کے بغیر باہر آگئی۔ سب اسی طرح بیزار بیٹھے تھے اور کہیں بہت دور

سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔

”صدف بھائی باہر گھومنے چلیں؟“ اس نے اماں کی طرف جا کر دیکھے بغیر کہا مگر صدف بھائی

بالکل خاموش رہی۔

”اب اسے اسکول میں داخل کرادو نا ورنہ یوں ہی ماری ماری پھرے گی۔“ اماں نے تیز لہجے

میں کہا۔

”حکوم کروں گا، سنا ہے یہاں بس ایک ہی مشن ہائی اسکول ہے اور وہاں صرف انگریزی پڑھائی

جاتی ہے یا پھر اپنے مذہب کی تبلیغ ہوتی ہے۔ میں انگریزوں کے ان اسکولوں کے سخت خلاف ہوں

یہ ہماری غلامی سے ہر طرح کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔“

”بات تو ساری یہ ہے کہ تم انگریزوں کے خلاف ہو، ان کی نوکری کر دے مگر ٹیپو کو ان کے

اسکول میں نہیں پڑھاؤ گے، بس اس خاندان میں تو صرف تمہاری بہن اور بھانجا پڑھے لکھے۔ تمہاری

ایک صاحبزادی دس درجے پڑھ کر گھر بیٹھ رہی، انہیں خیر سے تھمتے کہانیوں کی وہاں بات

کتابیں دے دے کر تباہ کیا اب دوسری کو انگریز دشمنی کے سپرد کرو۔“ اماں ایک دم بھیر گئیں

اس نے گھبرا کر صدف بھائی کی طرف دیکھا۔ ”ہی تو آپا کو کتابیں دیتے تھے۔ صدف بھائی

جیسے بوکھلا کر اپنے کمرے کی طرف بھاگے۔ اور اتانے کرسی کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں

بند کر لیں۔ وہ اس رقت کتنے زخمی نظر آ رہی تھی۔

وہ لڑائی کے خوف سے باہر آگئی۔ بیٹھک کے سامنے والے چوڑے پردوں کو آگے کر لیا

پڑھی تھیں۔ وہ وہاں بیٹھ کر پاؤں ہلانے لگی۔ دو منظرے مکان سے ہارمونیم پر گانے کی آواز آرہی تھی۔

کون گلی گیو شام، بتادے کوئی کاشی ڈھونڈا، بند را ڈھونڈا
 گوگل میں ہوگئی شام، بتادے کوئی کون گلی گیو شام، بتادے کوئی
 وہ چپکے چپکے بول دہرانے لگی۔ گانا بجانا اُسے کتنا اچھا لگتا مگر اماں کے ڈر سے کبھی
 گانے کا نام نہ لیا وہ تو اماں کے منہ سے یہی سنتی رہتی تھی کہ شریفوں کے گھروں کی لڑکیاں
 نہیں گاتیں۔

چوتھے پر بیٹھے بیٹھے شام کا اندھیرا چھانے لگا۔ مندروں سے گھنٹوں کی آواز آ رہی
 تھی اور ڈھیروں پر بند سیرالینے کے لیے درختوں پر شور مچا رہے تھے۔ سامنے کچی سڑک پر بچوں
 کا ریوڑ دھول اڑاتا گزر رہا تھا۔ وہ انھیں گننے لگی مگر جی نہ لگا۔ گھر میں لڑائی دیکھ کر وہ کتنی رنجیدہ
 ہو گئی تھی۔

”اندر چلو، بورات ہو رہی ہے۔“ جب صفدر بھائی نے اُسے اٹھایا تو وہ اُن سے
 لپٹ کر رونے لگی۔

”جب تم اسکول میں داخل ہو جاؤ گی تو دل بہل جائے گا۔“ صفدر بھائی نے کس
 طرح اُسے سینے سے لگایا۔ جیسے مارے مانتا کے تڑپ رہے ہوں۔

ماما لالٹین ہاتھ میں لیے جانے ادھر سے ادھر کیا کرتی پھرتی تھی۔ آبا اور اماں اس
 طرح بیزار بیٹھے تھے۔

”گھوم آئیں؟“ ماں نے سختی سے سوال کیا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر آبا
 سے مخاطب ہو گئیں

”میں کہتی ہوں کہ اسے فوراً اسکول میں داخل کراؤ۔ مجھے تو اپنی اسی لڑکی پر امان

پورے کرنے ہیں، تمہارے ارمان تو بہن اور بھانجے پر پورے ہو گئے؟
 "صفر درمیاں تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" ابا نے نرمی سے کہا اور حسبِ مقدر بھائی
 اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تو ابا ایک دم سخت ہو گئے۔ "مجھے رشن اسکولوں سے نفرت ہی، میں اسے
 نہیں پڑھاؤں گا۔ بے شک جاہل رہو گی۔"

"یہ تو میں دیکھوں گی کہ جاہل رہو گی یا پڑھے گی۔ تم کو تو اللہ واسطے کا بیرہی انگریزوں سے
 جس تھالی میں کھاؤ اسی میں چھید کر دو۔" اماں کی آواز میں اس بلا کا طنز تھا کہ ابا کو کسی سے اٹھل پڑے
 "میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے میری اجازت کے بغیر اپنے بھائی کے پاس
 میرے روپے کیوں رکھائے؟ میں تو اپنے بچوں سے مجبور ہو کر نوکری کر رہا ہوں۔ اگر تم
 وہ روپے غائب کیے ہوتے تو میں ان سے کوئی تجارت کر لیتا۔"
 "کون سے روپے؟" اماں جیسے بلبلا اٹھیں۔

"وہی تو زمین بیچنے کے بعد میرے حصے میں آئے تھے؟"
 "خوب! وہ روپے تو عالیہ اور تہمنیہ کے لیے ہیں، یہاں کیوں رکھتی؟ اسی لیے نا
 کہ بھاری بہن اور بھانجے کے کام آجاتے، میں اب ایسی بدبھو نہیں ہوں۔" اماں ہنسیں
 "میں تمہارے بھائی پر دعویٰ کر دوں گا۔"

"جانتے ہو میرے بھائی کی بیوی انگریزہ؟" اماں نے بڑے غرور سے سر اٹھا کر لیا۔
 "وہ تو میں جانتا ہوں، تمہارے بھائی بے چارے یوں ہی پھرتے تھے، انگریزی بیوی
 لاکر بڑا عمدہ ملا ہے۔" ابا اس طرح بات کر رہے تھے جیسے گالی دے رہے ہوں۔
 "تم کو نوکری کرتے بارہ بندہ سال ہو گئے مگر بڑا عمدہ نہ ملا۔ اس لیے اب جلو گے نہیں
 تو ادا کیا کر دے گا۔" اماں نے حقارت سے جواب دیا۔

"انہ! ابا نے سخت بیزاری سے مسخر پھیر لیا اور پھر والان کے کرنے میں کھڑی

ہوئی پھڑی اٹھا کر باہر چلے گئے۔ اماں ڈوپٹے کا پامند پڑا لکڑی صیرے دھیرے سے روئے لگیں
آپا کر انہیں سمجھانے لگیں تو انہوں نے آنسو پوچھ لیے۔

”میں نے وہ روپے تم دونوں بہنوں کے لیے جمع کرائے ہیں درندہ صفت راجہ پر اسے پورا جاتا“
اماں نے زندہ ہی ہوئی آواز میں کہا اور لمبی لمبی آہیں بھرنے لگیں۔

اس وقت اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ عقدر بھائی بھوت ہیں جو سب کچھ کھا جائیں گے
اماں کے لیے اُس کا جی ٹرپ اٹھا تھا۔ یہی جاہتی تھی جا کر اماں کے لیٹ جائے مگر مارے
گھبراہٹ کے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

پورا چاند بھر چکا تھا۔ ہارمونیم پر گانے کی مدھم مدھم آواز آرہی تھی۔

جو میں جانتی پھرت ہو پیا گھونگھٹ میں آگ لگاتی۔

وہ گیت سننے سننے سو گئی۔ سوتے میں ایک بار اُس نے محسوس کیا کہ کوئی اُسے اٹھا رہا

ہے۔ مگر وہ نہ اٹھی۔ جا بے رات سب نے کھانا بھی کھایا تھا کہ نہیں۔

(۴)

وہاں آئے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ آبا کی بیٹھک آباد ہو گئی۔ کسم دیدی کے

پتا جی بھی آنے لگے تھے۔ اماں بہر وقت غصہ سے بھری رہتی۔ ”یہ سب بیچارے

لوگ ہیں انہیں دنیا کا کوئی کام نہیں بیٹی دن رات گاتی ہے اور باپ سیاست بھارتیہ“

کسم دیدی اماں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ نفرت کی سب سے بڑی وجہ تو یہی تھی

کہ ان کے پتا جی انگریز راج کے خلاف تھے، اس پر ظلم یہ کہ ہندو تھے اور ان کی بیوہ

بیٹی گاتی بجاتی رہتی تھی۔

اماں کو کسم دیدی سے ذرا بھی ہمدردی نہ تھی۔ حالانکہ انہوں نے دوسری ہی

ملاقات پر اپنی ساری بتیا کہہ سنائی تھی۔ " میں تو اس وقت چودہ پندرہ سال کی تھی۔ شادی کے صرف تین مہینے ہوئے تھے، " وہ " ان دنوں امرت سر میں بدلی ہو کر گئے تھے۔ جس دن وہ جلیان والا باغ کے جلے میں شریک ہونے گئے تو سانس سسر نے بہتیرا روکا مگر وہ ان کی باتوں پر ہنستے رہے۔ میں اپنے سانس سسر کی باتیں سن سن کر پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ پر مارے لارج کے کچھ نہ کہہ سکی۔ گھونگھٹ کے اندر سے ان کے اٹھتے ہوئے پاؤں دکھتی رہی وہ تو کہتے تھے کہ مجھے تم سے بڑی محبت ہو پر جاتے سے میرے دل کی مڑی نہ پوچھی وہ ہنستے ہوئے چلے گئے اور کبھی نہ مڑے۔ میں ان کی راہ تک تک کر ٹھک گئی تھی بڑھ جان کر سب میرے سائے سے بچتے ہیں۔ پر جانے کیا بات ہو کہ میں آج تک اپنے کو بڑھ نہیں سمجھتی۔ میں بڑھ ہوں موسیٰ؟ " کسم دیدی نے اماں کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا اور پھر جانے کیوں چھپتے گئے تھی۔ اماں نے اپنے سامنے پاندان کھینچ لیا تھا اور وہ جانے کیوں اس وقت کسم دیدی کے لپٹ گئی تھی۔

وہ اگر انھیں مجھ سے محبت ہوتی تو کبھی نہ جاتے، انھیں تو صرف اپنے پیش سے محبت تھی۔ اب میں اپنی محبت کو کہاں لے جاؤں، انھوں نے تو یہ بھی نہ سوچا کہ میرے سینے میں بھی دل ہے۔ " کسم دیدی نے جیلے فریاد کی اور پھر ساری کے پلو میں منہ پھیر لیا۔ اماں نے شاید ان کی بے شرمی سے گھبرا کر منہ پھیر لیا تھا۔

کسم دیدی جب پہلی بار اس کے گھر آئی تھی تو اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ کہانیوں کی پری آگئی ہے۔ اس دن وہ گھر سے بیزار ہو کر باہر چوتڑے پر بیٹھی تھی۔ اسی دن تو سخت فساد کے بعد صدقہ بھائی اُسے اسکول میں داخل کر آئے تھے۔ صدقہ بھائی نے شاید پہلی بار آبا کی مرضی کے خلاف کوئی حرکت کی تھی مگر آبا نے انھیں ایک لفظ نہ کہا تھا صرف اماں سے بات نہ کی۔ جب وہ بولتیں تو آبا منہ پھیر لیتے۔

کسم دیدی اپنے دو منزلہ مکان سے اتر کر ان کے پاس آکھڑی ہوئی تھیں۔ ننھے ننھے گورے پاؤں سپاند کے دو مکڑے معلوم ہو رہے تھے اور ان کی لابی موٹی آنکھوں میں کیسی آسپی سی کیفیت تھی وہ اس کا ہاتھ تھام کر کہنے پیار سے مسکرائی تھیں۔

”میں رائے صاحب کی پتری ہوں، تمہاری اماں سے ملنے کو آئی ہوں“ انہوں نے دھیرے سے کہا تھا اور اُسے کہا نیوں کی وہ شہزادی یاد آگئی تھی۔ جس کے منہ سے بات کرتے وقت بھول جھڑتے تھے۔

تہینہ آپا اور کسم دیدی کی ایسی دوستی گھٹی کہ وہ دونوں گھنٹوں کمرے میں جانے کیا کیا باتیں کیا کرتیں۔ اماں اتنی دیر تک جلی جلی ہیر میں اور جب کسم دیدی اپنے گھر چلی جاتی تو اماں کو کوئی نہ کوئی بُری سی بات یاد آجاتی۔ ”کجبت کافروں میں کیا بُرا طریقہ ہو کہ دوسرا نکاح نہیں کرتے۔ کیسا عذاب ہوتا ہو۔ جوان جہان عورت کو بٹھائے رکھنا، ہمیں پتہ ہو کہ یہ جوان جہان بیوا میں کس طرح بٹھایا میں گرا پھوڑتی ہیں۔“

آپا سر جھکا کر سب کچھ سن لیتیں مگر اُسے ایسی باتیں بُری لگتیں۔ کسم دیدی تو چوری چھپے سے ہارونیم بھی سکھانے لگی تھیں۔

”کسم دیدی تو گڑ کھاتی ہی نہیں جو پھوڑیں گی۔ انہیں گڑ سے نفرت ہو“ وہ غصہ سے بچ پڑی تھی اور اماں کہیں کھلا کر ہنس دیں۔ اس دن اس نے آپا سے بھی بات بھی نہ کی تھی۔“ ایسی خاموشی کس کام کی کہ اپنی پہلی کی طرف سے بولتی تک نہیں۔ بڑی آپا میں کہیں کی وہ چپکے چپکے بڑبڑاتی رہی۔

(۵)

اس روز شام کو زور سے آندھی چلی اور بادل گھر کے آگے۔ شاید جون کے آخری دن تھے

ساری رات بادل چھائے رہے اور کسی کسی وقت ہلکی سی بارش ہو جاتی۔ اماں اور آبا کمرے میں سو رہے تھے وہ آپا کے ساتھ بڑا کمرے میں سو رہے تھے۔ کسی وقت ہوا تیز ہوتی تو بوجھار پانہتی تاک آتی اور اس کی آنکھ کھل جاتی مگر ایک بار جو اس کی آنکھ کھلی تو آبا اپنے بستر میں تہ تھیں۔ بادل دھیرے دھیرے دھمک رہے تھے۔ اسے ڈر لگا مگر آپا چند ہی منٹ میں آگئیں۔ پر وہ اکیلی نہ تھیں۔ صغدر بھائی بھی ساتھ تھے اسے سخت حیرت ہوئی کہ کیا آپراتوں کو صغدر بھائی سے بات کرتی ہیں۔ کیا وہ اماں سے اتنا ڈرتی ہیں۔

آپا بلیوں مجلسی چال سے آئیں اور جب اپنے بستر پر لیٹنے لگیں تو صغدر بھائی نے انہیں لپٹا لیا پھر ان کے چہرے پر ٹھکے رہے۔ اس نے مارے حیرت کے سانس تک روک لی تھی۔ سلمہ بھوپھی کی کہانی اسے یاد آ رہی تھی۔ اس وقت اس کے کتنے عجیب سے احساسات جو رہے تھے۔

صبح جب آبا اسے اسکول جانے کے لیے تیار کر رہے تھے تو اس نے دھیرے سے پوچھا تھا۔ "آپرات تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

"ایں!" مارے خوف کے آپا کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔

"میں کوئی اماں سے تھوڑی کہوں گی، میں کسی سے نہیں کہوں گی۔" اس نے پوری عورتوں کی طرح آپا کو تسلی دی تو انہوں نے اُسے لپٹا لیا۔ ان کا سارا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔

"اگر تم نے اماں سے کہدیا تو وہ جانے کیا کریں گی، سلمہ بھوپھی کے ساتھ بھی جو کچھ نہ ہوا ہوگا۔ بڑے تمہارے صغدر بھائی مجھے اچھے لگتے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے!"

"وہ خود مجھے اچھے لگتے ہیں، میں بھلا اماں سے کہہ سکتی ہوں۔ کہیں اماں بھی انہیں چہرہ ہی سے جوتے۔"

آپا نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ان کا رنگ ہلکی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

”میں ان کو یہاں سے بھگتا دوں گی۔“

”یہ بات ٹھیک ہی ہے۔“

دالان میں صفدر بھائی کھڑے تھے۔ وہ ان کے ساتھ اسکول چلی گئی۔ مگر وہاں بھی اس کا جی نہ لگا۔ صفدر بھائی کہتے تھے کہ اسکول جا کر جی بہن جائے گا۔ مگر وہ تو بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ ہر بات کا اس کے دماغ پر اثر ہوتا۔ رات کا قصہ بار بار یاد آتا اور وہ انجام کے خوف سے ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکتی تھی۔

(۶)

اس دن اسکول کی لڑکیاں نے گھر آنے کو کہا تھا۔ اماں اور آپا سارا دن گھر سجاتی رہیں۔ دیواروں میں تنے ہوئے مڑی کے جالے تک صاف کیے گئے۔ صفدر بھائی گیندے اور گل عباسی کے پھول لے آئے جو نیلے گلہ ازل میں سجادیے گئے۔ ماما نے بالٹیاں بھر بھر کر صحن دھو دیا اور وہاں مہندی کے پودے کے پاس آرام کرسیاں اور میز بچھا دی گئی۔ میز پر آپا کے ہاتھوں کا کڑھا ہوا سب سے خوبصورت میز پوش بچھایا گیا۔ چائے کے لیے نیا جاپانی سٹ نکالا گیا۔ وہ سٹ اسی وقت نکالا جاتا جب خاص قسم کے مہمان آتے چائے کے ساتھ کھانے کو کوئی چیزیں تلی گئیں۔ اماں اس دن بے حد خوش اور مصروف نظر آ رہی تھیں۔ دو پہر میں انہوں نے نہ خود آرام کیا نہ بابا کو کمر ٹکانے دی۔

”بھئی حد ہی، انگریز ہو کر خود ہمارے گھر آنے کو کہا۔“ اماں بار بار آپا سے

کہتیں اور کھلی جاتیں۔

اماں کی اس بات پر اس نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ صفدر بھائی اپنی مسکراہٹ

روکنے کے لیے ہونٹ پھینچ لیتے ہیں۔

”میرا خیال ہے کہ زیادہ لوگوں کو چائے پر نہ شکر کیپ ہونا چاہیے، وہ انگریز ہے

شاید اسے پسند نہ کرے، چار بجنے میں جب تھوڑی سی دیر ہ گئی تو اماں نے تیوری پر بل

ڈال کر اپنے حساب بڑی عام سی بات کی اور صفدر بھائی اسی وقت اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ٹھیک چار بجے مسز ہاروڈ ڈسم گئیں اماں اور آپا نے ان کا خیر مقدم کیا۔ مسز ہاروڈ کی

نیلی کانچ کی گولیوں جیسی آنکھیں گھوم گھوم کر گھر کا جائزہ لے رہی تھیں وہ کرسی پر بیٹھی ہی

جلدی جلدی بولنے لگیں۔

”آپ لوگوں سے مل کر ہم بہت کھوش ہو رہی۔ آپ کا گھر بڑا اچھا ہے۔ بڑا صاف

ہے۔ دوسرا یہاں کا لوگ تو بڑا گندا گھر رکھتا ہے، بڑا بگیم بھی گھر صاف نہیں رکھتا۔ ہم پھر

جو در آئے گا۔ آپ لوگ کے پاس۔“

”ہاں!“ اس ملک کے لوگ بڑے گندے ہوتے ہیں۔ ہماری بھانجی یعنی ہمارے

بھائی کی بیوی انگریز ہے، اماں نے بڑے فخر سے کہا۔

”اچھا!“ نیلی کانچ کی دونوں گولیاں مارے حیرت کے ٹوٹتی نظر آنے لگی تھیں۔

مسز ہاروڈ کی گہری نیلی آنکھیں اُسے کتنی پیاری لگی تھیں۔ اسکول میں جب

وہ ان کے کمرے میں جاتی تو جھپکے جھپکے ان کی آنکھوں کو دیکھتی رہتی۔

”یہاں کی عورتیں مرغیاں پالتی ہیں اور ان کی گندگی۔“ اماں بولنے اور

کیا کہتیں کہ آپا بیچ میں بول اٹھیں۔

”اب چائے پی جائے۔“

جب سے صفدر بھائی اماں کی بات پر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے، اس وقت

سے آپا بیزار ہو رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر اچانک تھکن کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

”ہاں ہاں تمہیں، بیٹی، ماما سے کہو۔“ چائے کے نام پر اماں بوکھلا گئیں۔ ان کا
چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ جس وقت ابا دفتر جا رہے تھے تو اماں نے ان سے کئی بار کہا تھا کہ چائے کے
وقت پہنچ جائیں تاکہ مسز ہاروڈ سے انگریزی میں باتیں کر کے اُسے خوش کر سکیں۔

”تم ہمارے پاس بیٹھنا مانگتا ہو عالیہ بٹ مسز ہاروڈ نے اس کو پیار سے دیکھا اور وہ آبا
کے پاس سے سرک کر ان کے قریب بیٹھ گئی مگر جیسے ہی چائے پیالیوں میں انڈلی گئی تو وہ جلدی
سے ایک پیالی اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ اماں نے گھور کر دیکھا مگر وہ صدف بھائی کے کمرے کی طرف
لیک گئی۔“

صدف بھائی اپنے کمرے میں اونہے منہ پڑے تھے وہ جانے اس وقت کیا سوچ رہے
تھے۔ کمرے کے اندر کتنی جلدی شام ہو جاتی ہے۔ ان کے کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔
صدف بھائی چائے۔“ اس نے پیالی میز پر رکھی۔

”ارے واہ۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ عالیہ بٹ، تم بھی میرے ساتھ پیو۔“

”نہیں! مسز ہاروڈ کے ساتھ پیوں گی۔“

وہ باہر آ گئی۔ مسز ہاروڈ مزے لے کے کر شامی کباب کھا رہی تھیں اور مرچیں
آئینہ بن کر ٹیک رہی تھیں۔

”آپ کی لڑکی بڑی ہوشیار ہے، کھوب پڑھتا ہے۔“ مسز ہاروڈ نے اس کی تعریف
کی تو وہ شرمائی۔

”جی ہاں، ہماری لڑکی بڑی ہوشیار ہے۔ دلیے یہاں کی لڑکیاں بڑی کورٹھ منخر
ہوتی ہیں پڑھنے کے نام سے بھاگتی ہیں، ہندوستانی لوگ اپنی لڑکیوں کو جاہل رکھ کر
خوش ہوتے ہیں۔“ اماں پھر ترنگ میں آ گئی تھیں۔

”کڑی گج؟“ مسز ہاروڈ نے سمجھا چاہا۔

بس ہوتی ہیں

”اور آپ کی اس لڑکی نے کتنا پڑھا ہے؟“ مسز ہارڈ نے ہنس کر پوچھا۔

”دس درجے، پھر بیمار ہو گئی۔“ اماں نے کہا۔

آپ اس پورے وقت کو خاموشی سے گزارتی رہیں۔ انہوں نے مسز ہارڈ سے ایک

بات بھی نہ کی۔

شام سب لاکھی تھی بسیر لینے والے پرندوں کی قطاریں جانے کس سمت اڑی جا رہی

تھیں۔ مسز ہارڈ بوکھلا کر اٹھ گئیں۔

”آپ کا صاحب نہیں آیا۔ ہمارے کو اس سے ملنے کا بڑا شوک تھا۔ کہیں چلا گیا

ہوگا دفتر کے کام کو؟“

”جی ہاں، جی ہاں۔ آج ان کے ایک دوست مر گئے تھے۔ اس لیے ان کے گھر گئے

ہوں گے۔“

اماں اس سے بڑا اور بہانہ کیا کر سکتی تھیں۔ ایک انگریز عورت کے ساتھ چائے نہ پی

سکنے کی کوئی بڑی وجہ ہی ہو سکتی تھی۔

مسز ہارڈ کے جاتے ہی اماں جیسے جھنڈا اٹھیں، ”دیکھا چائے پر نہیں آئے نا وہ تو

کو مجھے اتنا بہانہ یاد آ گیا درنہ کیا سمجھتیں مسز ہارڈ، دیکھ لیا یہ اپنی نفرت کے پیچھے کچھ

کر کے رہیں گے۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ انگریز سے زیادہ اتنا حکمران کون ہوگا۔ اپنے

لوگ تو ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہتے ہیں، ارے کون سمجھائے اس شخص کو؟

”کوئی کام لگ گیا ہوگا؟“ آپ نے آبا کی صفائی پیش کی۔

”کام ہے؟“ اماں بھیر اٹھیں۔ ”کوئی کام نہیں ہوگا۔ ارے وہ شخص۔“

اماں جانے اور کیا کچھ رہیں۔ وہ جلدی سے صفدر بھائی کے پاس چلی گئی۔ چائے

۲۱
کی پیانی اسی طرح میز پر رکھے رکھے ٹھنڈی ہوگئی۔ صفدر بھائی لالٹین کی پیالی
رشتی میں شرب سے لگ رہے تھے۔

”صفدر بھائی آپ نے چائے نہیں پی؟“

”ارے تو کیا میں نے نہیں پی۔“ وہ پیالی اٹھا کر پانی کی طرح پی گئے۔

”میں نہیں بولتی آپ سے، اب پی ہی تو کیا؟“ وہ کمرے سے نکل رہی

تھی تو صفدر بھائی پکار رہے تھے مگر اس نے جواب تک نہ دیا۔

جب کافی اندھیرا ہو گیا تو ماما نے میز کرسیاں ہٹا کر بنگ بچھا دیے ماما تھکن
سے چور ہو رہی تھی اور انیون کے نشے سے آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ان کے ہر مرض
کا علاج صرف انیون سے ہوتا تھا۔ ننھی سی کافی گونی نگلتے ہی وہ سارے دن کی
دُر دُر پھٹ پھٹ بھول جاتی تھیں تھکن غائب ہو جاتی اور وہ ملکہ جیسی شان سے
سو جاتیں۔

ماما بستر لگا کر باورچی خانے میں گئیں تو آبا آگئے۔ اماں انہیں دیکھتے ہی بھیر
گئیں۔ اب آئے ہیں خاں صاحب۔ کیا وہ نہ سمجھتی ہوں گی کہ آپ کو ان کا آنا پرا لگا
حد ہی، وہ انگریز ہو کر ہمارے گھر آئے اور صاحب بہادر پر دا بھی نہ کریں اگر وہ رپڑ
کردے کہ جناب نے اس سے بدسلوکی کی ہی تو پھر ہوش ٹھیک ہو جائیں گے۔ اماں
نے اتنے زور سے پاندا ان بند کیا کہ ماما گھبرا کر باورچی سے باہر نکل آئیں۔

”اب وہ زمانے لد گئے جب تمہارے انگریز کے نام سے کھتر کھتری پھلتی تھی

بات ہی کہ میں کچھ نہ کہوں تو کیا نفرت بھی نہیں کر سکتا۔“ آبا نے سختی سے کہا۔

یہ بد نیت تاجر، یہ حکمران کیا۔ مجھے تو ان کی ساری قوم سے نفرت ہی۔ اگر میرا داغ

بڑے بھائی جلیا ہوتا تو پھر دیکھتا، مگر میں تو بندھا ہوا ہوں، نوکری کرنے پر مجبور ہوں“

”ہوں! وہ تو میں جانتی ہوں کہ تم ہر وقت سب کو بھوکا مارنے پر تے ہوئے ہو۔“

”یہی تو وجہ ہے کہ تو کرمی کر رہا ہوں ورنہ میں تو بڑے بھائی کی طرح دوکان کر کے بیٹھ جاتا۔ مگر تم تو سب کچھ اپنے بھائی کے پاس رکھ آئیں، وہ بڑا دیانت دار آدمی ہے اس کی بیوی انگریز ہے۔“

”میں نے دس دفعہ کہا کہ سیر، بھائی بھادوچ کا نام مت لیا کرو۔“ اماں ایک بڑھکیاں بھر بھر کر رونے لگیں۔

آپا بڑی خاموشی سے پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں، ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میلی ملگھی چاندنی میں ان کے آنسو کتنے دردناک معلوم ہو رہے تھے۔

”سب رو۔ سب لڑو، وہ گھر سے بھاگ جائے گی۔“ اس نے بڑے بوڑھوں کی طرح سوچا تھا۔ لڑائی اور آنسو اس کی روح میں لرز رہے تھے۔

وہ اپنے بستر پر اوندھی لیٹ گئی اور زور زور سے سسکیاں لے کر رونے لگی۔

”دیکھو بیگم، ان سچوں پر کیا اثر پڑ رہا ہے، یہ سب تباہ ہو جائیں گے اور۔“

آبا کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے اماں نے آنسو پونچھ لیے۔

”ماما کھانے آؤ، عالیہ سو نہ جائے۔“ اماں نے آواز دی۔

”میں نہیں کھاؤں گی۔“ وہ زور سے سسکی اور پھر رونے لگی۔

کھانا آیا تو اس نے آبا کی نرم نرم ہتھیلیوں والے ہاتھ اپنی پیشانی پر محسوس کیے مگر وہ سوتی بن گئی۔ وہ تو اس دن اعلانیہ سب سے روٹھ گئی تھی۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ گھر کی فضا دھوپ چھاؤں کی طرح بدلتی رہتی۔ آبا

کی شاہیں بیٹھاگ میں گزرتیں۔ دوستوں کے جگمگاتے میں وہ زور زور سے باتیں کرتے

ماما چائے بنا بنا کر باہرے جاتے ہوئے چپکے چپکے بڑبڑاتی رہتیں اور آباں جیسے بڑے فنڈراب
کے ساتھ ادھر ادھر پھرتی رہتیں یا کسی کے کئے ہوئے کام کو پھر سے کرنے لگتیں۔ آپا بڑے
خاکوش رہتیں اور کسی کتاب کے ایک ہی صفحہ کو پڑھے چلی جاتیں۔

خدا جانے آپا اتنا کم کیوں بولتی تھیں۔ کیا محبت لوگوں کو گونگا بنا دیتی ہے؟ کیا محبت
کا نام الفاظ کی موت ہوتا ہے۔؟ پھر لوگ اتنی گھٹیا چیز کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں؟ آپا
تم کتنی معصوم تھیں۔

گھر کے ہی دردناک ماحول سے گھبر کر وہ بیٹھک کے دروازے پر جا کھڑی ہوتی۔ تہہ
جناح گاندھی وغیرہ کے سنے ہوئے ناموں کے علاوہ اس کے سمجھ میں صرف اتنا آتا تھا کہ سب
انگ بزدوں کی برائی کر رہی ہیں اسے کوئی بھی مزے کی بات نہ سنائی دیتی۔ اس پر آبا اسے دیکھتے
ہی اندر جانے کا حکم دیتے۔ صغیر بھائی اس کے آنکھوں آنکھوں میں کئے ہوئے اشارے
سمجھنے سے انکار کر دیتے۔ وہ بلی تو شام کے وقت بیٹھک سے اٹھنے کا نام نہ لیتے تھے۔
وہ رنجیدہ ہو کر باہر چوتھرے پر جا بیٹھتی اور اسے اپنی پہلی جگہ یاد آنے لگتی۔ کتنی
دور رد گئی تھی وہ جگہ، وہاں سے آتے ہوئے رٹین کی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اس نے
اتنے درخت گئے تھے کہ سارے حساب نے دم توڑ دیا تھا۔

جلیٹھ کا مہینہ تھا۔ لو جلتی رہتی۔ آموں اور بیبل کے درختوں میں چپے ہوئے پرند سارا
دن شور مچاتے رہتے۔ صحن میں لگا ہوا مہندی کا پودا چھوٹا سا سوکھ چلا تھا۔ ماما لاکھ پانی
ڈالتیں مگر اس کی پیوں پر رونق نہ آتی۔ چاندنی راتوں میں ٹھا کر صاحب کے گھر سے
کسم دیدی کے ہا مونسیم پر گلنے کی آواز آتی تو آپا اٹھ کر ٹھونے لگتیں کسم دیدی ان دنوں
ایک ہی گیت کو رٹے جاتیں۔

اماں آبا کے انتظار سے تھک کر آپا سے باتیں شروع کر دتیں، مہی صغیر کے

خاندان سے دشمنی کی داستانیں۔ سچہ بھوپھی کی خود غرضی کے قصے بھائی اور بھادرج کے محبت بھرے گیت۔ آپا بلیں جھپکا جھپکا کر سب کچھ سنتیں۔ مگر خود کچھ نہ کہتیں۔ ابائی ٹھیک جب سونی ہوتی تو کسی دوست کے گھر چلا جاتے تھے اور دن گیارہ سے پہلے واپس آتے۔ رات سونے سے پہلے وہ صفدر بھائی کے پاس چلی جاتی۔ باہر چوڑے پران کا پٹنگ بچھا ہوتا۔ جہاں وہ خاموش پڑے کچھ سوچتے رہتے۔

صفدر بھائی کہانی سنائیے باوہ جاتے ہی فرمائش کرتی اور ان کی کمر سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی۔ صفدر بھائی اپنے بچپن میں سنی ہوئی کہانیاں یاد کرنے لگتے اور جب کہانی یاد آ جاتی تو زور سے ہنستے وہ ہمیشہ ایک شہزادی اور ایک غریب آدمی کے کہانی شروع کرتے تھے اور غریب آدمی شہزادی کو نہ پاسکے کے غم میں ہمیشہ مر جاتا تھا۔

”صفدر بھائی آپ تو کسی شہزادی سے شادی نہیں کریں گے؟ ایک بار اس نے بڑی فکر سے پوچھا تھا۔

”لا حول ولا قوۃ میں کیوں مردوں کا بٹو۔ اور وہ ہر قدر ہنستے تھے کہ وہ چڑ کر رہ گئی تھی۔ گرمیوں کی پھیٹیاں گزرتی جا رہی تھیں وہ خوش نشی کہ اسکول کھلنے کے دن قریب آ رہے تھے جتنا وقت اسکول میں گزرتا وہ خوش رہتی۔ ساری دنیا کو بھول جاتی۔

اس دن دو پہر میں جب وہ سو رہی تھی تو اماں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز نے اسے جگا دیا تھا۔ ابائی آواز مدھم مدھم مگر سہلای ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر والان میں آگئی جہاں آپا پہلے سے کھڑی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کیا بات ہے۔

ذرا دیر بعد باہر سے رائے صاحب کی آواز آئی۔ اور آبا باہر چلے گئے، آپا آبا کے جلنے سے پہلے ہی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

”اس گھر میں صفدر دہلھان کر اسی وقت آئے گا۔ جب میری لاش جائے گی۔“

اپنے جاتے جاتے آماں کی بات ایک لمحے کو رک کر سُنی اور پھر چلے گئے۔
 ابا جیسے ہی مٹیہک میں گئے رات ان نے آکر آپا کو لپٹا لیا۔

”دیکھ لینا میں زہر کھالوں گی، وہ تم کو اس کیلئے صفدر کے ساتھ بیابان کی سوچ
 رہی ہیں، ہائے ان کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے، یہ اس شخص سے شادی کریں گے جس کے
 باپ دادا نے خاندانی عزت لوٹ لی، میرا راج پاٹ تھین لیا۔“ آماں روتے روتے پتنگ
 پر مٹیہک گئیں۔ ”اب اس کیلئے کوئی اسے کرنے کے لیے علی گڑھ بھیج رہی ہیں، میں آج ہی تمہارے
 ماموں کو خط لکھوں گی، پھر دیکھوں گی کہ سب کچھ کیسے ہوتا ہے۔“

وہ ڈر گئی کہ ماموں میاں جانے کیا کریں گے، مگر پھر سوچ کر اُسے تسلی ہوئی کہ آماں
 تو ہمیشہ ہی ماموں میاں کو خط لکھا کرتی ہیں مگر وہ دو تین مہینے بعد ہی جواب دیتے ہیں۔
 ”تمہاری دادی بے شرم تھیں جو صفدر کے باپ کو داماد بنا کر اب تک زندہ مٹیہک رہی
 ہیں تو اسی وقت زہر کھالوں گی۔“

”آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ کچھ بھی نہ ہوگا۔“ آپا جیسے کنوئیں کی تہ سے بولیں۔
 اُن کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

اُسے ہمارے آسمانی باپ تو ہمارے گھر سے لڑائیاں ختم کرادے! صفدر بھائی کے
 کمرے میں جاتے ہوئے وہ چپکے چپکے دعا کر رہی تھی۔ مس مری کی یاد کرائی ہوئی یہ دعا اُسے
 بہت دکھوں سے نجات دلا دیتی تھی۔

کمرے میں جا کر دیکھا کہ وہاں تو صفدر بھائی بھی رو رہے تھے۔ کچھ نہیں کرتا یہ آسمانی
 باپ بھی، وہ آسمانی باپ سے بھی روٹھ گئی تھی۔ اور روتے ہوئے صفدر بھائی سے لپٹ گئی۔
 ”سب رو رہی ہیں۔ اللہ کرے میں مرجاؤں۔“ وہ بہت سنجیدہ ہو رہی تھی۔

”اُسے میں تو علی گڑھ جا رہا ہوں نا۔ اس لیے رو رہا ہوں۔ مجھے اپنی عاقلیہ بڑی یاد

آئے گی۔" انہوں نے ہنستے ہوئے آنسو پونچھ لیے۔ تم دس گیارہ سال کی ہو کر کتنی بڑی ہو گئی
انہوں نے تہقیر لگایا۔

"مجھے معلوم ہی سب جھوٹ بول رہی ہیں۔"

صفدر بھائی صرف ایک ہفتہ بعد علی گڑھ جا رہے ہیں

ایک ہفتہ ماہ پوس کے سورج کی طرح جلدی جلدی ڈوبا جا رہا تھا اور وہ بیٹے ہوئے
دنوں کو انگلیوں پر گنتی رہ جاتی۔ وہ کتنی رنجیدہ رہنے لگی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ آپا کے بعد

صرف صفدر بھائی اس کا خیال کرتے ہیں۔ آپا خاموشی سے محبت کرتی ہیں۔ مگر صفدر بھائی
تو اس کے ساتھی ہیں۔ جن سے وہ کھلتی ہی۔ کہانیاں سنتی ہی۔ وہ چلے جائیں گے تو پھر وہ کیا کرے گی؟

صفدر بھائی نے یہ دن اپنے کمرے میں بند ہو کر گزار دیئے۔ ان دنوں آسمان پر بادلوں
چھانے لگے تھے۔ بھگی بھگی ہوا میں جلتی رہتی تھی۔

اماں نے صفدر بھائی کی صورت دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ اماں سے بات
کرنی چھوڑ دی تھی۔ وہ دس گیارہ بجے رات تک انگوٹھ دشمنی کے زبانی اظہار میں مصروف رہتے
آپا کا مطالعہ بہت ترقی کر گیا تھا۔ وہ جو کچھ پڑھتیں اُسے حفظ کرنے لگیں تھیں۔ گھنٹوں گزار جاتے
مگر صفدر بھائی کی نوبت نہ آتی۔

وہ گھر کے ماحول سے گھبرا کر باہر چھوڑے پر جا بٹھتی جہاں چیرا سی بیٹھا گڑھی پیا کرتا
وہ چیرا سی سے باتیں کرنے لگتی۔

"تمہاری کتنی تنخواہ ہے؟"

"مندرہ روپے"

تم نے اپنا گھرانوں کا کیوں نہیں بنایا۔؟"

ہم غریب جو ہیں بیٹیا، پکا گھر بنا کر لوگوں کی برابر ہی تھوڑی کر سکتے ہیں۔"

اسے ایک دم صفدر بھائی کے آبا یاد آ جاتے جو جیتے جی کسی سے عزت نہ کر اسکے اسے
وہ ساری کہانی یاد آنے لگتی۔ جو اماں نے کتنی بار آپا کو سنائی تھی۔ اس کا کلیجہ دکھتا تو وہ اٹھ کر
صفدر بھائی کے پاس چلی جاتی۔ مگر وہ تو ان دنوں بات کرنا قبول گئے تھے۔

دوسرے دن صبح صفدر بھائی علی گڑھ جا رہے تھے۔ ان کا سامان بندھا رکھا تھا
مگر بالکل اجازت معلوم ہو رہا تھا۔ اماں اس دن بڑی بیانی سے سارے گھر میں پھلتی رہیں۔ گھر
سے نکلنے کے بجائے اسے پڑھنے کو بھیجا جا رہا ہے۔ اس مردود کو ہماری دولت سے پڑھا کر
ہمارے سر پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ اللہ اسے دلہی نصیب کرے۔

شام کو آبا صفدر بھائی کے کمرے میں گئے اور بڑی دیر بعد باہر نکلے۔ پھر ٹھیک میں چلے
گئے۔ اتنی دیر اماں تملائی تملائی پھرتی رہیں۔

دہات بڑی اندھیری تھی۔ آندھی بارش کے آثار تھے اس رات دالان میں بستر لگائے گئے
تھے۔ کھانے کے بعد سب لوگ لیٹ گئے۔ بڑے طاق میں رکھی ہوئی ملاٹین کی تہی نہی روی گئی۔
سونے سے پہلے اس نے بڑے انہماک سے دعا کی تھی۔ کہ آسانی باپ صفدر بھائی کو
روک لے اور صبح کبھی بھی نہ ہو۔ اس دعا کے بعد وہ سو گئی تھی۔

صبح کے خوف نے ایک بار اس کی آنکھ کھول دی تھی۔ اس نے دیکھا کہ آبا صفدر بھائی
کے کمرے کی طرف سے دبلے قدموں آ رہے ہیں۔ پھر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔ اس نے ان کی دھیمی
سکاسکی کی آواز سنی اور بھر سو گئی۔

صفدر بھائی صبح تانگے پر بیٹھ کر چلے گئے۔ جانے سے پہلے وہ اماں کے پاس آئے تھے
ذرا دیر کھڑے رہے مگر جب اماں نے ان کی طرف دیکھا تاک نہیں تو اماں کی دعائیں لیتے چلے گئے۔
وہ دروازے تک ان کے ساتھ گئی مگر جب تانگہ کچی سڑک پر دھول اڑاتا چل دیا تو وہ آبا کی
ٹانگوں سے لیٹ کر رونے لگی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ آبا کی ٹانگوں سے لیٹ گئی تھی۔ اور وہ سر پر

ہاتھ پھیر رہتے تھے ورنہ آبا کو فرصت ہی کب ملتی جو کسی سے محبت کا اظہار کرتے۔

دو پہر کم دیدی آگئیں جو چپکے چپکے آپ سے باتیں کرتی رہیں۔ شام کو چائے کے بعد آبا نے

اماں سے پورے ہفتے کے بعد بات کی تھی۔

جب وہ بی۔ اے کر لے گا تو وہ کام ضرور ہو گا۔ سمجھتیں؟ "۔ ہم بھی دیکھیں گے۔"

"اماں کی آواز میں چیلنج تھا۔

(۶)

دن گزرتے گئے! صفدر بھائی کی یاد مدھم پڑنے لگی۔ اسکول سے آکر وہ کم دیدی

کے گھر چلی جاتی۔ اور وہاں ہارمونیم پر ڈگون گلی گیومور سے شایام، کی مشق کرتی رہتی۔ وہ

ان کے گھر میں کتنی خوش رہتی۔ اسے اپنے گھر کی نفاذ اس نہ آتی۔ اماں اب بھی ہر وقت نکر مند اور

بھیری ہوئی نظر آتیں۔ آپ اس طرح یا تو کتاب کے ایک صفحہ پر نظریں گاڑے پڑی رہتے یا پھر

نظریں سجکائے کسی نہ کسی کام میں اماں کا ہاتھ بٹاتی رہتیں۔ اس نے جی میں فیصلہ کر لیا کہ صفدر

بھائی کے علاوہ بھی یہاں کچھ گڑ بڑ ہے۔

صفدر بھائی کے کمرے میں بڑا سا تخت ڈال دیا گیا تھا جس پر سفید چاندنی کھچی ہوئی

تھی۔ کھانے کے لیے اسی پر دسترخوان سج جاتا۔ جب سے صفدر بھائی کے کمرے میں کھانا

شروع ہوا تھا آپا کی شوراک بہت کم ہو گئی۔

صفدر بھائی نے علی گڑھ جا کر صرف ایک خط لکھا تھا اس کے بعد انہوں نے کوئی

خط نہ لکھا۔ آبانے منی آرڈر سے روپے بھیجے تو وہ بھی واپس کر دیئے تھے۔ اس روز آبا

بہت رنجیدہ تھے مگر اماں بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔ وہ بڑے طنز سے ہنس رہی تھیں

اور آبا نظریں چار رہے تھے۔

”وہ جانتا ہے کہ تم ان ہی روپوں کی وجہ سے اس سے نفرت کرتی ہو“ آخر
ابا کو بولنا ہی پڑا۔

اماں مارے غصے کے بکھر گئیں۔ تو کیا میں اس بیچ کسان کے بیٹے کو سینے سے لگائے
رکھتی، کیا ہماری اولاد نہیں جو اس پر دولت خرچ کی جائے، وہ احسان فراہم کر
اس نے روپے واپس کر کے تمہارے منہ پر مارے ہیں۔ اسے اب تمہاری ضرورت ہی کیا ہے
بی اے کر کے یا تو عیش کرے گا۔ بیچ کہا ہے کسی نے، اصل سے خطا نہیں کم اصل سے ذفا نہیں
”میری بہن کا بیٹا کم اصل ہے اور تمہارے بھائی کی بیوی، پتہ نہیں کہی بھنگی کی اولاد
ہوگی۔ تمہارے بھائی نے اس سے شادی کر کے تمہاری قوم کے منہ پر کھپڑ مارا ہے۔ خدا
کی شان ہے انگریز بھنگی بھی ہمارے حکمران ہیں۔“

میرے بھائی بھارج کو کچھ کہا تو اچھا نہ ہوگا۔ وہ تم کو جانتی ہے نا ہی لیے منہ
نہیں لگاتی۔ میری وجہ سے چپ رہتی ہے ورنہ کب کا تم کو جیل بھجوا دیتی۔ اماں کی آواز
بھڑار سی تھی۔

”وہ بھنگن مجھے جیل بھجوا دیتی ہے، ابا غصے سے چیخے۔“

اماں زور زور سے رونے لگیں۔ آپکا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں
بلک رہی تھیں۔ وہ جتنی بڑھی ہوتی جاتی۔ اتنی زیادہ حساس اسے ابا سے شدید محبت
ہوتی جا رہی تھی اور اماں کی جھگڑا طبیعت سے بیزار ہی بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر اماں کو رو تے
دیکھتی تو اس کا دل تڑپ اٹھتا۔ یہی جی چاہتا کہ اماں کو کلبے میں چھپالے۔

”اب آئے تمہارا وہ بیچ بھانجہ، اگر بھنگی سے جوتے نہ لگوائے ہوں تو میرا نام نہیں“

اماں نے روتے ہوئے پھینچ کیا۔

ضرور آئے گا اور یہیں اس کی بارات آئے گی۔ ابا جلدی سے باہر چلے گئے۔

اماں دیر تک بڑبڑاتی رہیں۔ ایک دن اس گھر کا انجام بہت بُرا ہوگا۔
 وہ کمرے میں چلی گئی۔ آپا کھرے پلنگ پر اذندھی بڑی تھیں۔ "عالیہ ٹو، میں انہیں
 خط لکھ دینگی کہ اب وہ یہاں کبھی نہ آئیں" آپا نے سراٹھا کر اس کی طرف دیکھا مان کا چہرہ
 کتنا زرد ہو رہا تھا۔

"مگر ابا جو کہتے تھے کہ تمہاری شادی ہوگی صفدر بھائی سے!" اس نے آپا پر جھک

کر کہا۔

"افوہ! اماں یہ شادی کبھی نہ ہونے دینگی اور مجھے بدنامی سے بھی بہت ڈر لگتا ہے۔ اس
 لیے کچھ نہیں ہو سکتا" آپا نے بازوؤں میں مُنہ چھپا لیا۔ وہ چپ چاپ مٹی آپا کا ہاتھ سہلاتی
 رہی۔ اس وقت وہ کیسی سچی سچی باتیں سوچ رہی تھی۔ صفدر بھائی تو مزے سے پڑھتے ہوں
 گے اور انہیں کوئی یاد بھی نہ آتا ہوگا۔ مگر یہاں سب انہیں یاد کر کے لڑے مرتے ہیں۔ سب
 کتنی فضول باتیں ہیں۔ صفدر بھائی نے اسے بھی تو ایک خط نہ لکھا۔ کیا وہ آپا کو یاد کرتے
 ہوں گے۔

"اماں سے نہ کہنا کہ میں رو رہی تھی" آپا نے آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اٹھا کر کہا
 "میں نے کب کبھی کچھ کہا ہے اماں سے" وہ جل ہی تو گئی۔

کسم دیری کمرے میں آگئیں تو وہ اٹھ کر دالان میں چلی گئی۔ اُسے معلوم تھا کہ اب
 وہ دونوں کس قسم کی باتیں کرینگی۔ پھر بھی سب اس سے ہر بات چھپاتے۔ صرف اس
 لیے کہ خاصی بڑی ہونے کے باوجود وہ سب سے چھوٹی تھی۔ کوئی بھی اس کی ولی کیفیت نہ
 جانتا تھا۔ کوئی بھی تو یہ نہ سوچتا تھا کہ اس کے دماغ کی کیا حالت ہے۔ کوئی اسے سمجھنے کی
 کوشش نہ کرتا۔ کوئی یہ نہ جانتا تھا کہ وہ تو اب سکول میں دعا کرنے ہوئے آسمانی باب
 تک سے اپنے گھر میں رحمتیں نازل کرنے کی دعا میں کیا کرتی تھی۔

(۸)

کئی خزاں اور بہار میں اگر گزر گئیں بر آس کے گھر کی خزاں بہار میں نہ بدلی صحن میں لگے ہوئے
 مہندی کے پودے کو آپا کتنا ہی پانی دیتیں مگر اس کی پیاس نہ کبھی۔ مٹی مٹی سہری شاخیں سیاہ
 پڑ گئی تھیں۔ آپا ان کئی برسوں میں کتنی کمزور ہو گئی تھی مابا گھر سے بالکل بے تعلق سے نظر آتے تھے
 دفتر سے آنے کے بعد مٹھیک آباد ہو جاتی اور رنگ بڑھ کر انہوں سے نفرت کے اظہار میں آبا کی آواز
 اب سب سے اونچی ہوتی۔ اماں اس وقت بڑی بے چینی سے صحن میں ٹھہرتی رہتی۔

”ہائے وہ کون سا منحوس دن تھا۔ جب میری شادی ہوئی تھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔
 جو رہا ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا۔“ وہ ٹھہرتے ٹھہرتے رک کر آپا سے کہتی اور جواب نہ پا کر پھر
 بڑبڑانے لگتی۔

دیکھ اب وہ صدف بھائی کی طرف سے کسی قدر مطمئن تھیں، علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد
 وہ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ آبانے بہت سہرا مارا مگر ان کا تپہ نہ معلوم ہوا اماں بہت جلدی میں
 تھیں کہ کسی طرح آپا کی شادی کر دی جائے۔ انہیں خطرہ تھا کہ صدف بھائی کا بھوت پھر کہیں سے
 نہ آنکلے۔

اماں جب کھانا پکا چکی تو اماں اس سے شادی کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔ آبا کو تو گھر کی کسی
 بات سے دلچسپی ہی نہ تھی رات جب وہ بستر پر آتے تو کوئی کتاب اٹھا لیتے۔ شادی کی بابت ہوتی
 تو ہوں ہاں کر کے ٹال دیتے۔

اس دن جب اماں نے کسم دہری سے سنا کہ آبا کے ایک دوست گرفتار کر لیے گئے تو اماں مارے
 دہشت کے کانپ گئیں۔

اتم ہم کو سبک منگوا دو گے۔ اگر دشمنوں کو کسی نے پکڑ لیا تو کیا ہوگا؟ راست
اماں بک بک کر رہیں۔

آبا کچھ بے چین سے ہو کر اٹھ بیٹھے "میں تو تم لوگوں کی وجہ سے خود ہی کچھ نہ کرتا اور
مجھے تو کچھ کرنا بھی نہیں تھا۔ بس یہ نفرت ہی جو چھپائے نہیں چھپتی۔"
اس کے بعد اماں دیر تک روتی اور بولتی رہیں۔ مگر آبا ایک لفظ بھی نہ بولے۔

دوست کی گرفتاری کے بعد اماں کو آبا کی شادی کی فکر اور بھی بڑی طرح ستانے لگی۔ ایک
بھائی اور بھانج کے سوا ان کا اپنا تو کوئی بھی نہ تھا۔ ہاں آبا کے عزیزوں میں ڈھیر دانہ ٹرکے
تھے۔ اماں نے ان دنوں اپنے بھائی کو بھی خط لکھا تھا کہ آپ کی شادی کا ٹھکانہ کر دیں ان کے
بھائی نے جواب میں لکھا تھا کہ تمہاری بھابھی کہتی ہیں کہ شادی لڑکی کی پسند سے ہونی چاہیے
اس لیے آپ خاندان کے لڑکوں کو تمہینہ سے ملائیں اور وہ جسے پسند کرے شادی کر دیں۔ اور
وہ کہتی ہیں کہ ہم تمہینہ کی شادی میں ضرور آئیں گے۔

یہ خط پڑھ کر اس کی توجاں بھنک گئی تھی مگر اماں سارا دن مسکراتی رہیں وہ بار بار خوش ہو کر
کہتی تھیں۔ "لو بھلا بے چاری بھابھی کو کیا خبر کہ یہاں ایسی رسمیں نہیں ہوتیں۔"
اماں یہ خط پڑھ کر خود ہی خوش ہوتی رہیں۔ مگر آبا سے ذکر نہ کیا۔ ہاں آبا کے پیچھے پڑی
رہیں کہ تمہینہ کی شادی کا انتظام کر دو۔

آبا یا تو چیپ رہتے یا پھر یہ کہہ کر جان تھپڑاتے کہ جہاں جی چاہو کر دو۔
اماں یہ جواب سن کر لڑنے بیٹھ جاتیں "پھر تم یہ کہو کہ باپ نہیں ہو تو میں خود ہی باہر
نکل کر لڑکا ڈھونڈ لوں گی۔"

آبا ان باتوں سے بچنے کے لیے آواز دے کر آبا کو اپنے پاس بلا لیتے تو اماں کو مجبوراً
خاموش ہونا پڑتا۔

انہیں دلوں بڑی چچی کا خط آگیا۔ وہ قبل بقیہ کے لیے تہنیتہ آپا کو مانگ رہی تھیں۔
اماں کو ایسے وقت میں یہی پیغام ظنیت لگا اور آپا سے پوچھ کر منظوری کا خط لکھ دیا۔

اُمی دن ہولی جلی تھی۔ دوسرے دن کم دیدی ہمارے ہاں بہت سا پکوان لے کر آئیں
اور جب آپا سے گلے ملنے لگیں تو ان کے منہ پر ڈھیر سا عبیر مل دیا۔ پھر اس کی طرف تھپیں مگر وہ
کسم دیدی کے ہتھے نہ چڑھی۔ آپا کی رنگی ہوئی صورت دیکھ کر اماں کو بے ساختہ ہنسی آگئی
شاید اس وقت وہ رنگ کھیلنے کو گناہ سمجھنا بھول گئی تھیں۔

تہنے ہولی نہیں کھلی کسم! اماں نے پوچھا۔

”میں دو ہوا جو ہوں مومی“ کسم دیدی کی ہنستی ہوئی صورت کھلا گئی۔

”ہوں“ اماں نے شاید پہلی بار انہیں ہمدردی سے دیکھا تھا۔

”جی چاہتا ہوں کہ خوب رنگ کھیلوں مومی، رنگین ساری پہنوں، من کو مارنا کتنا مشکل کام ہوتا
ہے، پوتی نے تو یہ کچھ نہ سوچا تھا“ کسم دیدی بھوٹ بھوٹ کر رونے لگیں۔

”جپ رہو کسم تھوار کے دن رونا منحوس ہوتا ہے“ اماں نے انہیں سمجھانا چاہا تو کسم دیدی نے
جلدی سے آنسو پونچھ لیے اور پھر آپا سے باتیں کرنے لگیں۔

دوسرے دن دوپہر میں ماما نے آنکھیں کھپاڑ کھپاڑ کر اماں کو بتایا کہ کسم دیدی بھاگ گئیں۔
مارے حیرت کے اماں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”ارے کیا بیج مچ کسم دیدی بھاگ گئیں! وہ خود بھی چونک کر اماں کا منہ ٹکنے لگی تھی مگر آپا
کے چہرے پر ذرا ہی حیرت کے آثار نہ تھے۔ وہ ہندی میں پانی دے رہی تھیں جس کی تپیاں اب
ہری ہو چلی تھیں۔

”ہے، رائے صاحب کی ناک کٹ گئی، کیسے عزت والے لوگ تھے؟“ ماما تھاپٹ پٹ کر
باتیں کیے جا رہی تھی۔

”اب خوب ہو لی کھیلے گی۔ رنگین ساریاں پہنے گی، اماں باؤ کی ناک کٹ گئی تو کیا ہو اارے
 میں ہوتی تو بھاگنے والوں کو زندہ دغا دیتی۔ سگی بہن نکلی سلمہ کی، تو بہ! اور نہ کریں دوسری شادی
 اپنے دھرم کو لے کر جاتیں اب۔ بیٹی ہر وقت گاتی رہتی تھی۔ تب کسی کو پتہ نہ چلا! اماں باتیں
 کرتے ہوئے آپا کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ارے اگر مجھے پتہ ہوتا تو اپنی تہینہ کے پاس ایک منٹ
 کو نہ بیٹھنے دیتی؟“

”میرے پاس بیٹھنے سے کیا ہوتا ہے اماں؟“ آپا نے شاید زندگی میں پہلی بار تلخی سے جواب
 دیا تھا۔!

”اشد کر کے کسم دیدی اپنے گھر خوش رہیں؟ وہ برابر دعائیں کیے جا رہی تھی اور اسے
 بار بار سلٹی کھوپ بھی یاد آ رہی تھیں۔“

چند دن تک رائے صاحب آبا کی ٹیٹھک میں بھی نہیں آئے تھے اور جب آئے تو سب سے
 بھی کہتے رہے کہ کسم اپنی نانی کے گھر گئی ہے۔ روٹھ کر گئی ہے اس لیے مارے اُداسی کے کہیں نہیں آیا گیا۔
 کسم دیدی کی ماما جی نے بھی تو اماں سے یہی کہا تھا کہ کسم روٹھ کر اپنی نانی کے گھر ہر دو ار چلی گئی
 ہے۔ جب وہ وہاں آئے گی تو پھر انہیں اڑانے والوں سے پوچھوں گی۔“

مگر جب اس نے یہی بات آپا سے کہی تو ان کا چہرہ فق پڑ گیا۔ ”خدا نہ کرے وہ وہاں آئے۔“
 انہوں نے دھیرے سے کہا۔

کسم دیدی کے بھاگنے کے بعد اماں کی نگرہوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ
 کسی طرح بھی آپا کو ان کے گھر لاکر دیا جائے۔ اماں سارا دن تمہیں بھیا کے حسن اور لیاقت کا ذکر
 کرتی رہیں وہ ان باتوں کو بڑی دلچسپی سے سنتی مگر آپا کو جانے کیا ہو گیا تھا کہ ایک دم گھر کے
 کام میں جھٹ گئی تھیں۔ سارے کمروں کا سامان اٹا کر پھرے سجا گیا۔

”آپا تم نے تمہیں بھیا کو دیکھا تھا وہ کیسے ہیں؟“ اُسے اپنا آپا کے ہونے والے شوہر سے سخت

دل چسپی ہوتی جا رہی تھی۔

”پتہ نہیں“ آپا اس کے سوال پر منس پڑیں وہ خاموش نظر آ رہی تھیں۔

”عالیہ اب تم کو مصداق بھائی نہیں یاد آتے؟“

”قلبی نہیں۔ سخت بے مزہ آدمی نکلا۔ جو مجھے یاد کرے میں اُسے یاد کرتی ہوں۔“ اس نے بڑے

کھرے پن سے جواب دیا۔ ”میں تو صرف اپنے جمیل بھتیجا کو یاد کرتی ہوں۔“ اس نے شرارت سے آپا کو دیکھا تو وہ بڑے زور سے ہنسنے لگی۔

”آپا اللہ کرے میرے امتحان کے بعد آپ کی شادی ہو۔ مدد نہ سارا مزا کرنا ہو جائے گا۔“

اس نے بڑی فکر سے کہا۔ ”نہیں کلاس کی پڑھائی نے اس کو کس قدر سنجیدہ بنا دیا تھا۔“

”میں تمہارے امتحان سے پہلے شادی کر ہی نہیں سکتی، مجھے دلہن تو تم ہی بناؤ گی۔“

آپا نے اُسے غور سے دیکھا اور پھر کمرے سے نکل گئیں۔

(۹)

ان نون مہندی کی مٹیوں کا رنگ کتنا گہرا سبز ہو رہا تھا آپا صبح پشم لوٹے بھر بھر کر پانی ڈالتی

ماما انہیں دیکھ کر بڑی شہت سے ہنسی۔ ”خوب سنبھو بیٹیا۔ یہ مہندی تمہارے ہاتھوں میں لگنی ہو۔“

آپا بڑی ڈٹٹائی سے مسکراتی۔ کیا مجال تھی جو وہ کسی کی بات پر ذرا سا شرماتی۔ اماں کے سامنے

اپنے جینز کی تیار یوں میں گن رہیں لیکن خوبصورت مینز پوش اور تکیہ کے غلاف کا ڈھ رہی تھیں کہ

ہاتھ جو م لینے کو جی چاہتا۔ اس سے کسی کام کو نہ کہا جاتا کیونکہ وہ تو نون کلاس کی تعلیم کے پہاڑ کو سر کر رہی تھیں

ان دنوں گھر کی فضا میں چاندنی کی ٹھنڈک محسوس ہوتی۔ اماں۔ آبا کے وجود کو اس طرح بھول گئی تھیں

کہ لڑنے کا نام بھی نہ لیتیں درزی اور سنا سارا دن گھر کے چکر لگاتے رہتے۔ نونوں کی کتابوں کو دیکھ

دیکھ کر اماں کی آنکھیں نہ تھکتیں اور وہ بڑے سکون سے اپنی کتابیں پڑھتی رہتیں۔

پر ہائے یہ سکون کتنا عارضی تھا۔ ایک دن صبح صبح ماما نے آکر بتایا کہ اپنی تہنہ
 بیباکی سہیلی کسم واپس آگئی ہے۔

”چل جھوٹی۔“ اماں مارے حیرت کے جھج پڑیں۔

”اللہ قسم بی بی جی وہ وہ واپس آگئی ہے میری نند نے خود اسے دیکھا ہے اس کے ساتھ
 ایک آدمی بھی ہے مکان لے رکھا ہے کراہیہ پر۔“

ہر اتنی بے شرمی۔ ایک تو بھاگی اور پھر ماں باپ کے سینے پر مونگ دلنے یہیں آگئی،
 ارے اسے رہنے کو کوئی اور جگہ نہ جڑی تھی۔ اگر اس نے میرے گھر کا رخ کیا تو ٹانگیں چیر کر
 پھینک دوں گی۔“ اماں نے آپا کی طرف دیکھ کر کہا اور آپا کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا
 وہ میز پوش چھوڑ کر اٹھیں۔ اور جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

جب وہ اُن کے پاس گئی تو آپا بڑی بے چینی سے ہاتھ مل رہی تھیں۔

”اری عالیہ، وہ یہاں کیوں آگئی۔ یہاں تو سب اُسے ذلیل کر نیگے وہ بیوقوف اسے

یہاں کیوں لے آیا۔“

”شاید وہ اپنے ماں باپ سے ملنے آئی ہوں چہرہ مہینے بھی تو ہو گئے شاید وہ معافی مانگنا چاہتی

ہوں۔“ اس نے کہا۔

”اری بے وقوف! آپا کچھ سوچنے لگیں۔“

جانے کسم دیدی کس گھر میں ہوگی۔ کیسے ملوں ان سے جو اماں کو بھی پتہ نہ چلے۔ اس کا سہی

چاہ رہا تھا کہ کسی طرح کسم دیدی سے مل لے۔

”تم ان سے نہ ملنا اور نہ اماں مار ہی ڈالیں گی۔“ آپا نے بدہمت کی مگر وہ برابر سہی

سوچ رہی تھی کہ اگر مکان معلوم ہو جائے تو اسکول جاتے ہوئے ضرور ملے گی۔

اس رات آپا سنٹ بے چین رہیں۔ رائے صاحب کے گھر میں ایسا ناٹا تھا کہ

کسی کے بولنے کی آواز نہ آتی تھی۔ آپا شاید ساری رات نہ سوئی تھیں۔ صبح ان کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔

ماما کام کرنے آئی تو اس نے پھر بے حد اہم خبر سنائی کہ وہ آدمی مائوں رات کم دیدی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ باقی رات کم دیدی روتی رہی۔ اس پاس کے سارے لوگ جمع ہو گئے ماں باپ سے طرانے کے بہانے اور محافی دلانے کے لیے لایا تھا۔ رائے صاحب نے انکار کر دیا تھا مگر ان کی بیوی آج صبح منہ اندھیرے کم کے گھر گئی تھیں۔

"یہی سن رہی تھی ہی ایسی تراخاؤں کی۔ بہت اچھا ہو جو چھوڑ کر چلا گیا۔ لو بھلا، گھر سے بھاگ کر بیوی بننے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ کر لیے مزے اب کھلتے؟" اماں زہر میں کبھی باتیں کر رہی تھیں ماہر آپا پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

میں آبا سے کہوں گی کہ رائے صاحب کو سمجھائیں وہ کم دیدی کو گھر لے آئیں ہائے وہ اکیلے کیا کرے گی؟ اس نے بڑے جوش سے کہا تھا۔ اس مرد کی طرف سے اُسے کیسی سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ یہاں لا کر اُس نے کون سا کا زمانہ انجام دیا۔ وہیں کہیں دیار غیر میں چھوڑ کر بھاگ جاتا تاکہ وہ سرٹیک ٹیک کر مر جائیں یہ انہوں کی ذلت تو نہ نصیب ہوتی۔

"کیا کوئی تم اپنے آبا سے یہی کہتا ہے؟" اماں نے سخت غصہ سے پوچھا تھا۔

"ہاں یہی کہوں گی! وہ اماں کے سامنے سے ہٹ گئی۔

شام کو جب آبا دفتر سے آئے تو وہ ان کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔ "آبا کم دیدی کی گھر میں رہ رہی ہے، ابو رائے صاحب کو سمجھائیے وہ اسے لے آئیں۔ کوئی نہیں چھوڑ کر بھاگ گیا مجھے سب معلوم ہی ہیں تمہارے کہنے سے پہلے ہی رائے صاحب کو سمجھا تا۔ بڑی سمجھدار، میری بیٹی۔" آبا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرائے لگے۔

اسے کیا ضرورت ہو گی کہ ایسی بے شرمی کی باتوں میں حصہ لے؟ اماں غصہ سے مبیاب رہی تھیں
 کیوں نہ حصہ لے ہن اسکو میں ٹپھاتی ہو اور بولنے تک کا حق نہیں دیتیں،
 ”صاف بات کیوں نہیں کرتے کہ اگر نیربے شرم ہوتے ہیں؟ اماں لڑنے پر تل گئیں تو آبا
 جلدی سے بیٹھا میں چلے گئے۔

رات آبانے چپکے سے اس کو بتایا کہ رائے صاحب نے بات مان لی ہے وہ کسم کو گھر
 لے آئیں گے اور شاید لے بھی آئے ہوں۔“

آبا کے اس سلوک پر وہ کتنی خوش ہوئی تھی۔ اس دن اسے اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا تھا۔
 پھر بھی وہ باوجود کوشش کے کسم دیدی سے ملنے نہ جا سکی۔

وہ رات کتنی لمبی ہو گئی تھی اسے نیند نہ آرہی تھی کب صبح ہو اور وہ اسکول جاتے
 ہوئے کسم دیدی سے ملنے آوارہ کتوں نے بھونک بھونک کر رات کو اور بھی دیران کر دیا تھا۔
 اسکول جانے سے پہلے وہ کسم دیدی کے گھر پہنچ گئی۔ ماں جی رسوی میں تھیں مائے
 صاحب آرام کر رہی رہا نکھیں بند کیے لیٹے تھے کسموں نے انگلی کے اشارے سے بتایا کہ
 کسم ادھر ہے۔

وہ کمرے میں گئی مگر کسم دیدی وہاں نہ تھیں کوٹھری میں تھانکی وہاں وہ کھڑے
 پینگ پر گڑی مڑی پڑی ہوئی تھیں اسے دیکھ کر وہ تھجک گئیں تو وہ خود ہی آگے بڑھ
 کر ان سے لپٹ گئیں۔

بہت یاد آتی تھیں کسم دیدی، اس نے غور سے انہیں دیکھا فیصل کٹ چکی تھی۔ کھیت
 دیران ٹپا تھا

اس نے ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھانا چاہا۔ یہاں اب دھیری کوٹھری میں کیوں گھسی ہیں باہر
 چل کر بیٹھیں نا۔

”وہاں بیٹیوں تو سب لوگ مجھے دیکھنے آتے ہیں۔ ماں جی نے کہا ہے کہ تھپ کر بیٹھو
پھر تیا جی میری صورت دیکھ کر دکھی ہوتے ہیں، میں بدنام ہوگئی ہوں نا۔ تہینہ کسی ہی؟“
”گھر چل کر دیکھ لو دیدی“

”اب میں کہیں نہیں جا سکتی“ ان کی آنکھوں میں ویرانیاں رورہی تھیں۔

”میں اپنی دیدی کو خود لے جاؤنگی“

اسکول کا وقت قریب تھا اس لیے وہ شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی راستے کھبر کسم دیدی
کے عاشق کو کوستی رہی تھی۔

جب گھر آئی تو اپنے اُسے پکڑ لیا اور کسم دیدی کے لیے اکٹھے بہت سے سوال کر ڈالے
مگر وہ کیا بتاتی۔ کسم دیدی سے تو کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔

”ان سے جا کر مل لو نا آپا“

”اب اگر ان سے ملی تو لوگ انگلیاں اٹھائیں گے۔ وہ بد معاش جو مشہور ہو گئیں“

مگر لوگ اس آدمی کو برا کیوں نہیں کہتے جو انہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔؟

”بس نہیں کہتے، لڑکی ہی کو برا سمجھتے ہیں۔ تم بھی اب بڑی ہو گئی ہو ان کے گھر نہ جانا

ورنہ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے۔“

اس شام اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کی عجیب سی کیفیت ہو رہی ہے عشق و عاشقی کے

اُچھے اُچھے سے خیالات اُسے چکرائے دیتے تھے۔ یہ عشق و محبت کیا ہے جس کے لیے انسان

بڑے بڑا گھانا اٹھالیتا ہے آخر کیوں، کس لیے۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔

سوچتے سوچتے وہ تھک گئی تھی۔ اس نے سب سے پہلے کھانا کھالیا اور اپنے بستر پر لیٹ

کر کورس کی کتابوں سے اُکھنے لگی، پھر اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ کس وقت سوئی۔

سوتے سوتے ایک بار اسی آنکھ کھل گئی۔ باہر سے کتوں کے بھونکنے اور روتے کی آوازیں

آ رہی تھیں۔ رات بیچ بیچ منحوس ہو رہی تھی اچانک اس کی نظر سامنے اٹھ گئی۔ چاندنی رات میں رائے صاحب کی چھت کا کمرہ صاف نظر آ رہا تھا اور اس میں دیے کی روشنی ادھر سے ادھر بھیر رہی تھی۔ بھیرا سے کوئی نظر نہ آیا جو سر سے پاؤں تک سفید کپڑوں میں لپیٹا ہوا تھا اس نے مارے خوف کے آنکھیں بند کر لیں اس کمرے میں تو کوئی بھی نہ رہتا تھا خود کسم دیدی نے اسے بتایا تھا کہ جب سے دادا جی اس کمرے میں مرے ہیں تب سے یہ بند پڑا ہوا ہے وہاں جاتے ہوئے سب لوگ ڈرتے ہیں۔

اس نے ڈر کر سوچا کہ شاید کسم دیدی کے دادا کی روح اٹھ گئی ہو مگر بھیرا سے یاد آیا کہ ہندوؤں کے گھریل میں بھوت آتے ہیں اس نے ڈر کر آپا کو پکارا لیکن وہ کروٹ لے کر بھیر سو گئیں۔ ذرا دیر بعد روشنی بجھ گئی اور یہ سایہ غائب ہو گیا تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔ صبح سب لوگ چائے پی رہے تھے کہ رائے صاحب کے گھر سے بونے پینے کی آواز آنے لگی۔ میں جانوں وہ کسم بھیر بھاگ گئی! اڑے جاؤ سے باہر بھاگی۔ عاتھ ہی آبا بھی باہر لپکے۔ وہ چلو فرصت ہوئی۔ کسم نالا ب میں جا ڈوبی، پتہ نہیں چلا کہ راستہ کس وقت گھر سے نکل گئی! آجینڈ منٹ بند ہے اگر جیسے کرسی پر گر پڑے۔ سارا اون لوگ اُسے دیکھنے اور عیوضات حاصل کرنے آتے رہے شاید وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ بھاگنے والی کے سر پر پیننگ تو نہیں نکل آئے ہیں۔ میرے کپڑے لاؤ مجھے رائے صاحب کے گھر جانا ہے۔"

اماں بالکل دم بخود تھیں۔ آپا رو وہی تھیں اور وہ آبا کے کندھے پر سر رکھے سر سے پاؤں تک لہرز رہی تھی۔ ابا اُس کا سر ہلار رہے تھے۔ اسے تھپک رہے تھے مگر اسے جانے کیا ہو گیا تھا کہ رو یا بھی نہ جانا تھا۔

کسم دیدی کھاٹ پر ڈال کر گھرائی جا چکی تھیں۔ عتوں کے ہجوم کو جیسے اس نے اس کے کھلے ہونے چہرے کو دیکھا تو چیخ پڑی۔ سو جا ہوا نیلا چہرہ جذبات سے خالی تھا

سب ان کو دیکھ رہے تھے مگر انہوں نے سب کو دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے ہونٹ عجیب انداز سے کھلے ہوئے تھے جیسے "کون گلی گویا شام" کے بول ہمیشہ کے لیے لوٹ گئے ہوں۔ کھاٹ سے لٹکی ہوئی سفید ساری کے پتے سے پانی کی آخری بوند بھی ٹپک کر کچے مسخ میں جذب ہو چکی تھی۔

(۱۰)

اکتوبر کا مہینہ تھا۔ الکی الکی مسوی پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ دلایاں اور ڈھ اور ڈھ کر سب لوگ اندر سونے لگے تھے۔ سردیوں میں اسے کیسے مزے کی نین آتی مگر آپا کو جانے کیا ہو گیا۔ زیادہ حصہ جاگ کر گزار دیتیں ان کی صحت خراب

ہو رہی تھی رنگ، ہاتھم پڑ گیا تھا۔ اور چہرے پر خشکی دور گئی تھی اماں ان کی غذا کا خاص طریقے سے خیال رکھتیں صبح چائے کے بجائے باداموں کا حریرا پلا یا جاتا۔

آپا کا جہیز سب گیا تھا اور اماں بے چین تھیں کہ کسی طرح شادی کی تاریخ مقرر ہو جائے ادھر بڑی چچی کے خط پہ خط آرہے تھے کہ جلدی سے تاریخ مقرر کرادی جائے گا۔ آپا ڈھیل تہینہ کی صحت ٹھیک ہوگی جبت دیکھیں گے۔

ایک بار بڑی چچی کا خط آیا تو اس میں تمہاری بھئی کی تصویر بھی۔ وہ تصویر لے کر آپا کے پاس گئی تو انہوں نے منہ پھیر لیا۔

"انسان صرف ایک ہی بار کسی کا بتا رہی"۔ انہوں نے غصے سے کہا پھر ایک دم ہنس دیں۔ "اب اکٹھے ہی لیں گے۔ ان کی ہنسی میں کتنی بے بسی تھی۔

"کیا آپ کو صدف رکھائی یاد آتے ہیں آپا۔" اس نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"تو یہ اکیوں یاد آنے لگے" آپا نے سرانے رکھی ہوئی کتاب اٹھالی۔

آباد فتر سے آئے تو بہت رنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ المے میز چائے کا سامان لگا دیا مگر آپا ہی

طرح آرام کر سی بولتی رہی

”کیا آج جائے نہیں پیو گے۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے، پھر آج تم کوئی اچھا سا دن دیکھ کر شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دو، تمھاری بھابھی کے خط یہ خط آرہی ہیں اماں نے اپنی کرسی مابکے قریب کھسکالی۔“

”تمھاری بوجھ سے وہ اس گھر کو چھوڑ گیا، وہ غلط قسم کی پارٹی کے ساتھ ہو گیا اس لیے اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے اس کی تباہی کی ذمہ دار تم ہو۔“

آپا کا چہرہ فق پڑ گیا۔ سب سمجھ گئے تھے کہ ابا کس کی بات کر رہی ہیں۔ کس کسخت کو تباہ کیا ہے میں نے؟ اماں بولیں۔

”صفدر کی بات کر رہا ہوں۔ اب آیا عقل میں؟“ ابا نے تڑسے جواب دیا
”ہائے وہ اس گھر سے جا کر بھی نہیں گیا وہ یہاں سے کبھی نہیں جائے گا۔“ اماں نے رونے کا حربہ استعمال کر دیا۔

”تم اطمینان رکھو اب وہ کبھی نہ آئے گا۔“ ابا نے آہستہ سے کہا اور چائے پے بغیر ٹھیک میں چلو گئے جب وہ ابا کے لیے چائے لیکر بیٹھک میں گئی تو وہ آنکھیں بند کر کے تخت پر لیٹے تھے۔ اُسے دیکھ کر اچھٹے اور کرانے لگے۔ ”تمھاری ماں کو میں کیسے تمھاراؤں۔ انھوں نے تمھارے بھائی کو تباہ کر دیا ہے کالکتے سے اس کا ایک دوست آیا ہے اس نے یہ سب کچھ بتایا ہے۔ تمھارا بھائی تم کو سید پوچھ رہا تھا۔“

ابا وہ کون سی پارٹی ہے۔“

”بیابا وہ دہریوں کی پارٹی ہے۔“ ابا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ میں تو اسی کو اپنا بیٹا

سمجھتا تھا۔“

”وہ کب کسی کو باپ سمجھتے تھے۔ جب کے ایک خط بھی نہ لکھا۔ کسی کی محبت کی قدر نہ کی۔ ابا خواہ خواہ ان کے پیچھے دھیانے ہو رہی ہیں اس نے دل ہی دل میں سوچا مگر ابا سے کچھ نہ کہہ سکی

”تمھاری پڑھائی کا کیا حال ہے۔“

”ٹھیک ہے آبا۔“

”تم انگریزوں کے فارسیب سے تو متاثر نہیں ہو۔“

”توبہ توبہ!“

”شباباش تم بڑی سمجھدار ہو۔ میری ساری اُمیدیں تم سے وابستہ ہیں تم کو بچہ ہی بنا کہ مجھے

ان سبے ایکن تاجروں سے نفرت ہی انھوں نے ہمیں غلام بنا لیا ہے۔“

”مجھے بھی نفرت ہی انھوں نے ہمیں غلام بنا لیا ہے۔“

”مجھے بھی نفرت ہی آبا۔“ اس نے آبا کو خوش کرنے کے لیے کہا تھا۔

آبا نے تپائی پر پیالی رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا ان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں

اور وہ سوچ رہی تھی کہ آبا آخر سارے انگریزوں سے کیوں نفرت کرتے ہیں۔ خود اس کے ہسکول

کی نگراں کتنی اچھی اور پیاری وہ آخر کب ملک پر حکومت کر رہی ہیں۔

”انشاء اللہ ایک دن یہ سب اپنے ملک الپس چلے جائیں گے، میں تم لوگوں کے خیال سے کچھ

نہیں کر سکتا مگر اتنا بڑا ملک تو بڑا ہونا۔“

”جی ہاں بہت بڑا ملک ہے۔“ اس نے کس قدر احمقوں کی طرح کہا تھا کہ آبا بھی مسکرا پڑے جانے

کس نے درد ازہ کھٹ کھٹایا تو وہ کشتی اٹھا کر جلدی سے اندر آگئی۔

”مجھے سب معلوم ہے کہ ددا اپنے آپ کو کیوں تباہ کر رہی ہیں؟“ رات کو آپا نے اس سے

سرگوشیوں میں کہا تھا مگر وہ چپ رہی، کسم دیدی ڈوب مری۔ پھر بھی آپا کو صدقہ دھبائی یاد

آتے ہیں۔ اس نے بڑی نفرت سے سوچا۔

اماں برآمدے میں بیٹھی بڑی چچی کے خط کا جواب لکھ رہی تھیں۔ آبا جب کھانا کھانے آئے

تو اماں نے جیسے اعلان کیا۔ ”میں نے تمھاری بھانجی کو عید کی دس تاریخ لکھ دی ہے۔“

آباچپ رہی انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لالٹین کی پیلے سلی رشتی میں وہ کس قدر دکھی نظر آ رہی تھی

(۱۱)

شادی کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی اماں کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ بارہ ایک بجے کے قریب چیراہی کی بیوی برقع اڑھ کر آجاتی اور چادروں کے دھان صاف کرنے لگتی۔ ادھر بیٹوں خشک پوسے کاٹنے کو پڑے تھے اماں اس سے کام لیتے ہوئے کس قدر بے رحم نظر آتی تھیں سارے دن کی تھکی باہری چیراہی کی بیوی جب شام کو اپنے گھر جانے کیلئے اٹھتی تو لڑکھڑا جاتی۔ جنوری کے آخری دن تھے ایک روز پہلے بارش کے ساتھ اولے پڑے تھے رات اس قدر سرد ہو گئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ برف کی سل پر لیٹے ہیں۔ مندروں سے آتی ہوئی گھنٹوں کی صدائیں جیسے ٹھٹھکر رہ گئی تھیں۔

بڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد آپا نے اس کی طرف سے کوٹ لے لی تھی وہ مونے ہی والی تھی کہ آپا نے کھیر باتیں شروع کر دیں جانے ان کی غیند کو کیا ہو گیا تھا۔
"ایسا لگتا ہے کہ مسافروں کی طرح بٹھی ہوں۔ انہوں نے بڑے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔
"مسافر تو میں ہی کچھ دن بعد وطن بن کر چلی جائیں گی۔ بھن بن کر آپ کیسی خوبصورت لگیں گی۔
"اور میرے ہاتھ میں ناخوبصورت ہے؟ آپا نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ لکھانے سے نکال کر لہرا دیا۔
"ان جہاں ہندی رچے گی، اسی دن کے لیے تو میں نے ہندی کے ذرا سے پودے کو سنبھالا تھا اب وہ کٹنا پڑا ہو گیا ہے سچی جا ہتا ہے کہ اس کے سایہ میں بڑے مسرور ہوں۔ یہ ہندی بھئی کیسی عجیب چیرا ہوتی ہے اس سے سہاگ کی مہک ہوتی ہے۔ محبت کی گھنٹہ ک محسوس ہوتی ہے اور یہ بات بھی ہے کہ اس کی سُرخ سے تمناؤں کے خون کا پتہ چلتا ہے۔

"اُدھ! آپ بھی کمی باتیں کرتی ہیں آبا! اس نے اچھکرا پاکی طرف دیکھا اشدت

اُسے خیال آیا تھا کہ اماں ٹھیک ہی تو کہتی ہیں کہ صفدر بھائی نے آلم غلم کتابیں دے دے کر
آپا کو تباہ کر دیا ہے۔

”میں کمی باتیں کرتی ہوں۔“ وہ مسکرائیں۔ ”باتیں ہی تو سب کچھ ہوتی ہیں۔ انہیں باتوں نے
مجھے مسافر بنا دیا ہے۔ اور یہی باتیں میرے سفر کو ختم کر سکتی ہیں۔“

”آپا آپ کو صفدر بھائی یاد آتے ہیں، سچ بتائیے۔؟“

”کون صفدر بھائی۔ اری بو تو ف تیرے پاس تو عقل نام کو نہیں۔“ آپا نے ہنستے ہوئے

اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا ”چلو اب سو جائیں۔ اتنی رات ہو گئی۔“

شادی میں صرف چند دن رہ گئے تھے اماں سخت مصروف تھیں اور خوش تھیں کسی کسی وقت

انہیں یہ فکر بھی سرنے لگتی کہ ان کے بھائی اور بھانجے نے ہفتے پہلے پونچنے کو لکھا تھا مگر کسی وجہ

سے نہ پونچ سکے وہ برابر ان کا ذکر کرتی رہتیں۔ اس ملک کی بدلتی ہوئی رتیں بھی تو بھابھی کی طبیعت

کو رہیں نہیں آتیں۔ ذرا میں نہیں زکام ہو جاتا ہے۔ عمدہ الگ خراب ہوتا ہے کہیں نہ کہیں دعوت

میں اس غریب کو مرچیں کھانا پڑ جاتی ہیں۔ بھلا مرچ بھی کھانے کی چیز ہے؟ اماں آپا سے جواب

چاہتیں مگر وہ خاموش رہتیں۔

آپا نے اپنے کمرے سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ آبا گھر میں آتے تو اپنے کمرے کے دروازے بھٹیر لیتیں۔

اماں کو ان کی شرمیلے کی لدا پر بڑا پیار آتا وہ بڑے فخر سے کہتیں کہ شرم ہو تو ایسی ہو۔

اُس نے آپا کے چہرے پر شرم و حیا تلاش کرنے کی لاکھ کوشش کی پر رتی بھر نہ ملی آپا کو تو جب

شرم آتی تو جا پانی گڑیا کی طرح گلابی پڑ جاتی مگر وہ تو بالکل سفید ہو رہی تھیں ان کی آنکھوں

میں ایسی گہرائی تھی ایسا اندھیرا تھا کہ ان کی طرف دیکھ کر لگتا کنویں میں جھانک رہی ہوں۔

بارات آنے میں جب سات دن رہ گئے تو آپا کو نہلا دھلا کر اور پیلے کپڑے پہنا کر ناچھے بھاگا گیا

رات میرا نہیں اور دو منیاں ڈھول لے کر آئیں اور برآمدے میں کچھی ہوئی دری پر

بیٹھ کر قسم قسم کی آوازوں میں گانے لگیں۔ کتنا ارمان، کتنی آرزو میں تمہیں ان گانوں میں جو کچھ
کنواری زندگی میں نصیب ہوا تھا اُسے پالنے کی تمنا میں گیت کا ایک ایک بول ہاتھ پھیلا کے
ہوئے تھا۔

گیت ہوتے رہے اور آپا پیٹے دوپٹے کی ادٹ سے آنسو پونچھتی رہیں آپا کے دستوں کی بویاں
ایک ایک گیت کو دو دو بار سننے کی فرمائش کریں مگر گانے والیوں کے گلے نہ تھکتے۔ درمی پر
دفعے دفعے سے دو دو چار چار آنے داد کے طور پر گرتے رہے۔

رات دیر تک جلنے کی وجہ سے اماں دو پہر میں تھک کر گہری نیند سو رہی تھیں۔ ماما
بہت دنوں بعد دو گھنٹہ کی چھٹی لے کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ آپا بیٹی تھیں نہیں نیند نہ آرہی تھی
وہ بار بار کر دین بدلتیں۔ سامنے صحن کی کچی سی دیوار پر گوا بیٹھا ایک ساں بولے جا رہا تھا
اس کی آواز سے دو پہر کا سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔

”مہمان آنے والے ہیں اس لیے کوا بول رہا ہے۔“ اس نے خوش ہو کر آپا سے کہا۔

”اور مہمان جانے والے بھی تو ہیں۔“ آپا بڑی مدت کے بعد خوش اور مطمئن نظر آرہی تھیں

مگر پھر ایک دم کچھ سوچ کر اکتد بیٹھیں۔ ”عالیہ تم کو کیا پتہ میری اتنی عمر کچھ بچے کی طرح رنگت رنگ

کر گز رہی ہے۔ ان کا چہرہ مسرخ پڑ گیا۔ تم مجھ سے اچھی رہیں، میری حیثیت تو ایسی رہی جیسے
کوٹھری میں کوئی کباڑ ڈال کر بھول جائے۔ اماں۔“ ان کے ہونٹ کانپنے لگے۔

”اماں مجھے بھی تو ڈانتی ہیں مگر میں تو خوش رہتی ہوں۔“

”دانتوں نے تو سب کچھ صفر بھائی کی دشمنی میں کیا۔ میں مجھ سے خطرہ تھا نا۔“

”مگر اب تو آپ آزاد ہو جائیگی صفر بھائی اب آپ کی زندگی تلخ کرنے نہ آئیں گے خدا مجھے

ان سے بھی۔“

”ارے کو سو تو نہیں!“ وہ ہنسنے پاؤں باہر پانی پینے چلی گئیں۔

جب وہ پانی پی کر اُس میں تو اُن کی ملکیتیں کھسکی ہوئی تھیں انہوں نے لٹیتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں
 جدی، آپا اب تک اس کمینے کے لیے سوچتی ہیں کہ یہ کسم دیدی کا انجام سوچنے کے بعد بھی عقل ٹھکانے

نہ آئی۔

وہ سونے کی کوشش کر رہی تھی کہ چیرا ہی ڈاک لے کر آگیا۔ آپا بھی اٹھ گئیں اس نے خط اٹاکر
 دیکھا۔ اماں کے نام تھا اور ایک کونے میں منقذ لکھا ہوا تھا۔ آپا نے تڑپ کر خط کھول لیا اور پڑھنے کے
 بعد اس کی طرف بڑھا دیا۔ پڑھ کر وہ مارے خوف کے لرزے لگی تھی، "چچی آہنیہ کی شادی
 مبارک ہو۔ آپ اُسے کسی کا بھی بنا دیا پھر بھی وہ میری رہے گی، وہ صرف میری ہی۔"
 آپا کے چہرے پر ایسا سکون تھا جیسے دنیا جہان کی دولت مل گئی ہو اس نے جلدی سے خط پھاڑ
 اس کی کڑھیاں جو لھے میں ڈال دیں۔ دوسرا خط ماموں کا تھا جو اس نے احتیاط سے سر نہ رکھ لیا
 "بھیا ہم تو سوتے ہیں سخت یاد رہی ہے،" آپا بڑی چالاک سے سوتی بن گئیں مگر وہ منقذ
 بھائی کو دل ہی دل میں گالیاں دے رہی تھی۔ اگر یہ خط اماں کو مل جاتا تو پھر کیا ہوتا؟ اس خیال
 ہی سے اس کا دل ڈر رہا لگتا۔

"آپا کتنے کمینے میں منقذ بھائی،" اس نے آپا کو ہلایا۔

"اور نہیں تو کیا ہیں۔ خدا کے لیے اماں سے ذکر نہ کرنا اور نہ جانے کیا ہوگا۔" انہوں نے

دھیرے سے کہا۔

رات کھانے پینے کے بعد والان میں درمی بھادی گئی۔ ماما نے ڈھول کس کر بیچ میں لڑھکا دی

اور مانگے کا گیس کا ہنڈا والان کے درمیان لڑھکا دیا۔ ذرا دیر بعد مہمان آنے لگے۔

رات گیارہ بجے کے بعد جب میراٹنیں کا بجا کر چلی گئیں تو آپا ہولے ہولے کمرے سے نکل کر

والان میں آگئیں شکینیں پڑی ہوئی درمی پر لڑھکتی ہوئی ڈھول بڑی سونی معلوم ہو رہی تھی۔

ماما کرسیاں اٹھا اٹھا کر کمرے میں رکھ رہی تھی اور ساتھ ہی جانے کیا تلاش کیے جا رہی تھی۔

”ہائے جانے کہاں گئی، ملتی ہی نہیں، نامس جائے اس یاد کا۔“
 ”عالیہ ٹو۔ سنو جب میں چلی جاؤں اور تم کو صفر ملیں تو میرا ایک پیغام کہہ دیا۔ کہہ دو گی نا؟“ بستر پر لیٹتے ہی اپنے بڑی بے چارگی سے کہا۔

”کیا آیا؟“ آپ کو عجیب سی حالت میں دیکھ کر اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔

”یہی کہ میں ان کو کبھی نہیں بھولی اور بس۔“

”اب سو جائیے آیا۔“

باہر کتوں کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ جانے کس وقت سو گئی۔

(۱۲)

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو آپا بے خبر سوئی ہوئی تھیں۔ وہ اسکول جانے کے لیے تیار ہوتی رہی مگر آپا نہ اٹھیں جب سب لوگ چائے پینے کے لیے اٹھے تو اماں نے ماما کو بھیجا کہ آپا کو جگا کر چائے دے دے۔

ماما کی چیخ کی آواز سن کر آپا اور اماں آپا کے کمرے کی طرف بھاگے۔ ماما سینے پر دو ہتھ پڑا کر کہہ رہی تھی۔ ”تہنہ بٹیا نہیں رہیں۔“

”کہاں گئیں، کہاں چلی گئیں“ وہ مارے خوف کے کانپنے لگیں۔ وہ جانے کیسے کمرے تک گئی۔ جہاں آپا بے ہوش اماں کو کھائے کھڑے تھے مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ گر پڑیں گے۔

آپا سچ مچ نہیں رہی تھیں۔ ان کے مہندی رچے ہاتھ بڑی سب سے پھیلے ہوئے تھے۔ اس وقت اس طرح سیاہ ہو رہی تھے جیسے کسی نے منی لگا دی ہو۔

اماں ہوش میں آتے ہی پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ آپا بچپن کی طرح رو رہی تھی اور وہ آپا کے ٹھنڈے جسم سے لپٹی رو رہی تھی۔

آبانے جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔ "ہمیشہ سے دل کمزور تھا اس لیے دل کی حرکت بند ہو گئی
 ہے۔ ماما تم جاکر پانی گرم کرنے کا انتظام کرو۔ اسٹد کو یہی منظور تھا۔" آبا کی آواز کانپ رہی تھی۔
 ماما کے باہر جاتے ہی آبانے اماں سے سرگوشی کی۔ "تم ہمت سے کام لو۔ ہم مصیبت میں
 پھنس گئے ہیں۔ میت کو جلدی سے اٹھانا ہو۔ اماں کو تھپوڑ کر انھوں نے اُسے لپٹا لیا اور دوسرے
 کمرے میں لے گئے۔" تم تو بڑی سمجھدار ہو اتم یہیں بیٹھو۔

آبا سے اکیلے کمرے میں تھپوڑ کر چلے گئے مگر اس وقت تو آبا کا حکم ماننا اس کے بس میں
 نہ تھا وہ جا کر دروازہ کی ادٹ میں کھڑی ہو گئی۔ آبا اماں کو سمجھا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کاغذ
 کا ایک پرزہ تھا جسے انھوں نے ماہس سے جلا دیا تھا۔ اور پھر اماں کو تھا مگر دالان میں لے آئے
 ماما نے سینے میں پانی چڑھا کر اس وقت صبح ہی صبح دری بچھا دی بڑھوں کس کرنے ڈالی
 آبا کے دوستوں کی پوچھیاں آرہی تھیں پر کوئی دری پر پیسے نہ پھینک رہا تھا۔ سب رو رہی تھیں
 اور ان کے بیچ میں بھی ہوئی اماں کو بار بار غش آرہا تھا۔
 آپا کو جلدی جلدی نہلا دھلا کر رخصت کر دیا گیا۔ اماں پاگلوں کی طرح ان کے پیچھے
 بھاگ رہی تھیں۔

"ارے بیٹا، بڑی بیبا رخصت ہو گئیں۔ تم گاؤ نا، کاہد کو بیبا ہی بدیس نکھیا بابل مور"
 اماں کی بات پر جیسے کمرام مچ گیا۔ وہ آپا کے کمرے میں بھاگ گئی تھی۔ اور زمین پر
 بیٹھ کر دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ جسے ہوئے کا خند کے ٹوکڑے ادھر ادھر اڑھٹے پھرتے تھے
 "ہائے کیسی اربانوں بھری چلی گئی۔" ماما بولائی ہوئی کمرے میں آئی اور ادھر ادھر
 کچھ تلاش کرنے لگی۔ "کل سے انیم کی ڈبھیہ کھوی تو پھر نہ ملی۔ ایک ذرا آئی کھا
 لیتی تو دل بٹھرتا۔"

(۱۳)

بڑے چچا اور بڑی چچی اور ماموں آئے دو دن رہ کر پھر سب رو پیٹا کر چلے گئے۔ ماموں کی انگریز بیوی نہ آسکی تھی کیونکہ ان دنوں وہ ماں بننے والی تھی اور تمہیں کھیا بھی تو نہ آسکے تھے ذرا اپنی ہونے والی دو دھن کی تربت ہی دیکھ لیتے۔

اس وقت کے بعد اماں کسی چپا اور گھٹی گھٹی رہیں۔ اس کے بعد تو صرف وہی ان کی محبت کا مرکز رہ گئی تھی۔ بہ وقت نظروں میں رکھتیں۔ ذرا دیر کو پاس سے مہلتی تو اماں کو احتیاج کے دورے پڑنے لگتے۔

آبا اماں سے کتنے دور ہو گئے تھے۔ دفتر سے آکر بیٹھک ہی میں ہاتھ منہ دھوتے ہیں پیائے پیتے اور کھانا کھا کر رات کے گیارہ بجے تک دوستوں کے کھگھٹ میں بحث و مباحثہ کرتے رات جب سب سو جاتے تو چپکے سے آکر اپنے بستر میں دبا جاتے۔ آبا کے مرنے کے بعد آبا بہ طرف ڈراتا بھرتا اور کوئی بھی نظر نہ آتا۔ جو اس سناٹے کو توڑ دے۔

صفدر بھائی کی پھر خبر نہ لگی۔ انہیں زمین بھل گئی یا آسمان وہ تو ان کے پتے کھانے ترستی تھی وہ انہیں لکھنا چاہتی تھی کہ قبر کے پاس کافی جگہ ہی اگر محبت کرتے ہو تو پھر آجاؤ۔

اس دن جب آبا بیٹھک میں آئے تو کوئی ساک نہ تھا۔ وہ جلدی سے ان کے پاس چلی گئی۔ کتنی مدت ہو گئی تھی کہ وہ آبا کے پاس نہ بیٹھ سکی تھی ان سے کوئی بات نہ کر سکی تھی۔ آبا آپ گھر میں نہیں آتے کسی سے نہیں بولتے۔ اس نے جاتے ہی آبا سے کہا تھا، اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ آبا نے گھر آکر اس کا سر سینہ سے لگا لیا تھا۔

”تمہاری ماں نے مجھے گھر سے دُور کر دیا ہی تم کو سب کچھ معلوم ہی ہے۔“
اس کا کتنا جی چاہا تھا کہ آبا سے کہے کہ اماں نے کسی کو گھر سے دور نہیں کیا صفدر بھائی

نے سب کو ایک دوسرے سے جُدا کر دیا ہی، پھر آپ تو انگریز دشمنی میں ایسے مصروف ہیں کہ سچے
 مڑ کر دیکھتے ہی نہیں۔ آپ محبت کو پہچانتے ہی نہیں۔ مگر وہ یہ سب کچھ نہ کہہ سکی اُسے خود حیرت تھی
 کہ ابا کی بے اعتنائیوں کے باوجود وہ انھیں سب سے زیادہ کیوں چاہتی تھی۔ کیا جہاں آباد تھا۔
 ابا کی شفقت آنکھوں میں وہ ابا کے حالات کبھی ایک لفظ بھی تو نہ کہہ سکی۔

تمھاری ماں نے مجھے کبھی نہ سمجھا۔ انھوں نے میری کسی خواہش کا ساتھ نہ دیا۔ اگر مجھ میں بھی
 تمھارے بڑے چچا جیسی جرأت ہوتی تو آج میں اتنا مجبور نہ ہوتا۔ ابا جانے کیا کہنے والے تھے کہ
 رائے صاحب آگئے۔

آپا کی موت نے اسے اپنی عمر سے آگے بڑھا دیا تھا۔ وہ اماں کی دلجوئی کرنا چاہتی تھی۔ ابا
 کو گھر واپس لانے کے لیے بے قرار تھی۔ وہ انھیں سیاست بازی سے ہٹانا چاہتی تھی۔
 اس کی شکایت کے بعد ابا تھوڑی دیر کے لیے گھر میں بیٹھنے لگے مگر ایسا لگتا کہ اماں سے
 کتر رہی ہیں اور اماں جب ان سے آنکھیں چا کر تیں تو چہرے پر بیتے ہوئے دنوں کی
 یاد لرز نے لگتی اور وہ صدف بھائی کے لیے سوچتی رہ جاتی۔ کس قدر ٹھاٹ سے اس شخص
 نے ایک خط لکھ کر آپا کو موت کے منہ میں ڈھکیں دیا تھا۔

آپا کی موت کو کئی مہینے ہو گئے تھے مگر اماں نے ان کی کسی چیز کو ادھر سے ادھر نہ کیا
 تھا۔ آپا کا پلنگ اسی طرح پڑا تھا۔ ان کی کتابیں اسی طرح رکھی تھیں وہ جب ان کے کمرے
 میں جاتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ دل ڈوب جائے گا۔ اماں نے ان کے جہیز کے بکس کو بھی اسی
 کمرے میں لگا دیا تھا۔ انھیں دیکھ کر اُسے عجیب سی بے بسی کا احساس ہوتا کچھ دن بعد آپا
 کے جہیز کے بکس میں پھینک کر گھس کر سب کچھ چاٹ جائیگی۔ رہبات میں لچکا گوٹا سیاہ پڑ جائے گا
 وہ سوچا کرتی تھی۔

میٹرک کا امتحان دینے کے بعد وہ بالکل بے کار ہو گئی تھی سدن کاٹے نہ کٹے یہ دن

دن بونہی آپا کی کتابیں اٹھا کر پڑھنے لگی۔ کتنے عشق و محبت سے بھرپور تھے تھے عورتوں
محبت میں خود کشتی کر کے مثالی وفا پیش کر جاتیں اور مرد کسی تاریک رات میں قبر پر شمع روشن کر کے
چلے جاتے اور بس۔

کتابوں کو الماری میں پٹخ کر وہ مارے جھبلا ہٹ کے روتی رہی تھی اور آپا آنٹوں
کے پردوں کے اس پار کھڑی بڑی حقارت سے آپا کو دکھتی رہی تھیں۔

(۱۴)

دو تین دن سے آپا سخت مصروف تھے دفتر سے بھی بڑی دیر میں آتے۔ ان کا انگریز فہر
مجانے کے لیے آنے والا تھا۔ آپا ہر چیز ٹھیک کرانے کے علاوہ ڈاک، بنگلے میں اس کے رہنے
کا انتظام بھی کر رہی تھے آپا کے ہاتھوں کے کڑھے ہونے کئی مینر پوش اور گلہ ان بھی سپر ہی
مانگ لے گیا تھا۔

نوب انگریزوں کو گالیاں دیتے ہیں اور اب وہ آ رہا ہے تو مارے ڈر کے سبھی گم ہو جیتے
کی۔ زبانی بیع خرچ کرنے پر کیسے تیز ہوتے ہیں لیوگ بھی "اماں بڑے فخر اور طنز سے ہانتیں
تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جانی۔ کاش، وہ ایک ذرا دیکو اماں کی آڈاں بن سکتی تو پھر بتائی کہ
چھٹر خانی کرنے کا کیا فائدہ ہوتا ہے آپا گھر سے دور ہوتے جانی تھے اور اماں اپنے حال میں سہتیں
رات آپا تھکے ہارے بسپا آئے تو اس سے کہا تھا "بٹی تم رات کے کھانے کا ذرا اظہا را
آپا کو ادینا ایک سچے رات آدمیوں کا کھانا ہے صبح رہے سو اسے کو آ رہا ہے رات ہمارے گھر دعوت ہوئی
بھی سیدہ خانی خولی نفرت کرتے ہو اور خوشامد میں لگے ہو اس کی ارے مجھ سے اب میں خود خوش
کا انتظام کر دوں گی" آخر اماں آپا کے سامنے بھی نہ چولیں۔

"میں نے خوشامد نہ کی تو پھر تم بھیک جو مانگنے لگوئی آپا جلدی سے باہر چلے گئے اور

وہ اماں سے ایک افظ نہ کہہ سکی۔ ان کی اُجاڑ صورت دیکھ کر رحم آنے لگا۔
 دوسرے دن ابا تاروں کی پھاڑوں میں اٹھ کر اسٹیشن چلے گئے۔ اماں اپنے اپنا کپڑا پانوں
 لٹکا کر بیٹھی بڑے طنز سے ہنستی رہیں مگر ابا نے ان کی طرف نہ دیکھا۔

دن کا ایک روغ گیا مگر ابا کھانے پر بھی نہ آئے۔ وہ اماں کے ساتھ رات کی دعوت کے انتظام
 میں مصروف رہی۔ اس نے بیٹھک کو بڑے نئے طریقے سے سجایا تھا اور گیس کے دو دو ہنڈے منگو کر اچھی
 طرح صاف کرائے تھے۔

اماں کو قسم کے کوفتے اور کباب تیار کر رہی تھیں اور ایک ساں چینی سبار ہی تھیں کہ مصداقہ بغیر
 مزج کے پیسا جائے۔ اماں نے اتنی لگن سے کبھی کسی دعوت کا انتظام نہ کیا تھا
 کھانا بس تیار ہی تھا کہ چیرا اسی بوکھلایا ہوا بغیر آواز دے کر گھر میں گھس آیا ایسا معلوم ہوتا
 ہوا کہ بڑی دُور سے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔

”بگم صاحب اپنے بابو جی کو پولیس پکڑے گئی۔ موٹے کے وقت اس سے جھگڑا ہو گیا۔
 اور اپنے بابو جی نے رول سے اس کا سر پھاڑ دیا۔“

اماں نے آنکھیں پھاڑ کر اس طرح دیکھا جیسے اُن کے چاروں اور اندھیرا چھا گیا ہو۔ پھر انہوں
 نے چیخا: چاہا تو بس منہ کھول کر رہ گئیں۔ دعوت کے سامان پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔

”کہاں ہیں ابا۔ میں اُن کے پاس جاؤں گی۔“ وہ پاکلوں کی طرح اٹھ کر بھاگی تھی۔ مگر
 چیرا اسی کے سامنے دیوار بن گیا تھا۔ ”آپ کہاں جاؤں گی بیابا بی بی؟“

”تو میرے سر چڑھتا ہے۔“ اُس نے چیرا اسی کو مارنے کے لیے دوڑا ہوا اٹھا دیے تھے

”میں تو بیابا بی بی کا غلام ہوں، آپ کہاں جاؤں گی، بابو جی تو تھانے میں ہیں۔“ چیرا اسی

نے صاف کا پلو آنکھوں پر رکھ لیا۔ ”ڈیم پھول کہتا تھا اپنے بابو جی کو، حرام زادہ۔“ چیرا اسی

نے سرخ سرخ آنکھوں سے اس کی طرف نہ دیکھا۔ ”مجھے مل جاؤں تو ایک ہزار ایک انگریز

صدرتے کر کے پھینکوں اپنے با بوجی پر سے۔ خون چڑھ گیا ہی۔ میری آنکھوں میں خون۔
 ذرا دیر میں رائے صاحب آ گئے۔ اماں دروازے کی ادٹ میں کھڑے ہو کر ان سے باتیں
 کر رہی تھیں انھوں نے ماموں کا پتہ دے دیا تھا کہ انھیں تار کر دیا جائے۔ مگر اس نے جلدی سے بڑے
 چچا کا پتہ بھی دے دیا۔ وہ تو بڑے چچا کو صرف دو ہی بار دیکھ کر ان کی گردیدہ ہو گئی تھی۔ اگر بڑے چچا
 نہ ہوتے تو پھر کیا ہوتا۔ ماموں کتنی صفائی سے کہہ گئے تھے کہ اقدام نقل بہت بڑا جوہم ہے۔ ایسے آدمی
 کے بیوی بچوں کی سرپرستی کرنے میں انہیں بھی خطرہ تھا۔

اماں تو اس سے یہ بات صاف چھپا گئی تھیں۔ مگر اس نے براہِ آدہ میں کھڑے ہو کر خود اپنے
 کانوں سے سنا تھا اُسے! اور انگریزوں سے اس دن اتنی نفرت ہوئی تھی کہ جی چاہتا سب کی بوٹیاں
 چبا ڈالے۔

بڑے چچا نے آکر سب کے سردوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ددون کے اندر اندر سما مان، بندھوا کرتا نگوں پر
 لہو دیا۔ بڑے چچا کھلے خزانے انگیزوں کو گالیاں دے رہے تھے ابا کے انجام سے ان کا جوش اور بھی
 زہ گیا تھا۔

جب بڑے چچا ابا کے دوستوں سے خدمت ہو رہے تھے اور اس کا تازہ آہستہ آہستہ رنگنے لگا تھا
 تو اس نے دیکھا کہ اس کے اکیل کی نگواں بڑی تیزی سے چلی آ رہی ہے
 مانگے کے پاس آ کر اس نے اپنی پھولی ہوئی سانس درست کی اور پھر پیار سے اس کا ہاتھ تھام
 ! اسے تم لوگ کھوش رہنا۔ تم نہ کرنا۔ تمہارا قادر بہت اچھا آدمی تھا۔ تمہارا مالک جو در آ جا ہوگا
 نگواں رشیکہ ہوئے مانگے سے الگ ہوئی۔ گڈ بائی، گڈ بائی۔

«آبا جیل کی سلاخوں کے پیچھے تمہارا کیا حال ہوگا؟» وہ اپنے بستر پر اٹھ کر سمجھ گئی کھڑکی
 کے پٹے کھول دیئے تو وہ اکا ایک سرد تھا۔ اسے جھوکر گزر گیا اس کا سہارے درد کے پٹا جا رہا تھا
 کاشش نہیں آ جا۔ یا پھر سونے ہو جائے۔ وہ پھر سونے کے لیے لیٹ گئی۔

(۱۵)

صبح ہو گئی۔ بادل پھٹ گئے تھے اور ادھر ادھر کھلی کھڑکی سے سورج کی کرنیں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ رات صرف ایک گھنٹہ سونے کی وجہ سے آنکھوں میں کھٹک ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آنکھ میں پلک ٹوٹ کر گر پڑی ہو۔

”ارے واہ آپ ابھی تک سو رہی ہیں؟“ شمیمہ کا رنگ اس وقت بڑا نکھر ہوا لگ رہا تھا۔ عالیہ نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ ایسی موٹروں کی صورت کہ لگتا فرشتوں نے سایہ کر رکھا ہے۔

”میں تو دیر سے جاگ رہی ہوں۔“ وہ ہمیشہ کی طرح بستر سے اٹھ کر اٹھی لیکن ایک دم سے اسے یاد آیا کہ وہ نئی جگہ پر ہے۔ یہ تہی دنیا ہے اور آبا کا مشفقانہ ٹھنڈا سایہ اس سے بہت دور ہے۔

”میں نے ابھی ناشتہ نہیں کیا۔ آپ کا انتظار کر رہی تھی اور سب لوگ تو کھاپی چکے۔“ شمیمہ نے بڑے فخر سے کہا۔

”بھئی تم نے بھی ناشتہ کر لیا ہوتا چھتی۔“ وہ جلدی سے اس کے ساتھ ہوئی۔

”واہ میں کیوں ناشتہ کرتی۔ آپ کے بغیر یہاں تو کسی کو کسی کا خیال نہیں سب کے سب

تو غرض میں۔“ چھتی نے بڑا سٹھ بنا لیا۔

سیڑھیوں کے کمرے کے دونوں نچلی منزل میں آگئیں برآمدے میں پڑت رہے ٹارٹ کے پردوں

کے سوراخوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ اماں اور بڑی چچی تخت پر بیٹھی بچا چا پاندان سے پان

بنا بنا کر کھا رہی تھیں۔ تخت پر کھتی ہوئی میلی جا در پر کتھے چونے کے پچا پوں دھتے لگے ہوئے

تھے اور کیمین بوا چولھے کے پاس پیڑھی پر بیٹھی دھواں دھار قسم کی باتوں میں مصروف تھیں۔

”اٹھ گئیں عالیہ!“ میں نے تم کو اس لئے جلدی نہیں کیا یا کہ جانے نئی جگہ پر چچی سینہ

آئی ہو کہ نہیں۔“ بڑی چچی نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

”میں تو خوب سوئی تھی بڑی چچی۔“ اس نے اپنی اماں کی طرف دیکھا۔ ان کے سپرد

پر شب بیداری اور فکروں کی دھول اُڑ رہی تھی۔

”اگر مارا پراٹھا تو رکھے رکھے سوکھ گیا۔ اب کیا سواد رہ گیا ہوگا؟“ کرمین بوانے تو اچھا کر پراٹھا گرم ہونے کے لیے ڈال دیا۔ ”گھسی میں گندھی ہوئی پو بیاں ہوں تو دس دن بھی نہ سو گھیں، بس زمانے والے کی بات ہی“ کرمین بوانے نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”سارا سامان اسی طرح بندھا پڑا ہی ناشتہ کر کے پو تو اسے کھلواؤ۔“ اماں نے آہستہ سے کہا۔
 ”لو کھلا، یہ کیا کھلوائے گی۔ جمیل اور شکیں آکر سب کمر لیں گے، عالیہ تو ادھر پر کافرہ پسند کرے گی اکیلے میں مزے سے پڑھے گی۔ پہلے وہاں جمیل رہتا تھا۔ مگر اس نے رات ہی کہہ دیا کہ وہ کمرہ عالیہ کو دے دو اور وطن تم تو یہیں نیچے میرے پاس رہو گی نا! بڑی چچی نے اماں سے پوچھا ”ہاں یہیں رہو گی۔“ اماں ایک لمحہ تک کچھ سوچنے کے بعد بولیں۔ ”شاید انھیں وہ زمانہ یاد آ گیا ہو گا جب وہ بڑی چچی کو منہ لگانا پسند کرتی تھیں۔ بے چاری بڑی چچی لٹے پٹے گھر کی رٹ کی تھیں منگنی ہو گئی تھی اس لیے دادی نے مجھ کو بیاہ لیا تھا۔ کیونکہ بڑے سچا ضد کر رہے تھے، دیے دادی کا تو پچا راؤ تھا کہ جب عدالت نہ رہی تو زندگی بھی توڑ دی جائے۔“

سوکھی جوئی گھی چھڑنا روٹی اور تھوڑے سے دودھ میں اونٹنی ہوئی جائے پتے ہوئے عالیہ کو حساس ہوا کہ گھر کی تین دادی حالت اچھی نہیں ہی۔

”کیسے مزے کا پراٹھا ہی، واہ واہ، بانگل کرمین بوانے کی کھال کی طرح خشک ہو نا بھیا؟“
 آخری بات چھتی نے اتنے دھیرے سے کہی کہ کرمین بوانے سن سکیں۔
 ”مزے کے ہیں تو چھتی۔“ عالیہ نے اپنی منہسی روکی۔

”اگر اشد نے چاہا تو عالیہ کو اور منظر کی دلہن کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اچھے دن نہیں رہے مگر جمیل پاس ہو گیا تو پھر اس گھر کے دن پلٹ جائیں گے اور پھر اپنا منظر بھی تو تھپٹ کر آجائے گا۔“ بڑی چچی کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

”انھیں اگر اپنے بال بچوں کی فکر ہوتی تو آج جیل میں کیوں ہوتے، انگوڑوں نے ان کا کیا بگاڑ
تھا بھلا؟“ اماں نے لمبی سانس بھری اور پھر سر نیچا کر کے چپکے سے آنسو پونچھ لیے۔ ذرا دیر کے لیے
سب چپ ہو گئے جیسے کچھ موم چنے لگے۔

”اللہ تو اس گھر کو بھی مصیبت سے بچانا،“ کرتین بوا آہستہ سے بڑبڑائیں۔

”کرتین بوا، دوکان جانے کی دیر ہو رہی ہے، ناشتہ بھجواد۔“ میٹھک سے ایک بڑی نحیف سی اور کچی
کرتین بوا نے سہلانا کر چمپا ٹھکانا، پھر ڈولیا سے ایک روٹی کھینچ کر کال لی۔ یہی کھلی پیالی میں چائے انڈیل
کر کر ٹیڑھی کئے کئے برآمد سے نکل گئیں۔

”خوب ہیں یہ سرار میاں بھی، بھئی حد ہے بے شرمی کی، حب تک کھانہ کونہ مل جائے مجال ہے کہ
چین لے لیں، انھیں تو سب کرتین بوا ٹھیک کرتی ہیں،“ تھمچی زور سے نہیں۔
”اچھا تو یہ اب تک نہیں ہی، یہ بڑے بھائی کا کارنامہ ہوگا؟“

”ہاں وہ ہی ہے۔ کہاں جائے یہ بے چارہ بھی، پھر دوکان بھی تو دیکھتا ہے، بڑی چھٹی نے
مجرموں کی طرح سر تھکا کر اماں کو نیچی نیچی نظروں سے دیکھا۔

”خوب،“ اماں نے بڑے معنی خیز انداز سے کہا اور چھالیر کاٹنے لگیں، یاں وہ کس قدر
الگ تھاگ اور ادنیٰ پر مٹھی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

عالیہ نے سب کچھ خاموشی سے سنا اور ہمدردی کی ایک لہر اس کے سینے کے پار ہو گئی۔ ہائے اگر
بے چارے، سرار میاں کے دوسرے بھائی آموں کی مکھیاں گھنٹی گھنٹیاں نہ چوستے تو شاید آج زندہ
ہوتے۔ سرار میاں کے ساتھ تو ہوتے سب یہ بے چارے تنہا تنہا بہت سے جائز لوگوں کے بیچ
میں کیسے زندہ ہوں گے۔

ذرا دیر اپنی دادی کے پاس جا کر بیٹھی۔ ”اماں نے اُسے حکم دیا۔ اور وہ جاری سے جانے
کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آپا کی موت اور آبا کی گرفتاری نے اُسے بڑا سوادت مزر بنا دیا تھا۔

شاید اس طرح اماں کو خوشی محسوس ہو۔

شام کے وقت تو دادی سے کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔ ایک تو مضر کی تسکان تھی دوسرے دادی پر

دے نے سگاہ کر رکھا تھا۔

معالیہ کو دیکھتے ہی دادی نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ دُبلے دُبلے مُر جھائے ہوئے ہاتھوں کی

کھال لٹکی ہوئی تھی مگر اتنی کمزوری کے باوجود ان کے چہرے سے عجب داب برس رہا تھا۔ مآلیہ نے بڑی

عقیدت سے ان کے پھیلے ہوئے ہاتھ تھام لیے اور اپنا سر ہالے سے ان کے سینے پر ٹکا دیا۔ چھٹی اپنے

اُٹے پٹے بستر کو ٹھیک کر رہی تھی، طاق میں رکھی ہوئی لائین کو کسی نے اب تک نہ کھیا یا تھا۔

”منظر تو پھر کبھی نہ آیا۔ میری آنکھیں اُسے دیکھنے کو ترس رہی ہیں۔ دادی نے ٹھنڈی ٹھنڈی سانس

بھری اور مآلیہ نے ہونٹ بچھینچ لیے۔ دادی سے تو سب نے چھپا یا تھا کہ ان کا بیٹا جیل میں ہے اور وہ

بھی اقدام قتل کے سلسلہ میں۔

”چھٹی نہیں ملتی دادی، اب ان کا کام بہت بڑھ گیا ہے۔ اسی لیے تو انہوں نے ہم سب کو یہاں

رہنے کے لیے بھیج دیا ہے۔“ وہ دادی کی نظروں سے بچنے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”شکر ہے کہ پھر سب اکٹھے ہو رہے ہیں، کیا پتہ تمہارا چھوٹا چچا بھی آجائے۔ دادی کی آنکھوں

میں ہانکی سی چمک آگئی۔

چھٹی نے لائین کی چینی اونچی کر کے پھونک مار دی۔ لمبے سے کمرے میں دو اونچی اونچی اونچا ہوا رنگ

کی مسبرازیں اور دو کرسیوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ دیوار پر مولانا محمد علی جوہر کی ایک تصویر لگی

ہوئی تھی جس کے زیر پر جانے کتنی آنندھیوں کا شہزاد جمع تھا۔

”منظریے کا کوئی خط بھی آیا؟“

”نہیں دادی، وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔“ ابا کی یاد سے اس کا دل کٹ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ مردوں کی یہی شان ہے کہ کام کریں، تمہارا چھوٹا چچا۔“ دادی نے نیچے

کے سہارے ذرا سی ادبچی ہو گئیں۔ "تم کو تپہ ہو تا کہ وہ خلافت کے زمانے میں چلا گیا پھر نہیں آیا۔ اس وقت خلافت کا بڑا زور تھا۔ مجھے ایسی باتیں پسند نہیں مگر دوسرے گھروں میں عورتیں ٹوپیاں کاڑھ کاڑھ کر چندے دیتی تھیں۔ انہوں نے گانے بنا رکھے تھے۔ کیا تھا وہ بھلا سا گانا۔ ادا دی تو ریل پر بل ڈان کر سوچنے لگیں۔" ہاں وہ یاد آیا ہے

بوڑھی اماں کا کچھ عنم نہ کونا

جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اسی طرح تمہارے بڑے چچا بے وقوفی میں پھنس گئے ہیں۔ مگر اب میری بات سنا کون ہو، خیر کبھی تو عقل آئے گی۔ اور۔۔

"ہے کتنا گندہ مکرہ ہو رہا ہے، اس پر سے دادی کے تھوک اور پشیا ب کی بو۔ مگر میں اپنی دادی کوئی اور کرے میں کتوڑی رہنے دوں گی۔ یہ تو میرا اپنا مکرہ ہے۔ بڑی چچی کہتی ہیں کہ میں اسی مکرے میں پیدا ہوئی تھی۔ چھٹی جلدی سے مکرے سے چلی گئی اور پھر بھاڑ دلیے ہوئے واپس آگئی۔ آج اسے صفائی کا بہت خیال آ رہا تھا۔ گندے مکرے کی وجہ سے شرما کر عالیہ کی طرف دیکھ رہی تھی کہ آبا کہاں ہوں گے، کس جیل میں ہوں گے، ان کا خط کب آئے گا۔

اسی ہی باتیں کرنے سے دادی کی سانس پھولنے لگی مگر جب چھٹی نہ بھاڑ دے کر دھول اڑانی شروع کی تو انھیں زور کا دورہ پڑ گیا۔ مارے کھانسی کے ان سے سانس نہ لی جاتی رہا آئیے گھبرا کر ان کا سینہ سہلا رہی تھی مگر چھٹی بڑے اطمینان سے سجاڑ دے رہی تھی۔

دادی کے چہرے سے پسینہ بہ رہا تھا۔ اور مارے کرب کے آنکھیں ابلی پڑتی تھیں۔ آئیے گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ کریمین بوا جھپٹ کر اندر آئیں اور دادی کے پاس بیٹھ گئیں ان کے دونوں ہاتھ آٹے سے بھرے ہوئے تھے۔

"مالکن۔ مالکن۔" کریمین بوا جیب سے بیتابان کے ساتھ دادی کو سہلا رہی تھیں اور ایک

باتھ اپنے سینے پر رکھے جیسے اپنے ڈوہتے ہوئے دل کو روک رہی تھیں۔
 "اے چھٹی بڑی چچی سے کہو جلدی سے ڈاکٹر کو بلائیں" عائلیہ پہلا ونوہ دے کا اتنا
 شدید جملہ دیکھ رہی تھی۔

"حد کر دی بھیا، بھلا اتنی سی بات پر ڈاکٹر آیا کرتے ہیں۔ دادی کو تو اسی طرح دورہ
 پڑتا ہے۔ سر ہانے خمیرے کی ڈوبیا رکھی ہے، ذرا سا چٹا رکھے۔ اتنے پیسے کہاں کہ ہر وقت
 ڈاکٹر کو بلا یا جائے آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئیں" چھٹی ڈوہتے میں ٹھنڈا چھپا کر دیا ہی
 روکنے لگی۔

عائلیہ نے حیران ہو کر چھٹی کو دیکھا، وہ دہلیز سے باہر کوڑا پھینک ہی تھی۔ کیا وہ بھی
 یہاں بیمار پڑے گی؟ اس نے ڈر کر سوچا۔ آبا تو ذرا سی چھینک پر ڈاکٹر کو بلواتے تھے لیکن
 یہاں تو چھٹی ڈاکٹر کے نام پر منہستی ہے۔ کھانسی کی آواز سارے گھر میں گونج رہی ہے مگر یہ
 آواز ورن کر تین بو اکو سنائی دیتی ہے سب اپنے کاموں میں لگے ہیں۔ کوئی اور پھر نہیں آتا۔
 ذرا ریر بعد دادی کی سانس ٹھیک ہو گئی اور وہ جیسے تھک کر لیٹ گئیں۔ کر تین بو ا
 ان کے چہرے سے پسینہ پونچھ رہی تھیں۔ "اب کیا حال ہے مالکن؟" کیسی بڑی تھی کر تین بو ا کی
 آنکھوں میں دادی نے ہوں کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ تو پھر کر تین بو ا کو آٹا گوندھنا یاد آ گیا۔
 "چھٹی کو بلاؤ" دادی نے آہستہ سے کہا تو وہ کمرے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر چھٹی کو آواز
 دینے لگی۔

کئی جب ٹھنڈ دھولوں کی تو آؤں گی۔ ہر وقت بلاتی رہتی ہیں۔ "معن میں کبھی ہوئی چوکی
 چھٹی مٹھی منڈ ہاتھ دھو رہی تھی۔ جانے وہ اور کیا بڑ بڑاتی رہی۔ دادی کے رعب کی ساری کہانیاں
 اس کی آنکھوں کے سامنے اڑا طردہم ہو گئیں۔

"جلدی پہلو عائلیہ۔ سامان ٹھیک کرالو" برآ سے۔۔۔ اماں کی آواز آئی تو وہ

چپکے سے دادی کے پاس سے سرکائی وہ اس وقت آنکھیں بند کیے سکون سے سو رہی تھیں۔

(۱۶)

جیل بھیا کو اس وقت اس نے بڑے غور سے دیکھا وہ اچھے خاصے تھے مگر ان کی آنکھیں
بچوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ پھر ان کی آنکھوں میں ایسی گہرائی تھی کہ غور سے دیکھتے ہوئے
بھبکا محسوس ہوتی۔ اس وقت وہ سب سامان ٹھکانے لگانے کے بعد جیسے تھک کر والان کی
مخراب کے بیچوں بیچ اڑوں بیٹھے تھے اماں بہت بیزار نظر آ رہی تھیں بس کچھ ایسی کیفیت جیسے
کسی طویل سفر سے دوچار ہو گئی ہوں۔ اور منزل بہت دور ہو۔

”یہ سفر کب ختم ہو گا؟“ عالیہ نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر اپنے بستر بند کی
طرف بڑھی جو صحن میں ایک طرف پڑا ہوا تھا؟ اس کا بکس اور بستر اوپر کی منزل کے چھوٹے
کمرے میں جانا تھا۔

”میں لے جلتی ہوں بھیا“ چھٹی کے غرارے کی بھٹی ہوئی گوٹ زمین پر لوٹ رہی تھی۔
وہ بستر بند کے تسمے گھسنے لگی۔ ”تم ہٹ جاؤ بے وقوف“ جیل بھیا بڑی تندہی سے اٹھ کر
چھٹی کے ہاتھ سے تسمے کھینچنے لگی۔

ذرا جوش میں رہے گا بھیا۔ میں بھیا کی وجہ سے آپ کو جواب دینا نہیں چاہتی۔
ورنہ۔ ”چھٹی کا چہرہ مسرخ ہو گیا۔“ ہٹ جائیے میں خود لے جاؤں گی بھیا کا بستر۔“
چھٹی نے جیل بھیا کا ہاتھ جھٹکا دیا۔ اور بستر بند گھسیٹ گھسیٹ کر زنیوں پر چڑھنے لگی
جیل بھیا چوکی پر بیٹھ کر جیسے بڑے مزے سے تماشہ دیکھنے لگی۔ بستر بند کی رگڑ سے ڈھیروں
دھول اڑ رہی تھی۔

”ارے چھٹی گر جائے گی۔ کیوں اپنی جان کے لاگو رہتی ہو۔“ بڑی چچی پان لگاتے لگاتے

"رگڑنے دو اماں، کبھی تو میں بھی اسے بے بس دیکھوں۔" جمیل بھیا کھدیا کر رہے۔
 "واہ کیا بات ہے، بے بس دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ جمیل بھیا، پھر اس سے اور
 اماں سے تو بہت خوش ہوں گے۔ عالیہ نے ذرا طنز سے جمیل بھیا کی طرف دیکھا اور
 پھر نظریں جھکا لیں۔ وہ تو پہلے ہی اسے کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ جلدی سے تھمپی کے
 پیچھے ہوئی مگر بستر بند پہلے ہی اوپر جا چکا تھا۔ تھمپی اسے دیکھ بڑے فخر سے مسکرائی۔
 "دیکھئے بھیا میں نے آئی نا اکیلے، بڑے آئے جمیل بھیا، ذرا سا سامان اٹھا کر
 تھک بیٹھے تھے۔ بستر بند اوپر چڑھاتے تو ہانپنے لگتے۔" وہ زور سے منہسی۔ "ارے یہ
 گڑبڑ بھی پھٹ گئی۔" اس نے پاجامے کی گڑبڑ کی طرح دیکھی جیسے ابھی دیکھ رہی ہو
 اب بھلا وہ کیسے کہتی کہ گڑبڑ تو اس وقت بھی پھٹی ہوئی تھی جب اسے پہننے کے لیے کبس سے
 نکالا تھا۔ یہ برسوں پرانے کپڑے اس کی اماں مرحومہ کے تھے جو اب اس کا تن ڈھانک
 رہے تھے۔

عالیہ تھمپی کے ساتھ مل کر بستر بند کھولنے لگی۔ ریشم کا جھٹ پٹا ہو چلا تھا۔ مگر ابھی
 گلی میں روشنی نہ ہوئی تھی۔

رات کو وہ حسن بستر پر لیٹی تھی اسے سمیٹ کر اپنا بستر لگا دیا اتنے میں جمیل بھیا اس
 کا کبس اٹھائے آگئے۔ "عالیہ یہ مکرہ تمہارے لیے ٹھیک رہی گا نار۔ پہلے میں اس مکرے میں رہتا
 تھا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ گلی سے بجلی کی خیرانی روشنی بھی مل جاتی ہے۔ میں نے
 یہیں جلی اسے کی تیاری کی درنہ لائین کی روشنی میں تو آنکھیں پھوٹ جاتیں یہ بڑا مکرہ
 بھی خانی رہتا تھا۔ یہاں کوئی نہ آتا تھا بس کسی کسی وقت کوئی سپکا ڈر آ جاتی تھی۔ جمیل
 بھیا نے کنکھیوں سے تھمپی کو دیکھا مگر وہ بڑی خاموشی سے کمرے کے باہر کھلی تھمت پر چلا گیا۔

کیا آبا کی شادی اسی بدتمیز سے ہو رہی تھی۔ اس نے سخت ناگواری سے سوچا۔ ارے وہ تو اس کے ساتھ چند دن بھی نہ جیتیں۔ کیا یہ وہی شخص ہے جس کا نام آپ کے ساتھ لے کر وہ خوش ہوتی تھی۔ عالیہ نے اپنا بکس کھکانے لگا دیا اور جمیل بھیاسے کوئی بات کہنے بغیر چھٹی کے پاس چلی گئی۔ جاتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا۔ جمیل بھیجا جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے تھے۔

”آپ سے ملنے کا اتنا شوق تھا بجیا کہ بس کیا بتاؤں۔“ تھمپی بولی۔ ”بڑے چچا اور بڑی چچی آپ کی بڑی تعریف کرتے تھے آپ پڑھی ہوئی ہیں نا۔ اسی لیے بڑے چچا تھمپی آپ سے جمیل بھیجا کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ میں تو جاہل ہوں نا بجیا۔“

”تم تو بغیر پڑھے اتنی پیاری ہو تھمپی۔ میں تو تم سے مل کر سب سے زیادہ خوش ہوں۔“ اس نے کہا۔

”میں خط بھی لکھ لیتی ہوں اور پڑھ بھی لیتی ہوں، بس اسکول نہیں گئی نا۔ چھٹی نے بڑے غرور بتایا۔“ تم اس سے مل کر ذرا بھی خوش نہیں ہو۔ تم یہاں کسی سے بھی مل کر خوش نہیں ہوگی، تم تو محض پڑھی لکھی لڑکیوں والا اخلاق دکھا رہی ہو۔“ جمیل بھیجا نے بڑے مزے میں کہا اور ہاتھ ہلایا کر تھپتھپ پر ٹہلنے لگے۔ کسی نے دیکھا ہی نہیں کہ وہ کب آکر بیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔

”پتہ نہیں آج جمیل بھیجا کو کیا ہو گیا ہے، آپ کو دیکھ کر ان میں کچھ شان آگئی ہے بجیا ویسے تو یہ حال تھا کہ میرے بغیر کوئی کام نہ ہوتا۔“ تھمپی نے ترچھی نظروں سے جمیل بھیجا کو دیکھا۔

”میں کہہ رہا ہوں چھٹی کہ اب تم نیچے چلی جاؤ۔“ جمیل بھیجا جانے کیوں ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

”کیوں جاؤں، اس گھر میں میرے باپ کا بھی حصہ ہے، جہاں چاہوں گی۔ بیٹیوں کی، بڑے آگے“

”اچھا تو پھر یہاں چلا جاتا ہوں۔“ جمیل بھیجا بڑی تیزی سے سیڑھیاں طے کرنے لگے۔

عالیہ کے لیے یہ ساری باتیں کتنی عجیب تھیں۔ اس نے حیران ہو کر تھمپی کو دیکھا۔

”بجیا آپ پر وا نہ کریں۔ یہاں تو ہر دم ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں، چھٹی سخت شرمندہ نظر آرہی تھی
 ”چلو میں اپنی کتاب میں ٹھیک کر لوں“ اُسے اچانک اپنی تعلیم کا خیال ستانے لگا۔ اللہ میاں
 اب وہ کیسے پڑھے گی۔ روپے کہاں سے آئیں گے۔ جگر جیسے ہی اُسے یاد آیا کہ باموں کے پاس اماں
 نے ڈھیر سے روپے جمع کر رکھے ہیں تو اس نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی۔

چھٹی کو دادی کا کام یاد آگیا۔ اور وہ جلدی سے نیچے بھاگ گئی۔ عالیہ جب اپنی کتاب میں
 میز پر رکھ رہی تھی تو اُسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جمیل بھیا اس پر نینر پوش بچھا گئے تھے۔ یہ وہ میز
 پوش تھا جو رات جمیل بھیا کی میز پر بچھا ہوا تھا۔ چلو جمیل بھیا اس کی تو عزت کرتے ہیں۔
 کتاب میں ٹھیک کر کے وہ کھڑکی سے نیچے گلی میں جھانکنے لگی۔ بچی کے کھمبے کے تلے دشمنی کا گول
 دائرہ پڑ رہا تھا اور گلی کے دوسرے سرے سے کوئی پھیری والا آرہا تھا۔ اس کے سر پر رکھے ہوئے
 تھال میں دو لوہے والے چراغ جل رہے تھے۔

نیچے آؤ عالیہ مٹی ”بڑی چچی کی بھاری سی آواز سُن کر وہ جلدی سے اٹھ پڑی۔
 اماں نے دادی کے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا: ”رات کی بارش سے سردی بڑھ گئی
 تھی اس لیے تمہاری دادی کی طبیعت زیادہ خراب ہو، سردی تو اس مرض کی دشمن ہوتی ہے۔“
 وہ بھی دادی کے کمرے میں چلی گئی۔ چھٹی اپنی مسہری پر مٹھی پرانے کپڑوں کی مرمت کر رہی تھی اور
 بڑے مزے میں کوئی پرانی غزل گنگنا رہی تھی۔

جگر کے ٹکڑے ہیں یہ ہمارے جو بن کے آنسو نکل رہے ہیں

عالیہ کو دیکھ کر وہ گانا بھول گئی اور پرانے کپڑوں کے ڈھیر کو لحاف کے اندر چھپانے لگی۔ اب

تو دادی بالکل ٹھیک ہیں بجیا؟

عالیہ دادی کی پٹی پڑک گئی۔ وہ آنکھیں بند کیے بے سُر پڑی تھیں۔ ان کا سینہ اب تک

اُجھرا جھر کر ڈوب رہا تھا۔ اُسے بچپن میں دیکھی ہوئی نو ہار کی دھونکنی یاد آگئی۔ جانے یہ زندگی

کئی گنا کب بچ جائے۔ مارے ہمدردی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بڑے طاق میں رکھی ہوئی لٹین
 کی روشنی ایک دم مدھم گھنے لگی۔ عالیہ نے دادی کے کھلے ہوئے ہاتھ کو چپکے سے لکان میں چھپا دیا۔
 کریمین بوا کر ٹیڑھی کیے ہوئے کمرے میں آئیں اور جھک کر دادی کو دیکھنے لگیں۔۔۔ مالکن۔
 انہوں نے دھیرے سے پکارا۔ اور جواب نہ پا کر دبے قدموں چلی گئیں۔ ان کے ہاتھوں میں گیلی راکھ
 بھری ہوئی تھی۔

”کیا دادی سو رہی ہیں؟“ شکیل دہلیز پر کھڑے کھڑے کمرے میں تھانکا۔
 ”سو رہی ہیں۔ پھر تم کو کیا؟“ جھمی نے اسے چڑانے کے انداز سے جواب دیا۔
 ”بکومت، بڑی آئیں“ شکیل ہنکارا۔

”مارے دادی سو رہی ہیں، چپ رہو شکیل، میرے بھیا؟“ عالیہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔
 ”مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔ عالیہ بچیا۔ کتابیں خریدنی ہیں۔“
 دادی کی طبیعت خراب ہی اس وقت؟“ عالیہ نے اسے سمجھانا چاہا۔

”اب دھری ہونا ان کے پاس روکڑ، سب کچھ تولے گیا، پاؤں دبا دبا کر چالاک“ جھمی مارے
 منہ کے بولار ہی تھی۔ ”اتنی بہت سی تھیں گینیاں، کھا گئے سب مل کر۔“
 ”تم سے تو کبھی پاؤں بھی نہ دابے گئے۔ بے چاری دہوی پڑی تڑپتی ہوتی ہیں اور یہ لٹ حسب
 فرے کرنی ہیں؟“ شکیل نے جواب دیا۔

”میرے منہ نہ لگا کر کہنے، دیکھ تو ابھی بتاتی ہوں۔“ جھمی اپنی مسہری نے کو دی دادی
 نے ایک لمحے کو آنکھیں کھولیں اور پھر گراہ کر کر دٹ بدلی۔

”عالیہ شکیل کو کھینچتی ہوئی باہر لے آئی۔ کریمین بوا صحن میں کھچی ہوئی چوکی پر لٹین رکھ رہی تھیں
 انہوں نے منہ ہی منہ میں کچھ کہا اور پھر برآمدے میں چلی گئیں۔“

”مارے شکیل اب تو تم بڑے ہو رہے ہو پھر بھی لڑتے ہو، جھمی بھی تو تم سے کتنی بڑی ہے۔“

عالمیہ نے اس کے شانے کو دبایا مگر وہ کچھ بھی نہ بولا۔ آستین سے آنسو پونچھ کر سر جھکائے کھڑا رہا۔
 "اڑنا بڑی بات، میرے بھتیجا، عالمیہ نے اسے لپٹا لیا۔"

"دادی مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں تھوڑے سچا کی طرح ہوں۔ بس
 اسی لیے چھٹی مجھ سے جلتی ہے۔ پھر دادی مجھ پر کتابوں کے لیے پیسے دیتی رہیں یہ بات
 چھٹی کو سب سے زیادہ بُری لگتی ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ میں کس سے مانگوں۔ آبا چھٹی
 بھتیجا۔ اماں سب پیسوں کے نام پر چھینے لگتے ہیں۔ شکیل نے معصوم بچوں کی طرح مکی بھری
 "میرے پاس دو روپے ہیں۔ لوگے؟" عالمیہ نے پوچھا تو شکیل مارے خوشی کے
 اور زور سے لپٹ گیا۔ "مجھ سے روپے لے کر کتابیں لے آنا۔"

"اچھا بھتیجا۔"

ٹاٹ کا پردہ سر کا کردہ دالان میں چلی گئی۔ اماں اور بڑی چچی تخت پر بیٹھی تھیں
 اماں بالکل چپ تھیں مگر بڑی چچی بڑی خزرہ پیشانی سے باتیں کرتے ہوئے سچا لہ کاٹ
 رہی تھیں شکیل کو دیکھتے ہی اس کی طرف پلٹیں۔ "پڑھتا بھی ہے یا گھومتا پھرتا ہے۔
 امتحان میں نیل نہ ہو تو جب کی بات؟"

"کہاں گھومتا ہوں، پڑھتا ہوں اپنے دوستوں کے ساتھ، میرے پاس تو
 پوری کتابیں بھی نہیں۔ خواہ مخواہ لڑکتی رہتی ہیں۔" شکیل نے بھی سختی سے جواب دیا
 عالمیہ نے دیکھا کہ اماں حیرت اور نفرت سے شکیل کو گھور رہی ہیں۔
 "بجیا جب میں مارل کر لوں گا تو اسی سامنے والے اسکول میں پڑھوں گا۔ کتنا بڑا
 اسکول ہو۔" شکیل کر تین بوا کے پاس جو لہے کے سامنے بیٹھ گیا۔

"بنت آنے والا ہے؟" کر تین بوا لالٹین جلا کر بیٹھا ہیں رکھنے کو چلی گئیں۔ پھر
 واپس آکر اٹا گوندھنے بیٹھ گئیں۔ "اللہ سلامت رکھے بڑے میاں کو، وہ ہوں

نہ ہوں۔ مگرے میں رشتہ تو رہی۔“

”بڑے چچا کب آئیں گے۔“ عالیہ نے پوچھا۔

”جب ان کا جلسہ ختم ہوگا۔“ بڑی چچی بے بسی سے ہنسیں۔ ”جھیل بھی آجاتا

تو گرم روٹی کھا لیتا۔“

اللہ کرے منظر میاں کاجیل سے خیریت کا خط آجائے۔ مولا تو ہی اپنی امان میں

رکھنے والا ہے۔“ کریم بوانے آٹا گوندھ کر تو اچھوٹے پر رکھ دیا۔

عالیہ کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اسے آبا سے کتنی محبت تھی۔ حالانکہ اس نے اپنے

گھر میں کبھی تنہی کھیلتی زندگی نہ دیکھی تھی۔ وہ آبا کو اماں کی تلخ زندگی کا ذمہ دار سمجھتی تھی

اُسے میاست سے نفرت ہو گئی تھی۔ آبا کے مقاصد اس کی نظر میں کتنے بھونڈے تھے پھر بھی

وہ انہیں بے تحاشہ چاہتی تھی۔ آبا کی حفاظت میں کتنا سکون محسوس کرتی تھی۔ مگر اب وہ

اس محبت کی حفاظت سے محروم ہو گئی تھی۔

”سجیاب آپ کا بچ میں نہیں پڑھیں گی؟“ شکیلہ دو روپوں کے تصور سے کتنا

نوٹ نظر آ رہا تھا، گھر کے سامنے گلی کے اس پار بڑے سے میدان میں بنی ہوئی اسکول کی

لال عمارت اس کی تمناؤں کا مرکز تھی اپنے گھٹیا سے مڈل اسکول سے بھاگ جانے کی کتنی

نوازش تھی۔

عالیہ چپ رہی۔ اماں نے اُسے بڑی دکھی نظروں سے دیکھا مگر اپنی نظر میں جن میں عزم بھی تھا

آبا کی یاد نے اُسے اتنا بے گل کر دیا تھا کہ وہ کریم بوا اور بڑی چچی کے ہزار کے باوجود اچھی

طرح کھانا بھی نہ کھا سکی اور جلدی سے اٹھ گئی۔ کریم بوا بڑ بڑاتی رہ گئیں۔ ”گھر والوں

کی یہ تو یہ چڑیوں جیسی خوراکیں رہ گئی ہیں۔ اور ہزار مسٹر اتنا کھارے کہ پچا پچا کر ہاتھ

ٹوٹ جائیں اور۔۔۔“

(۱۶)

تھوڑے دنوں میں عالی کو گھر کے سارے حالات معلوم ہو گئے۔ بڑے چچا نے جاگیز بھینچے کے بعد کپڑے کی دو بڑی بڑی دکانیں کھول لی تھیں جن کی بگوانی کسی زمانے میں وہ خود کرتے تھے، انہوں نے یہ خوبصورت سا گھر بڑے چاؤ سے بنوایا تھا۔ گھر میں مثالی خوش حالی تھی مگر جب وہ بڑی اسگری سے سیاست میں حصہ لینے لگے تو دکانیں اسرار میاں کی بگوانی پر شتم شتم چلنے لگیں وہ بھی ان کی آمدنی چاہنے والے اور سیاسی اندازوں پر خرچ ہو جاتی۔ بڑے چچا کسی بار حیل جا چکے تھے۔ انہیں قید تنہائی اور بیڑیاں پہننے کی سزا بھی مل چکی تھی۔ ان کے پیروں میں سیاہ گھٹے پڑے ہوئے تھے۔ پاؤں دھوتے ہوئے وہ ان سیاہ گھٹوں کو بڑے فخر و پیار سے دیکھا کرتے تھے وہ اس قدر کٹر کانگریسی تھے کہ خالص مسلمانوں کی کسی بھی جماعت اور برداشت نہ کر سکتے تھے، انہیں تو ان کے مسلمان ہونے پر بھی شبہ رہتا۔ کانگریس کے سوا ہر جماعت کے لوگ ان کی نظر میں ملک سے غدار تھے۔

بڑے چچا اپنی دنیا میں اس قدر مگن رہتے کہ اپنے گھر کی دنیا کو بھول چکے تھے۔ اپنی پاؤں کی اکلوتی مٹی کو ایک معمولی سے لڑکے سے بیاہ دیا تھا وہ بھی صرف اس لیے کہ لڑکا کانگریسی تھا اس وقت تک اب تک ان کی مٹی چار عدد بچوں کی ساتھ اپنے آنگن میں گر بھتا پھتا پھتا کر زندگی گزار رہی تھی۔ بڑے چچا کو بھلا اتنی فرصت کہاں تھی کہ اپنی مٹی کے مستقبل کی فکر کرتے یا کوئی کھاتا پیتا گھرانہ تلاش کرتے۔ بڑی سچی نے جب مٹی کی جوانی کی بہت دباہی دی تو انہیں اپنے سیاسی کارکن سے زیادہ بہتر آدمی نظر نہ آیا مگر چند ہی دنوں بعد بڑے چچا کو اس بہتر آدمی سے بھی نفرت ہو گئی کیونکہ وہ سیاست سے الگ ہو کر اپنے چند سگھیے زمین اور بیوی بچوں میں کھو گیا تھا۔ بڑے چچا پھر کبھی اپنی مٹی کے گھر نہ گئے۔

تجیل بھیا کو انھوں نے ایک مُفت کے پرائمری سکول میں داخل کر دیا تھا۔ تجیل بھیا نے بی اے
تک کس طرح پڑھا۔ اس کی انھیں کوئی خبر نہ تھی۔ لیکن جب پڑھنے کے لائق ہوا تو تجیل بھیا نے اس کو
مار مار کر اسی پرائمری سکول میں پڑھنے کو بھادیا۔ جہاں خود پڑھا تھا۔

تجیل بھیا کی اپنے باپ سے نہ بنتی تھی، وہ خالص شقیہ تک بندی کرتے تھے۔ مشاعروں
میں جاتے تھے اور رسالوں میں بھیجی ہوئی غزلیں دس دس پاؤں ڈیڑھوں کو بڑا بھلا کہتے تھے۔
بڑے چچا جب تک گھر میں رہتے بڑی چچی اور کرمن بوا مہانوں کے کھانے کا انتظام میں سارا
دن گزار دیتیں۔ بڑے سے پیلے میں بڑا گوشت سرسوں کے تیل میں پکایا جاتا۔ ہندوؤں کے لیے
دکان سے پوری ترکاری خریدی جاتی۔ کرمن بوا ڈھیروں روٹیاں پکاتے ہوئے بڑ بڑاتی رہتیں
خالص گھی کی خوشبو یاد کر کے ان کی آنکھوں میں آنسو رہتے، پھر بھی یہ گھر چل رہا تھا، سب کو پیٹ
بھر دنی ضرور مل جاتی۔

بڑے چچا سے جب گھر کی ضرورتوں کا ذکر کیا جاتا تو وہ سُرخ پڑ جاتے جانے کیوں تجیل بھیا
کر سب کی طرف دیکھتے، اپنے بڑھے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور پھر ڈی انگ سے سب کو سمجھانا
چاہتے۔ "جب ملک آزاد ہو جائے گا تو سب کی تکلیفیں دور ہو جائیں گی، تم لوگ نڈا گہرائی میں جا کر چو
کہاں تک جاؤ گہرائی میں۔" بڑی چچی گھسی گھسی بھلا اٹھتیں۔

"بڑے چچا کا مطلب یہ کہ کنویں میں گر جاؤ۔" چچی اسی بات میں سن کر ضرور مذاق اڑاتی اور
وہ اس کی باتیں اس طرح نظر انداز کرتے جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔ جانے بڑے چچا میں اتنا صبر
کہاں سے آگیا تھا۔ وہ گھر میں ہوتے تو کوئی نہ کوئی تیر دشت بنا رہتا۔ مگر وہ ہنس ہنس کر سستے
یا پھر بیٹھک کی راہ لیتے۔

بڑی چچی اس گھر میں اسے عبرت کی لاش معلوم ہوتیں ان کی آنکھوں میں جیسے صدقوں کا دکھ
سمایا ہوا تھا اتنی بہت سی جانوں کی فکر صرف ان کے کاندھوں پر سوار رہتی۔ ہسرار میاں کا دل

سے کچھ کاٹ پیٹ کر بڑی چچی کی نکالوں کو کبھی کبھی کم کر دیا کرتے، مگر خود دیر تک مہیک میں پڑے،
سانوں کی طرح چند روٹیوں کے لیے آوازیں نکالتے رہتے۔

ان سب باتوں کے باوجود عالیہ کو بڑے چچا بہت اچھے لگتے تھے بس بالکل اسی طرح جیسے اسے
اپنے آبا سے شکایتوں کے بعد بھی آفاقی سی محبت تھی۔ اسکی نگہ میں نہ آتا تھا کہ یہ گھروں کے دکھوں
اور تباہیوں کے علمبردار اس کے دل میں محبت کی اٹھل کیوں مچاتے رہتے ہیں، یہ کیسا خلوص تھا۔
کیسی محبت تھی کہ وہ ذرا اسی بات پر ان کے لیے بڑا پٹھتی۔ بڑے چچا جب گھر میں آتے تو وہ سب
کام چھوڑ کر ان کے ہاتھ منہ دھونے کے لیے چوکی پر پانی رکھ دیتی۔ جب وہ ہاتھ منہ دھو کے
تھکے تھکے سے اپنے بستر پر لیٹ جاتے تو وہ ان کے سر پر ہاتھ بیٹھ کر ہولے ہولے ان کا سر
سملانے لگتی۔ بڑے چچا اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اسے دعا پڑھتے اور پھر سکون سے
آنکھیں بند کر لیتے اور تھمتی ڈوٹے کے پلو کو منہ میں اڑس کر اپنی منسی روکنے لگتی۔ "ہائے
بڑے چچا بے چارے تھک کر سو رہے ہیں، کام الیا ہی ٹھہرانا۔"

عالیہ کو اس گھر کی زندگی اپنے گھر سے زیادہ تھکراوا اور تھکی ہوئی معلوم ہوئی مگر وہ کسی
طرح خود کو بہلا رہی تھی۔ بڑے چچا نے اس کو اپنی کتابوں کی الماریوں کی چابیاں دے دی تھیں
کہ وہ انہیں پڑھے اور دل و دماغ روشن کرے ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کر دی تھی کہ یہ چابی
تھیل بھیا کے ہاتھ نہ لگنے پائے۔ اس بے کار تک بندی کے لیے یہ کتابیں کوئی حیثیت نہیں کھنتیں
دوہیر کے سناٹوں میں وہ بڑی احتیاط سے ایک ایک کتاب نکال کر لاتی اور پڑھتی۔ اس کا دل
ان کتابوں کے ہر اس کردار سے ہمدردی رکھتا تھا سمجھوں نے آزادی اور انسان کی فلاح و بہبود
کے لیے گولیاں کھامیں مگر وہ ان سے خوف بھی محسوس کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایسے لوگ
کسی سے محبت نہیں کرتے، یہ لوگ شادیاں کرتے ہیں، بچے ہوتے ہیں اور انہیں تباہ کر دیتے
ہیں، ان کا اپنا گھر دنیا کے کسی حصے میں مشاغل نہیں ہوتا۔ ان کے گھر والے انسان نہیں ہوتے

یہ محبت کے قدموں کے کانٹوں ہوتے ہیں جو ذرا دیر میں لہو لہا کر دیتے ہیں۔ اماں، بڑی چچی، کسم دیدی اور تہینہ آیا کا انجام اس کے سامنے تھا۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ کتنی سمجھ دار ہو گئی تھی۔ مفکروں اور عملوں نے اس کا بچپن کتنے جلدی تھین لیا تھا۔

(۱۸)

ماموں کا خط آیا تھا۔ انہوں نے اماں کو لکھا تھا کہ ان کی بھابی کے مشورے کے مطابق وہ سارا روپیہ اکٹھے نہیں بھیجیں گے بلکہ تیس روپیہ مہینہ عالیہ کی تعلیم کے لیے بھیجتے رہیں گے جس سے کپڑا وغیرہ بھی بن جائے گا۔ بڑے وقت میں زیادہ روپیہ پاس نہیں رکھنا چاہیے ہر ایک کی نظر پڑتی ہے۔

اماں یہ خط پا کر بہت خوش تھیں اور تین مہینے بعد منی آرڈر وصول کرتے ہوئے ان کے ہاتھ خوشی سے کانپ رہے تھے مگر عالیہ کو غصہ آ رہا تھا کہ ایک تو تین مہینے کے بجا پوچھا ہے۔ اس پر سے صرف تیس روپیہ مہینہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ان خراب حالات میں بھی بڑے چچا پر بوجھ بنی رہی۔ اماں سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ ماموں کے خلاف کچھ کہہ کر وہ اماں کا دل نہ دکھانا چاہتی تھی۔ وہ بڑی خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ماموں کے خط سے ان کی جان جل گئی جس کے خط کا بے چینی سے انتظار تھا وہ نہ آیا۔ ان تین مہینوں میں ابانے صرف ایک خط لکھا تھا جس میں چچا کے پاس آجانے پر اظہارِ خوشی کیا اور عالیہ کو تعلیم جاری رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ اپنے لیے ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا۔

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اماں اوپر آگئیں۔ سیرٹھیاں چڑھنے کی وجہ سے وہ کانپ رہی تھیں۔ مگر ان کا چہرہ خوشی سے سُرخ ہو رہا تھا۔ "بھابی کتنی ہوشیار ہیں انہیں تو معلوم ہی ہو گیا تھا کہ یہاں سب نیلگے بھوکے ہیں۔ لوٹ کھائیں گے" اماں

سرگزشتیوں میں باہیں کر رہی تھیں۔ "جھیل" سے کہہ کر ایک ماسٹر کا انتظام کر لو اور گھر بیٹھے امتحان دے
 مگر اماں ان روپوں سے کیا ہوگا۔ ہمیں اپنے سارے اخراجات برداشت کرنے چاہئیں
 کچھ دن کی بات ہو کھیرا آبا آجائیں گے۔ بڑے چچا نے بہت اچھا دیکھ لیا ہے۔ آبا کو کم سے کم
 سزا ہوگی۔

وہ کیا پتہ وہ فسر مرا تو نہیں مگر الزام تو قتل کا ہی، جانے وہ کب آئیں۔ ہائے اگر ان میں ذرا
 بھی شرافت ہوتی تو اپنے گھر کا خیال کرتے "اماں کو شاید بتیے ہوئے تلخ دن یاد آ رہے تھے۔ وہ
 سب نے کیا سوچ رہی تھیں۔

"دھن، اے دھن! نیچے صحن میں کھڑی ہوئی بڑی چچی اماں کو آواز دے رہی تھیں۔
 ساتھ ہی شکریاں اور جھٹی کی تو تو میں میں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

وہ آتی ہوں! اللہ کی مصیبت میں پھنس گئے۔ "اماں بڑبڑائیں۔" ہم اس سے زیادہ
 روپے نہیں مانگا ہیں۔ گے۔ تمہارے بڑے چچا کا فرض ہے کہ وہ ہماری ہر ضرورت کو پورا کریں،
 آخر تو ان کے بھائی کا قصور ہے۔ ہم خود سے تو ان کے گھر آ کر نہیں بیٹھ گئے۔ "اماں جواب سُننے
 بغیر نیچے چلی گئیں۔

تیسرا پہر تھا۔ دھوپ لوٹ چکی تھی۔ وہ بڑی دیر تک اپنے بستر پر اذنا دھمی پڑی رہی۔ گلی
 میں کھلونے والا جھن جھن بجاتا اور سُری آواز میں صدا لگاتا جا رہا تھا۔ یہ رپڑ والا بچہ
 یہ مستانہ بچہ، چھٹی لڑانے بھرنے کے بعد اب کسی بھی سوئیوں سے گرا، مونوں رینارڈ
 بجا رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس طرح تو سارے رپکارڈ خراب ہو جائیں گے وہ شکریاں سے
 کہہ کر چھٹی کے لیے سوئیوں کی ایک ڈبیر ضرور منگا دے گی۔

دھوپ سپلی پڑ چکی تھی۔ کرین بوا چائے، پنیے کا شور مچا رہی تھیں مگر اس کا جی نہ
 چاہا کہ نیچے وہ کھلی چھت پر آ کر اس کھرے ہنگ پر لیٹ گئی جو سارا دن دھوپ میں پڑا تھا

رہا تھا اس پاس کی چھتوں پر کچوں کا شور مچا رہتا تھا اور کانوں سے اٹھتے ہوئے دھوپوں کی
 دھبے سے نضا سُر مئی ہو رہی تھی۔

پلنگ اب تک ہلکا سا گرم تھا وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی یکایک بچا بچا سا جی ہو رہا تھا۔ اس وقت
 تو یہی دل چاہ رہا تھا کہ گھر سے نکل کر کہیں ہو آئے مگر کہاں، وہ توجیب سے آئی تھی اس گھر سے باہر
 قدم نہ نکالا تھا۔ چھٹی کا جب جی چاہتا برقع اوڑھ کر گھروں گھروں پھراتی وہ بھی صرف مسلمان گھروں
 میں، ہنڈیوں سے اُسے لٹھی لٹھی تھا اس گھر میں تو اس کی دنیا صرف کتابیں رہ گئی تھیں۔ بڑے
 چچا کی کتابوں کی الماری کی چابی اس نے سنبھال کر اپنے بستر میں چھپا دی تھی۔

کریمین بڑا چائے پینے کے لیے بجا رہی تھیں، وہ مجبوراً نیچے جا رہی تھی کہ چھٹی اس کی
 چائے کی پیالی لیے آگئی۔ اس وقت چھٹی کا گول گول چہرہ بے وقوفی کی حد تک سنجیدہ ہو رہا تھا اور
 آنکھیں ہلکی سی سُرخ پڑی ہوئی تھیں۔

”کیا بات ہے چھٹی؟ پیالی لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، آبا میاں کا خط آیا ہے۔“

”پھر سب خبریت ہونا؟“ وہ چھٹی کی سنجیدگی سے ڈر رہی تھی۔

”نہیں بچیا، انھوں نے لکھا ہے کہ اب تم کو صرف دس روپیہ مہینہ ملا کرے گا۔ کیونکہ تمہارا

ایک بھائی اور پیدا ہو گیا ہے اس کا توج بھی بڑھا ہے۔“ انھیں نے پورے پانچ روپیہ کم کر دیے ہیں۔“

”ارے یہ بات ہے، بھائی مبارک ہو چھٹی۔“

”میرا بھائی کیوں ہونے لگا، اللہ کرے مر جائے وہ۔“ میری اماں کے ساتھ میرے سارے

بن بھائی مر گئے ہیں۔ اکیلی ہوں، میرا کوئی نہیں“ اس نے ہونٹ لٹکائے۔

اسی باتیں نہ کر دھھٹی۔“

”پھر آپ ہی بتائیے نا۔ کہ ہمارے آبا بھتی شادیاں کریں اور ان سے جتنے پتے ہوں وہ

سب میرے بھائی بہن ہوں گے؟ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اس وقت وہ کتنی معصوم
نظر آ رہی تھی اس کی چہرے کی ساخت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ لڑتے بھڑتے اور غصے سے پاگل ہونے
وقت بھی معصوم ہی رہتی۔

عالیہ نے چھٹی کو لپٹا لیا، اس وقت منجیلے چچا اُسے دنیا کے عظیم بے درد نظر آ رہے تھے انہوں
نے دنیا میں بویاں بدلنے کے سوا کوئی کام نہ کیا۔ چھٹی کی ماں کے انتقال کے بعد انہوں نے دنیا میں
دو شادیاں کیں اور دونوں کو ذرا ذرا سی بات پر طلاق دے دی۔ ان کا طلاق دینے کا بھی عجیبے لقیہ
تھا میٹیک میں جا کر طلاق لکھتے اور بویا کو اندر کھجوا دیتے۔ بس اسی وقت سے بویا سے پردہ کرنے لگتے
مگر جو چھٹی بویا نے ان پر مصیبتوں کا پہاڑ توڑ دیا تھا۔ تاہم توڑ پھینچے پیدا کر کے انہیں ایسا جا بڑا کہ
دنیا کا نہ رکھا سادہ چھٹی سب کے لیے آزر بنی ہوئی تھی۔ باپ نے محبت سے ہاتھ کھینچ کر اُسے دکھوں
کا پوٹ بنا دیا تھا۔

میں تو بالکل اکیلی ہوں بچیا، آپ کو تو سب چاہتے ہیں، تمہیں لقیہ بھی آپ کو بہت چاہتے ہیں
باہر سے آکر آپ ہی کے ارد گرد بھرتے ہیں۔ وہ طنز سے منہی۔

عالیہ نے کانپ کر چھٹی کو دیکھا، اس کے سامنے مہندی کا لہلہا ہوا پورا سوکھ کر سیاہ پڑ گیا تھا
اور چہرہ کم دیر ہی کی سفید ماری سے بوندیں پانی کی ٹپک کر زمین میں جذب ہو گئیں۔
لا حول و لا، وہ اتنی بد تھو نہیں رہی۔ اس کے ساتھ یہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ بے وقوف آدمی!
جسے بڑے چچا اپنی کتابوں کی الماری کی چابی تک نہیں دیتے۔

چھٹی تم تو بالکل سچے ہو بس، تم مجھے سمجھتی کیا ہو، ایسے ایسے دس تھیلی بھیا آجائیں تو میرا کیا
بچا کر لیں گے؟

چھٹی نے عالیہ کی آنکھوں میں غور سے نبھانکا، جیسے وہ سچ کی تلاش میں ہو۔ پھر کھمبٹن سی
ہو کر عالیہ کے لپٹ گئی۔ میں خود ہی سمجھتی ہوں کہ ہماری بچیا ایسی تھوڑی ہو سکتی ہیں۔ وہ بڑے طنز

سے ہنسی۔ "پر بچیا آپ تو یہ بتائیں کہ اب اتنے روپوں میں گزارہ کیسے ہو گا؟"
 "بے ترکیبی میں روپیہ بھی بھیننے والا نہیں تھپی۔ اسے آبا یاد آگئے۔"

"دانا! میرے دن روپیہ جو ہوں گے وہ آپ کے نہیں ہوں گے بچیا؟ تھپی نے، دکھ کر پالی ٹھائی
 بس یہ ٹھیک ہے۔ میں تم کو اس میں سے ایک پیسہ دوں گی۔ عالیہ نے اسے خوش کرنے کو کہا۔
 "ارے بچیا ہاں وہ کل ہمارے کمرے میں جلسہ ہو گا؟ تھپی جیسے سب کچھ بھول کر چونکی۔
 "کیا جلسہ؟ عالیہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔
 "ارے مسلم لیگ کا جلسہ، بچیا۔"

"پر بڑے چچا جو ناراض ہوں گے، تم دل سے رہو نا مسلم لیگی؟ عالیہ نے اسے کھجانا چاہا
 وہ کون ہوتے؟ یہ ناراض ہونے والے، میں کب بھینس منع کرتی ہوں کہ کافروں کے جلسوں میں
 نہ جایا کریں؟"

"مگر تمہارے مسلم لیگی ہونے سے کیا فائدہ ہو گا؟" عالیہ کو دکھ ہو رہا تھا کہ یہاں تو سب بگڑ گیا
 "کچھ نہیں ہوتا، بس میں مسلمان ہوں اس لیے مسلم لیگی ہوں۔" وہ بڑے فخر سے ہنسی۔ "بہائے
 میں گے بچیا، ٹھیک رہیں گے نا؟"

"تھپی اتنے سے روپے آئے ہیں اور تم کو پورا مہینہ گزارنا ہے، کیوں خواہ مخواہ یہ
 حرکتیں کرتی ہو؟ عالیہ نے اسے بھر سمجھا اچھا۔"

"واہ پیسے روپے کی کیا بات ہے، میں تو اپنی جان تک بچاؤ کر دوں مسلم لیگ پر۔ پھر
 ہاؤس کافر چچا کو پتہ۔ چلے۔" وہ جیسے کچھ یاد کر کے تیزی سے سیڑھیاں کھینچا گئی نیچے چلی گئی۔
 "اری تھپی کیوں اپنی جان کی لاگو ہو رہی ہے؟" نیچے سے بڑی چچی کی آواز آ رہی تھی۔

عالیہ چھپتے سے ہٹ کر بڑے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی جس سے نچلی منزل کا صحن

نظر آتا تھا۔

۸۶
 "واقعی بڑی بے کئی لڑکی ہو، ہم نے یہ نیا طریقہ دیکھا کہ عورتیں بھی جلسے جلسوں میں آ کر بیٹھیں، مردوں نے کیا کم گھرنے کا ستیاناس کر رکھا ہو، اماں صحن میں بیٹھے ہوئے پانگ پر بھی چھال لکھتے رہیں۔ ہمارا جو جی چاہتا ہے کرتے ہیں۔" تھمتی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا اور ہاتھ پر اہوار بیخ اڑھ کر چلی گئی۔

"میں کیا کروں، اگر اس کے بڑے چچا اس پر ناراض ہوتے ہیں۔ تو بھی میرا ہی جی دکھتا ہے۔" بڑی چچی بھی اماں کے پاس ٹنگ گئیں۔ دادی کے زور سے کھانسنے کی آواز آئی تو کریمین ادا چلی سے اُدھر چلی گئیں۔

(۱۸)

شام کو تھمتی کے کمرے میں جگہ جگہ سے ٹھٹھی ہوئی لمبی سی درمی کچھ لگی اور اس پر سارے محلے کے بچے آ کر بیٹھنے لگے۔ صحن کے ایک کونے میں دادی کا بستر لگا ہوا تھا۔ ان کے پانگ کے آس پاس کریمین بوائے پانی تھڑک دیا تھا۔ وہ ننھی ننھی سی پنکھیا ہاتھ میں لیے ہوئے ہوئے ہوئے ہمارے تھمتی اور بڑی عبرت ناک خاشوشی کے ساتھ تھمتی اور سچوں کا شور مچا رہی تھیں۔ ان کے چہرے سے کرب کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ عالیہ ان کے سر ہانے بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ سے پنکھیالے کر تھمتی لگی۔

"چلیے نا بجیا آپ بھی میرے جلسے میں۔" تھمتی نے عالیہ کا ہاتھ پکڑ کر کہینچا۔

"میں نہیں جاؤں گی تھمتی، مجھے یہ باتیں ذرا نہیں اچھی لگتیں۔"

"مت جائیے، آپ کے بغیر جلسہ تھڑی ختم ہو جائے گا۔" وہ روٹھ گئی۔ "مجھے

پتہ ہی نہ کہ آپ بڑے چچا کا ساتھ دیں گی۔"

"تم کو معلوم ہے تو ٹھیک ہے۔ عالیہ ایسی بے ہودہ باتوں میں نہیں جاتی، اماں

نے بھی چھٹی کو گھر کا، مگر چھٹی نے کوئی جواب نہ دیا اس کا منہ اتر گیا تھا۔ وہ جلدی سے کمرے میں چلی گئی اور بچوں سے نعرے لگانے لگی۔

ہاے اب کیا کروں دلہن، اس کے بڑے چچا بیچارے میں ہیں وہ یہ نعرے سنیں گے تو کیا ہوگا! دس بار کہا کہ جب تلبہ کر دو تو میلاوڑ پڑھا کرو گا نہیں سنتی۔ بڑی چچی چھٹی کے جلے سے بہت پریشان نظر آ رہی تھیں۔ اسے اس کے باہر کو پیشا ہی کہاں جو اس کے دو بول پڑھا کر کھانے لگا دیں۔

”جسے شوق ہو وہ خود اپنے دو بول پڑھو اسے۔ چھٹی نے کمرے کی دہلیز پر آکر جواب دیا۔ اور پھر مصروف ہو گئی۔“

”اے شکیل! اٹھ کر ٹیبل کا دروازہ بند کر دے۔ تاکہ آواز نہ جائے۔“ بڑی چچی چھٹی کی بات کا بڑا ماننے کے بجائے اس کی حفاظت کے سامان کو رہی تھیں۔

”میں کیوں بند کروں، اچھا ہی آبا ایک دن اس کی پٹیاں توڑیں۔“ شکیل اپنے بستے میں بیٹھ لگاتے ہوئے بڑے مزے میں اچکا۔

”بکو اس کو تاہر، کتنی بڑی ہر تھوڑے چھٹی۔“ بڑی چچی نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور کہہ مین بنا کشتی میں چائے کے برتن رکھتے ہوئے اٹھ پڑیں۔ بیٹھک کے دروازے بند کیے وہ پھر برتن لگانے لگیں۔ نعرے لگانے کے بعد سارے بچے چھٹی کے ساتھ گاہر تھے

کاشی میں تلسی تو بوسی بکریاں سب چر گئیں

گاندھی جی اتم کرو ہندو کی نانی مر گئیں

چھٹی کے اس خود ساختہ گیت کو سن کر عالیہ ہنس پڑی۔ مگر جیسے ہی اس نے دیکھا کہ

بڑے چچا بیٹھک کے دروازے کے پاس کھڑے ہیں تو گھبرا کر چھٹی کو پکارنے لگی۔

چھٹی نے مڑ کر دیکھا اور پھر آرام سے بچوں میں باتیں بانٹنے لگی۔

”ارے اس پاگل، جاہل کو کوئی نہیں سمجھاتا۔ میں ایک دن اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔“ بڑے چچا صحن میں لاکر کھڑے ہو گئے۔ غصے سے ان کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

بچے جبراً مار کر بھاگ پڑے۔ ایک بچے کے بتائے گئے مگر کڑکڑے ہو گئے تھے اور وہ بڑے چچا کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ دیکھ کر انہیں حین رہا تھا۔

”آپ تو بہت قابل ہیں نا، مجھے بہت پڑھایا لکھایا ہی جو جہالت کے طہنے دینے ہیں۔“

جھمی بھلا کیوں چپ رہتی۔

بڑے چچا اس کی طرف لپکے تو بڑی چچی بیچ میں آگئیں۔ ”ہر کیا دیوانے ہو گئے ہو، جوان

ہر کی پرہیزگاری اٹھاؤ گے؟ بڑی چچی ہانپنے لگیں۔

”بھئی مار لینے دیکئے، دل کی حسرت تو نکل جائے۔“ جھمی ڈٹ کر کھڑی ہو گئی۔

عالمیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے جانا چاہتی تھی۔ مگر وہ اسے بھی نہ ٹھنکے مار رہی تھی

کریمین بوا دم سجدہ کھڑی تھیں۔ کچھ کہنے کی کوشش میں دادی کی سانس چڑھ گئی تھی اور اماں

تاشائیوں کی طرح پتنگ پر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

”جھمی اندر چلو میری بہن، میرا کہنا مانو نہیں مانتیں؟“ عالمیہ نے منت کی تو جھمی

اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”میں کیا کروں، مجھے کس قدر عاجز کیا ہی سب نے عالمیہ بیٹی تم ہی ان لوگوں کو

سمجھایا کرو۔“ بڑے چچا کا غصہ زور چکر ہو چکا تھا۔ اور وہ بڑی بے جا رگی سے عالمیہ کو دیکھ

کر اپنی بے بسی کی داد چاہ رہی تھے۔ چند منٹ بعد وہ سر جھکائے بیٹھک میں چلے گئے اور

ذرا دیر کو سناٹا سمجھا گیا۔

”ہائے اپنے زمانے میں کاہنے کو یہ سب کچھ دیکھا ہو گا۔“ کریمین بوا پڑے پڑے بیٹھ کر اپنے

آپ سے کہہ رہی تھیں۔ ”یہ مالک مظفر مرحوم کا خاندان ہی۔ انہیں تو قبر میں بھی حسین

رات کا اندھیرا پڑنے لگا تو کریمین بوانے لائین جلا کر ہر طرف رکھ دیں اور
 صحن میں بچھے ہوئے کھیرے پنکوں پر بستر لگا دیئے۔ چھٹی کے کمرے سے اس کی دھیمی
 دھیمی سسکیوں کی آواز آرہی تھی ۔ - -

”چھٹی کا کیا بنے گا؟“ دادی نے عالیہ کی طرف دیکھ کر دھیرے سے پوچھا۔
 اب ان کی سانس قابو میں آچکی تھی۔ محبت نے دم اٹھو رکھا ہے۔“
 عالیہ سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ اس نے دادی کا ہاتھ تھام لیا۔ اس زندگی کے ساتھ کتنے
 بھٹیرے ہوتے ہیں۔ چھٹی دادی کو کچھ بھی نہ سمجھتی تھی مگر وہ بستر پر پڑے پڑے اس کا
 سہارا بنی ہوئی تھیں۔

”کیا ہوا ہے عالیہ بیگم؟“ جمیل بھیا نے گھر میں داخل ہوتے ہی سوال کیا اور پھر لمبے
 کی زنگ آلود کرسی پر بیٹھ گئے۔ ”اس وقت بڑا سناٹا چھایا ہے۔“
 جمیل بھیا جب اسے عالیہ بیگم کہتے تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ زہرا گل رہی ہیں
 وہ چپ رہی۔

”مسلم لیگ کا جلسہ ہوا تھا یہاں بڑے بھیا نے ڈانٹا تھا بس اتنی سی بات۔“ اماں نے
 بڑے فرادی انداز میں کہا۔

”خوب! خوب!“ وہ زور سے ہنسنے لگا۔ ”پھر ہمارے آبا کی رگ حیت بھڑک اٹھی ہوگی
 واہ کیا عظیم آدمی ہیں ہمارے آبا بھی، یہ گھران کی عظمت کا مثالی نمونہ ہے۔ برسوں سے کانگریس
 کی غلامی کر رہی ہے اور مجھے ایک نوکری نہ دلا سکے۔ حالانکہ اب کانگریس کی وزارت بھی بن گئی
 ہے۔“ جمیل بھیا پھر ہنسنے لگا۔

”ہاں اب تم آگ لگاؤ، ذرا پاس لحاظ نہیں باپ کا۔ بڑی چچی بھیر گئی۔“

”کانگریس کی حمایت کرتے ہیں تو کسی لالچ سے تھوڑی کر۔ تمہیں“
 ”اماں آپ کیا جانیں، ارے مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ اگر آبا کے مکانوں سے کچھ بچا
 ہو تو مجھے بھی کھلا دیجئے۔ جمیل بھیا لڑنے پر تیل کیے۔“

”بس ہر دم بکواس کرتا ہے کہیں اور سے کھا کھا کر آتا بڑا ہو گیا ہے۔ یہاں تو بھوک کا مڑتا
 ہونا۔ بڑی جچی جینج پڑیں۔“

”بھئی اماں تو خواہ مخواہ ناراض ہوتی ہیں۔ جمیل بھیا ہنس پڑے۔“ اچھا تم ہی بتاؤ
 عالیہ بیگم کہ ہمارے آبا یہاں جس دنیا کو بنانے کی فکر میں ہیں، کیا ہم اس کے باشندے
 نہیں ہیں۔ آخر ہمیں کیوں تباہ کیا جائے؟ اور نظر چچا جو ایک انگریز کا سر کھپا کر چلے
 گئے تو انھوں نے کون سا کا زنامہ انجام دیا۔؟ کیا انھوں نے تم سب کو تباہ نہیں کیا؟
 اب تم کو اس گھر میں کتنی تکلیف ہوگی، تم لوگوں نے کتنے ٹھارٹ کی زندگی گزاری تھی، ابھی تو
 میں بھی کسی لائق نہیں درنہ۔“ وہ ایک لمحہ کورک کر عالیہ کو دیکھنے لگے۔

”آپ ایسی باتیں نہ کیجئے جمیل بھیا۔ دادی کہیں سوتے میں بھی نہ سن لیں۔“ وہ جلدی
 سے جمیل بھیا کے پاس آکر آہستہ سے بولی۔

”جانے بھابی کس طرح یہ سب کچھ برداشت کرتی ہیں۔ میں تو ان سے لڑ لڑ کر تھک گئی تھی
 بھلا کیا ماما انھیں انگریز دشمنی میں۔؟“ اماں نے ٹھنڈی آہ بھر کر بان کی گھوری منہ میں رکھ لی۔
 ”کیا تم میرے ساتھ کھانا نہ کھاؤ گی، عالیہ بیگم؟“ جمیل بھیا نے کرین بوائے ہاتھ سے
 کشتی لیتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں بھئی، ابھی مجھے بھوک نہیں لگی۔“

وہ اٹھ کر تھپی کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اب تک اپنے بستر پر اوندھی پڑی سسکت ہی تھی
 ”جلو باہر چلیں تھپی، اندر تو بڑی گرمی ہے۔“ عالیہ نے اسے زبردستی اٹھایا۔ تھپی پر

جیل کر لیں گے ؟

تھمتی کمرے سے تو نکل آئی مگر جھیل بھیا کو دیکھ کر وہیں بیٹھ گئی۔ آپ جابے تھمتی نے
 نیچے کے کھٹے ہوئے ماحول سے اوس کی کٹلی نفضا میں سے اکر اسے بڑا سکین محسوس ہوا۔ اگر میوں
 کا غبار میں ڈوبی ہوئی چاندنی میں بھی بڑی ٹھنکی خنکی تھمتی گلی میں بچے بڑے ہوش و خروش سے ریل ریل
 کھیل رہے تھے۔ زیادہ ہوش ہوتے تو مسلم لیگ زندہ باد، اور کانگریس زندہ باد کے دو چار
 نعرے بھی لگا دیتے۔ جب وہ سٹی بجاتے اور جھک جھک کرتے اور چلے جاتے تو ایک دم سناٹا چھا جاتا۔
 عجت کی منڈیر کے پاس کھڑے ہو کر اس نے دیکھا کہ ہائی اسکول کی عمارت درختوں کے گھنے
 سائے کی وجہ سے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

وہ دیر تک اس عمارت کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ ایک دن سکیٹل اسی اسکول میں
 پڑھے گا اُسے اپنے خواب کی تعبیر ضرور ملے گی مگر اس کے سارے خواب اڑا دھم ہو گئے۔
 اب وہ کسی کالج میں نہ پڑھ سکے گی۔ پھر بھی اُسے پڑھنا ہی ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہی۔ آبا
 کب آئیں گے یہ کوئی نہیں جانتا، بڑے چچا اسے کتنے مایوس نظر آتے۔ جب وہ آبا کے مقدرے
 کے سلسلے میں بات کرتی ہے تو وہ ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیتے۔

سوچتے سوچتے جب عالیہ نے آسمان کی طرف دیکھا تو چاند اسے بڑا مٹیالا معلوم ہوا۔

”عالیہ“

اُس نے چونک کر دیکھا تو جھیل بھیا اس کے پیچھے کھڑے تھے۔ ”یہاں اکیلے کیا کر رہی ہو؟“
 ”کچھ نہیں بھتیجا، تنہائی میں بھیا کے وجود سے وہ گھبرا گئی۔ بھیا ادھر ادھر دیکھ رہے تھے
 ”یہاں گھبراتی ہوگی عالیہ، اگر تہنیز زندہ ہوتی تو شاید تم خوش رہتیں اور شاید ہماری
 شادی بھی ہو چکی ہوتی۔ یقین جانو کہ یہ شادی میری انتہائی مخالفت کے باوجود ہو رہی تھی۔
 پھر بھی جب وہ مری ہو تو ایک بار مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں زندہ ہو گیا ہوں۔“ جھیل بھیا نے

جیسے دکھ سے آنکھیں بند کر لیں۔

”مگر آپ ان باتوں کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟“

دیے ہی اٹھے اس سے ہمدردی تھی نا۔ مجھے سب کچھ معلوم تھا نا، اور مجھے تو یہ بھی

یقین ہو کہ وہ اپنی موت نہیں مری۔ ”تمہیں بھیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

اب تو آپ کے گھر میں ہوں، جو چاہے کیئے۔ ہم نے منہ پھیر لیا۔ مگر تمہیں بھیا پھر اس

کے سامنے آگئے۔ ”سُنو تو عالیہ، میں اتنا بُرا تو نہیں ہوں، بات یہ ہے کہ صدف کا میرے پاس

خط آیا تھا۔ اس نے تمہاری تھی کہ تمہیں سے شادی نہ کر دو۔ مجھے اس سے محبت ہے۔ پھر بھی میں اس

شادی کو رد کرنا سکا، آج تک اپنے کو مجرم سمجھتا ہوں۔ اگر میرا بس چلنا تو صدف اور تمہیں کی شادی

کر کے دم لیتا۔ مگر۔۔۔ وہ ایک لمحے کو چُپ ہو گئے۔ تم تو مجھے مجرم نہیں سمجھتیں۔“

اسے یہ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ اس نے حیران ہو کر تمہیں بھیا کی طرف دیکھا اور پھر

نظریں تھکا لیں۔ ”آپ کا راز ہشاد بچہ کو اسے تمہیں بھیا کی صورت سے نفرت ہونے لگی، ساری

باقی تیر کی طرح اس کے کلبجے میں تھپ کر رہ گئی تھیں۔

”اگر میں چاہوں تو ابھی اپنے مانوں کے گھر جا سکتی ہوں۔“ مانوں کی حقیقت جانتے

ہوئے بھی وہ اور کس کا نام لے کر ڈھمکاتی۔

”تم جا ہی نہیں سکتیں، مجھے تم سے محبت ہے، پھر میں کیا کروں گا؟“ تمہیں بھیا کا بیجا

ہوا ٹھنڈا ہا تھو اس کے ہاتھ کو دبوچنے لگا۔ اور اُسے محسوس ہوا کہ وہ تھپت میں دھنس رہی ہے،

مارے کمر بوری کے وہ اپنے کو بچا بھی نہیں سکتی۔ اس نے بڑی بے بسی سے تمہیں بھیا کے ٹھنڈے

ہاتھ کی طرف دیکھا تو ایک دم اُسے وہ مینڈک یاد آ گیا جو برسات کے دنوں میں اس کے

ہاتھ پر کود گیا تھا۔ اُس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ پھر جانے

اُسے کیا ہوا کہ وہ سنجھی ہی چلی گئی۔

جب اس نے آنکھ کھولی تو سب لوگ اس کے پاس جمع تھے۔ اماں رو رہی تھیں۔
 اور بڑے چچا کوئی معجون چھا رہے تھے۔ مگر ہمیں کھیا وہاں نظر نہ آئے۔

اس پاس کمبخت ہندوں کے مکان میں کوئی بھوت دکھائی دے گیا ہوگا۔" تھمپی نے
 اس کے آنکھ کھولتے ہی اظہار خیال کیا۔ اور اماں بیاب ہو ہو کر اس کے ہاتھ چومنے لگیں۔

"بھرو ہی جہالت کی باتیں، کسی خیال سے ڈر گئی ہوگی؛ ذہنی بیماری ہے۔ تم یہ معجون روز
 کانا، ماراغ مضبوط ہو جائے گا بیٹی" بڑے چچا تھمپی کو کھپکار کر عالیہ کو نصیحت کرنے لگے
 تھے، اس لیے انہوں نے دیکھا بھی نہیں کہ تھمپی اپنی جہالت کا بدلہ لینے کے لیے کس قدر جین
 تھی مگر جانے کیا سوچ کر چپ ہو رہی تھی۔

"آخر ہوا کیا تھا عالیہ؟" بڑی چچی نے پوچھا تو اس نے گھبرا کر اس طرح آنکھیں
 بند کر لیں۔ جیسے سونا چاہتی ہو۔ اب بھلا وہ سب کو کیا بتاتی۔؟

(۱۹)

ابا کا مقدمہ ختم ہو گیا تھا۔ اقدام قتل کے سلسلے میں سات سال کی قید کا حکم سنایا
 گیا تھا۔

دو پہر ڈھل چکی تھی، ہلکی سی بوند ابادی کے بعد اب آسمان بالکل صاف ہو گیا تھا۔
 جب بڑے چچا نڈھال سے گھر میں داخل ہوئے تو جیسے وہ بات کرنے کی طاقت کہیں باہر ہی
 چھوڑ آئے تھے۔ اماں ان کی کمر سے لپٹ گئیں۔ بڑے بھیا بھے ابھی خبر سنانا۔ "اماں منہ اٹھائے
 انہیں بڑی امید و بیم سے تک رہی تھیں۔ بڑے چچا صحن میں کھچپی ہوئی چوکی پر آہستہ سے بیٹھ گئے
 تو عالیہ نے لوٹے میں پانی بھر کر ان کے پاس رکھ دیا۔ کیسی دھول اڑ رہی تھی۔ بڑے چچا کے
 منہ پر۔"

بڑے چچا کچھ تیلیوں کی طرح مُنہ پر پانی کے چھینٹے دینے لگے۔ وہ سب سے نظر میں
 بچا رہی تھی۔ اماں کا صبر جواب دے گیا۔ بری خبر تو بڑے چچا کی آنکھوں سے جھانک رہی
 تھی۔ اماں ان کا مُنہ تکتے تکتے دھاڑ کر رو میں تو بڑی چچی اور کریمین بوانے جلدی سے انھیں منجالی لیا
 "اماں بی کے کمرے کے دروازے بند کر دو کہیں وہ رونے کی آواز نہ سُن لیں۔" بڑے
 چچا نے عالیہ کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر اماں سے مخاطب ہو گئے۔ "منظر کی دُکھ، صبر سے کام
 لو۔ یہ سات سال بھی گزر جائیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ منظر ایک سال بھی جیل میں نہ رہے۔"
 کیا پتہ ہم آزاد ہو جائیں۔"

"سب بے کار باتیں ہیں بڑے بھتیہ، انھوں نے بھرا گھر اُجاڑ دیا۔ اب سات سال کون
 گزارے گا، ہائے سات سال نہیں گزرتے۔ اماں بگ بگ کر رہی تھیں۔
 "ارے حاکموں نے نہیں دیکھا اس گھر کا زمانہ، انھیں پتہ ہی نہیں کہس کا بیٹا ہے، اپنے
 مالک مرحوم تو لوگوں کو بچانسی کے تختے سے اُتر دالتے تھے، حاکم ان کی ڈالیوں پر جیتے تھے، پر
 اب زمانہ بگڑ گیا۔ گزر زمانہ یاد کر کے کریمین بوا کا مُنہ سُرخ ہو رہا تھا اور وہ روٹی ہوئی اماں
 کو لپٹائے کمرے میں لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔
 ہم اچڑ گئے، تباہ ہو گئے۔ انھیں مجھ سے کون سی دشمنی تھی۔ جو یہ سب کر دیا۔" اماں بے
 قابو ہو کر اپنے کو تھپڑا رہی تھیں۔

جب اماں کو زبردستی کمرے میں لے جایا گیا تو وہ صحن میں تنہا کھڑی رہ گئی۔ اماں کی گھر دُزاری
 نے کسی کو بھی اس کی طرف متوجہ نہ کیا، کسی نے بھی نہ دیکھا کہ اس کے دل پر کیا گزری۔ ایک بار تو اُسے
 ایسا محسوس ہوا کہ اس کے پیروں تلے کنواں کھد گیا ہو وہ دھیرے دھیرے گزر رہی ہو جانے کس طرح
 اُس نے آگے بڑھ کر لوہے کی کرسی تھام لی۔ صحن میں کیا سناٹا مچا یا تھا۔
 چند لمحوں بعد سیڑھیوں کو طے کر کے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور پھر اپنے بستر پر گر کر ایک

دم سیکنے لگی۔

ابھی طرح رو چکنے کے بعد جب اس کا دل ٹھکانے آیا تو وہ بالکل خالی الذہن ہو رہی تھی اس نے یوں ہی اپنے کورس کی کتابیں اٹھا کر پھر سے رکھ دیں۔ پانچ بجے ماسٹر ٹیچر پڑھانے کے لیے آتا تھا اس نے کتابوں پر تکیہ رکھ دیا جیسے آج تو وہ ان کتابوں کی صورت سے بھی بیزار ہو۔ آج کون سی تاریخ ہے۔ اس نے اپنی یاد کو کو کر دیا۔ آج رات سنا کا ایک دن گزر جائے گا۔ شام تو بچنے والی ہے۔ اس نے بڑی امید سے اس ایک دن کو آگے ڈھکیا دیا۔

سیرھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ ہو رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ بڑے چچا اس کی طرف بڑھ رہے ہیں وہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس نے بڑے صبر سے ان کا اترنا ہوا چہرہ دیکھا۔ لیکن جب بڑے چچا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سر پر ہاتھ کھیرا۔ تو وہ کانپ کر رہ گئی۔ آنسوؤں کے پردے کے اس پار سب کچھ دھندلا کر رہ گیا۔

”تمہیں اپنی ماں کو سنبھالنا ہی بیٹی، تم ہمت سے کام لو۔ مجھے امید ہے کہ جیل کی دیواریں اُسے زیادہ دن نہ روک سکیں گی، ٹھیک ہو نا؟“ بڑے چچا نے لمبی سانس بھری کیا یقین تھا چچا کی آنکھوں میں کہ وہ سر کھبکانے پر مجبور ہو گئی۔

بڑے چچا چلے گئے تو وہ آنسو پونچھ کر جیسے بڑے سکون سے لیٹ گئی۔

شام ہو رہی تھی، گلی میں موتیے کے ہار بیچنے والے صدالگاتے گزر رہے تھے۔ کمرے میں ہلکا سا اندھیرا چھپا رہا تھا لیکن عالیہ منہ چھپائے بستر پر پڑی رہی۔ بڑی چچی، چھٹی، کریمین بوا سبھی تو باری باری اس کے پاس آئے اُسے نیچے لے جانے کی ضدیں کیں مگر وہ کیسے جاتی، بھلا وہ اپنی اماں کو کس طرح دکھتی۔ اماں جو ایک سال سے اس گھر میں مسافروں کی طرح بیٹھی تھیں، اب باری نے ان کا سفر ختم کر دیا تھا۔ بندھا ہوا سامان کھل گیا۔

گلی میں بجلی کا بلب روشن ہو گیا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر چھت پر آئی۔ آج تو اُسے

اندھیرا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ پھر اندھیری رات میں تارے کتنے روشن ہو رہے تھے۔ جیسے دکھ کے اندھیرے میں غم دہاک رہے ہوں۔ قریب قریب کی چھتوں سے شور کی آواز آرہی تھی۔ بچے لڑتے جھگڑ رہے تھے۔ گراموفون ریکارڈ بج رہے تھے۔ کوئی آواز بھن گارہی تھی۔ میرا کے پر بھو، گردھر ناگر۔

عالیہ، میں تم سے بات کر سکتا ہوں، تم چیونگی تو نہیں؟، تمہیں کھیا جانے کب بلیوں کی چال چل کر اس کے سر پر اکھڑے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت سخت بوکھا ہائے ہوئے لگ رہے تھے۔ اظہار محبت کے تلخ نکتے کے بعد آج وہ اس سے بات کر رہے تھے ورنہ کئی مہینے گزر گئے ہوں نے اس سے بات نہ کی تھی۔ وہ گھر میں بھی کم ہی آتے، چپ چپ رہتے۔ بڑی چچی اپنے بیٹے کو یوں دیکھ کر فکر مند رہتیں ان کا خیال تھا کہ ابھی کسی مازمت نہ ملنے کی وجہ سے یہ حالت ہو۔ چند نالائق لڑکوں کی ٹیوشنوں پر ان کا گزارا ہو رہا تھا۔ عالیہ اپنے حال میں گن سنی بھی رہی۔

”کیا تم کو مجھ سے اتنی نفرت ہے کہ جواب تک نہ دو گی؟“ انھوں نے جیسے بے اختیار ہی میں پناہ ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور پھر جھجک کر کھینچ لیا۔ شاید انہیں پہلا نکتہ یاد آ گیا تھا۔ منہ بے چہرے سے منہ جیل نہ چلو گی۔؟

”میں آبا کو جیل میں نہیں دیکھ سکتی، بھلا میں انہیں مجرم کی حیثیت سے دیکھوں گی؟“ وہ دھیرے سے بولی۔

”واہ وہ مجرم کب ہیں، انگریز حکمران کو مارنا مجرم کہاں ہوتا ہے؟“

”ہوں!“ اس نے جیسے چونک کر تمہیل کھیا کی طرف دیکھا وہ تو اسے اس اندھیرے میں بھی بڑے

کشر اور خمیدہ نظر آ رہے تھے۔ وہ کچھ نہ بولی۔ بھگی بھگی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آ رہے تھے اور اب پیر بادلوں کے چند ٹکڑے ادھر ادھر تیرتے پھر رہے تھے۔

”نیچے جاؤ بھئی، سب کے ساتھ بٹھ کر جی بہل جائے گا“ جمیل بھیلنے اس طرح کہا۔
جیسے جی بہلنے کی بات سراسر تھوٹ ہو۔

آپ جابائے میں کھوڑی دیں آجاؤں گی“

جمیل بھیا کچھ دیر تک خاموش کھڑے رہے اور پھر چلے گئے وہ اپنے کمرے میں آگئی اور
میز بنگ کے پاس کھینچ کر آبا کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ وہ بہت سوچ سوچ کر لکھ رہی تھی۔ جدائی
کے یہ سات سال ملاپ کی چمک سے ہمیشہ کے لیے ماند پڑ جائیں گے۔ میں ہر دقت آپ کا انتظار
کردوں گی۔

خط ختم کرنے کے بعد اس نے وہی میز پر سر ٹیک دیا۔ اس دقت سات سال کتنے
طویل معلوم ہو رہی تھی۔ انڈر رام جی نے بن باس کے چودہ سال کی طرح گزارے ہوں گے؟
کریمین بوا گھر میں کہو کہ منظر بھائی کے جیل کی خبر سے بہت نفوس ہوا، اگر بدلے میں
کوئی مجھے جیل دے دے تو ابھی تیار ہوں۔ اپنی بے کار زندگی“۔ بیٹھک کی دہلیز سے اسرار
میاں کی بھرائی ہوئی آواز گھر کے سنائے کو چیرتی ہوئی اُسے صاف سنائی دی گئی۔ اُس
نے میز سے سر اٹھا کر خط لفافہ میں بند کر دیا۔

اسرار میاں کے پیغام کا کوئی جواب نہ تھا۔ صرف کریمین بوا کے پٹا سٹخنے کی آواز آرہی تھی
انڈر کرے اسرار میاں بڑھاپے سے پہلے ہی دادی کی طرح اونچا سننے لگیں انہیں یہ شک تو رہی
گا کہ جو اب تو دیا گیا ہی مگر انہوں نے سنا نہیں۔

بڑے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر اس نے نیچے دیکھا۔ صحن میں کچے ہوئے پلنگوں پر
سب لوگ چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ صحن بڑے چچا لیٹے ہوئے سینے پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ بڑی
چچی کا سر دتہ ہوئے ہوئے تھیالیہ کتر رہا تھا اور کریمین بوا بڑی پھرتی سے رد میاں پکار رہی
تھیں۔ جمیل بھیا لوہے کی کرسی پر بیٹھے انگلیاں مروڑ رہے تھے۔ چچی کا پتہ نہ تھا۔ اس واقعہ کے

بعد سے تو اس کی آواز بھی نہ سُنائی دے تھی۔ سارا رانا بھڑنا بھول گئی تھی۔
 وہ دبے قدموں نیچے اتر آئی۔ لائین کی پہلی رستی میں آماں اُسے بڑی بے بس نظر
 آ رہی تھیں۔ وہ جلدی سے بڑے چچا کے پاس بیٹھ گئی۔ آج تو اس نے بڑے چچا کا سر بھی
 نہ سہلایا تھا۔

ہاٹر صاحب روز آتے ہیں نا؟ آخر بڑے چچا نے بات کرنے کے لیے موضوع ڈھونڈ
 لیا اور خاموشی کا ڈیرا اٹھ گیا۔

”آتے ہیں“ وہ کھسک کر بڑے چچا کا سر سامنے لگی۔

”اب اگر تم محنت سے نہ پڑھو گی تو ہم کیا کریں گے، میرا کون سا لڑکا بیٹھا ہے جو ان برسوں
 کو بتا دے گا؟“ آماں پر پھر سے رونے کے آثار طاری ہو رہی تھے وہ جلدی سے اٹھ کر دادی کے کمرے
 میں چلی گئی جب سے رات کو سونہم پڑنی شروع ہوئی تھی دادی کا بستر کمرے میں چپا گیا تھا۔ سنی
 جون کے سوا ان کا سارا زمانہ کمرے میں گزرتا۔

وہ دادی کی پٹی سے ٹک گئی۔ چھٹی اپنی مسہری پر منہ چھپائے پڑی تھی۔ اس نے غامیہ کو دکھایا
 اور پھر منہ چھپا لیا۔

”منظر بیٹے کا کوئی خط آیا۔“ دادی نے بے چین سانس کو قابو میں کرتے ہوئے پوچھا۔
 ادھر کچھ دنوں سے تو ان پر ہر وقت دسے کا حملہ رہتا۔

”خط آیا تھا دادی، کام بہت ہو چھٹی نہیں ملتی۔“ اس کی آواز گھٹ رہی تھی۔ چھٹی نے
 ایک لمحے کو سر اٹھایا تو دو آنسو لڑھک کر کیچے میں جذب ہو گئے۔

”ابیا معلوم پڑتا ہے کہ اب زندگی ختم ہو رہی ہے، مختار اچھوٹا چچا جانے کب واپس آئے گا
 وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا، اٹھارہ سال کا ہو گیا تھا۔ مگر میری گود میں منہ چھپا کر سوتا تھا
 جانے وہ کب۔“

دادی کی سانس تیز ہونے لگی تو اُکھوں نے گھٹنے پیٹ میں اڑا لیے۔
 ”عالیہ، چھٹی کھانا کھانے آ جاؤ، صحن سے بڑی چچی کی آواز آئی تو عالیہ اٹھ کھڑی
 ہوئی، کریمین بوا دادی کا کھانا لیے اندر آ رہی تھیں۔

(۲۰)

اماں نے وقت سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ بہت ارنچے پر بیٹھے بیٹھے وہ ذرا نیچے پر سرک آئی
 تھیں، پراتنی بھی نہیں کہ چچی کے قریب بیٹھ گئی ہوں ان کے چہرے پر اب بھی تیس روپیہ مہینے کا
 غرور اور اس دوات کا سکون تھا جو ان کے بھائی کے پاس جمع تھی اور حفاظت کا وہ سایہ بھی ان
 کے ساتھ لگا ہوا تھا جسے اکلوتے بھائی کے ارنچے عہرے اور نچوڑ بھابی نے جنم دیا تھا۔

مقدمے کے فیصلہ کے بعد اماں نے ماموں کو کئی خط لکھے تھے جس میں اس گھر اور یہاں
 کی فضا کی بُرائیاں کی تھیں ان کے پاس رہنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ مگر ماموں نے بڑی
 بے بسی سے جواب دیا تھا کہ اس طرح وہ بھی حکومت کی نظروں میں آ جائیں گے اور ان کا
 عہدہ خطرہ میں پڑ جائے گا۔

عالیہ نے اماں سے اس خط کا ذکر نہ کیا تھا جو اُکھوں نے اسے لکھا تھا اور
 بڑی صفائی سے اعتراض کیا تھا کہ ان کی بیوی آزاد فضا کی پروردہ ہے، اس کے ملک
 میں رواج نہیں کہ خواہ مخواہ خانمانی جھمیوں کو پال کر زندگی تلخ کی جائے اس لیے ضروری
 کہ کسی بہانے وہ اپنی ماں کو وہیں رہنے پر مجبور کرے۔

اس نے یہ خط پڑھ کر بھاڑ ڈالا۔ وہ اماں کا دل نہ توڑنا چاہتی تھی۔ اس ٹوٹنے
 کے بعد ایشان کے پاس کیا بچ رہتا ہے۔ سہارے چاہے دھوکا ہی کچوں نہ دے جائیں مگر
 کچھ دن تو کام آہی جاتے ہیں۔ اسے ماموں سے سخت نفرت ہو گئی تھی۔ یہ ہنس کی چال

چلنے والا کو اپنی چال بھی بھول گیا۔ ماموں کا خط پا کر اس نے بڑی حقارت سے سوچا تھا
جب وہ خود کسی قابل ہو جائے گی تو اماں کے اس سہارے کو نوج کر دے پھینک دے گی اس نے
فیصلہ کیا کہ اب وہ اور بھی محنت سے پڑھے گی۔

ان دنوں بڑے زور کی سردی ہو رہی تھی پھر بھی وہ سات کو بارہ بارہ بجے تک پڑھتی
رہتی اور جب شکیں ادارہ گروہی کر کے محلے سے صہر دروازہ کھٹا تا تو وہ بے قدموں جا کر
زنجیر کھول دیتی شکیں ہائی اسکول میں داخل ہو چکا تھا۔ فیس کے روپے اس نے اماں سے
چھپا کر اسے دیئے تھے پھر اتنی بہت سی کتابیں خریدنے کے لیے وہ کہاں سے روپے لاتی
شکیں کے پاس بھی یہی بہانہ تھا کہ دوستوں کے ساتھ مل کر پڑھتا ہے۔ اس کی آنکھوں
میں کسی ڈھٹائی آگئی تھی۔ عالیہ دروازہ کھولتے ہوئے کبھی کبھی تہنہ کرتی تو بڑی بے اعتنائی
سے ہنس پڑتا۔

آج بھی رات کو جب وہ پڑھ رہی تھی تو دروازہ کھٹکا۔ وہ کتابیں رکھ کر جلدی
سے سیڑھیاں اترنے لگی اور جب دروازہ کھول رہی تھی تو جمیل بھتیا کانوں میں منفر لپیٹے
اپنے کمرے سے باہر نکل آئے عالیہ کو دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھنکے اور پھر شکیں کا بازو پکڑ کر اس
کے منہ پر دو تین تھپڑ مار دیئے۔ "لے یہ سبق بھی یاد کر لے"

شکیں نے جمیل بھتیا کو اپنی نظروں سے دیکھا جن میں مقابلے کی طاقت تھی مگر وہ جلدی
سے بڑی جھپی کے کمرے میں چلا گیا۔

"خواہ مخواہ مارتے ہیں، اسے کتابیں خرید دیکھے پھر کیوں جائے گا دوستوں میں
پڑھنے" وہ دھیرے سے بولی۔

"کتابیں؟ مجھے بھی کسی نے کتابیں نہیں دی تھیں مگر میں ایسا نہ تھا۔ یہ اتنا بڑا
ارنٹ کا اونٹ کچھ نہیں سوچتا، گھٹے دو گھنٹے پڑھ کر بھئی آسکتا ہے۔ اور پھر تم دیکھتی

نہیں ہو کر اسے سلک کی قمیص اس نے بنوا کر دکھا دی۔ میرا تو کوئی الیاد دست نہ تھا۔
بھیا غصے سے ہاتھ مل رہی تھی اور وہ بے وقوفوں کی طرح انھیں دیکھ رہی تھی۔ پھر

کیا ہوا جو کسی دوست نے قمیص بنوا کر دی ہے؟

بھیا سر جھبکائے کھڑے تھے، اسے ان کی حالت پر رحم آنے لگا۔ بے چارے روپے کی

قدرت کی وجہ سے کوئی ٹرننگ بھی نہ لے سکے۔ ٹوٹنگ کی ملازمت نہیں ملتی۔ ٹیوشنوں کے روپے

بھی بڑی چچی کے ہاتھ میں ٹکا دیتے ہیں۔ اس پریشانی کی آگ تنگ کرتا ہے، گمانا نہیں سنتا۔

وہ ادھر پر جانے کے لیے مٹھی تو جمیل بھیا بھی ساتھ ہو لیے۔ " میں بھی تمہارے ساتھ

چلوں فرا دی باتیں کریں گے؟ "

" بھلا یہ کون سا وقت ہے باتوں کا، سو رہیے۔ " اس نے جلدی سے کہا اور زینے پر

قدم رکھ دیا۔

" واہ یہ آپ اس وقت کیا کر رہی ہیں بھیا؟ چھٹی جانے کس کام سے اٹھی تھی۔

میں شکیل کا دروازہ کھولنے آئی تھی۔ "

دخوب آپ دونوں دروازہ کھولنے آئے تھے، ہے، کتنی سخت زنجیر تھی۔ " وہ بڑے

طنز سے ہنسی۔ سب کے سامنے بھیا سے بات کرتے آپ کو شرم آتی ہے۔ کیا؟ اس نے

بھیا سے پوچھا۔

" چھٹی اتنی فضول باتیں تو نہ کرو۔ " جمیل بھیا گڑ گڑائے۔

" ان کے دھوکے میں نہ آئیے گا بھیا، یہ پہلے مجھ سے عشق کرتے تھے اور اب آپ سے۔ "

چھٹی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

نہا ایہ تیزی سے زینے پر قدم رکھتی اور پوچھ گئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اللہ

کیا مصیبت ہے۔ کیا اچھے چھٹی جمیل بھیا کا سایہ بنی ہوئی تھی۔ اور اب جمیل بھیا اسے چھوڑ کر

ادھر لپک رہی ہیں۔ سردی اور نفرت سے وہ کلنپنے لگی۔ کاف میں گھس کر اس نے پھر سے کتاب اٹھالی
مگر ایک لفظ نہ پڑھا گیا۔ ان چند مہینوں میں تمیل بھیا کی خاموشی اور سنجیدگی نے ان کی جتنی عزت بنائی
تھی وہ ساری کی ساری تباہ ہو کر رہ گئی۔

گلی میں کتے اس زور سے بھونک بھونک کر رورہی تھے کہ اُسے رات سے دہشت آنے لگی۔
صبح رز کی طرح چھٹی اُسے پیار سے جگانے نہ آئی۔ عالیہ بڑی دیر تک پڑی اس کا انتظار
کرتی رہی۔ گلی میں اخبار فروش جھپٹے پھر رہے تھے۔ یورپ میں لوہے سے لوہا بجے گا، جنگ سرد
پر کھڑی ہو۔ آگیا، آگیا آج کا اخبار۔ جنگ کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ چودہ سال کی لڑکی کا غوا
کر لیا گیا۔

وہ بستر سے بھنجھا کر اٹھ گئی۔ جنگ یورپ میں ہوگی تو اسے کیا کون سے اماں کی بھابی
سے عزیز کٹ کر مر جائیں گے، اند لڑکیوں کا تو مصرف ہی صرف یہ ہے کہ وہ محبت کریں، بھاگیں یا
غوا کر لی جائیں۔ سب بھاڑ میں جائیں۔ سیڑھیاں طے کرتی ہوئی وہ بڑے دکھ سے سوچ رہی
تھی۔ مگر چھٹی اس پر کیوں شبہ کرتی ہے۔ ارے بے وقوف پاگل۔
چھٹی تخت پر بیٹھی ہوئی تھی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے پرائیڈ کو دانٹوں سے کاٹ کاٹ
کر کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں۔ عالیہ کو دیکھ کر اس نے مٹھ بھیر لیا اور پیالی کی
ساری چائے ایک ہی سانس میں پی گئی۔

اُسے چھٹی کی بے وقوفی پر ہنسی آرہی تھی۔ وہ چھٹی کے پاس گھس کر بیٹھ گئی تو اس نے بڑے
کرب سے پہلو بدلا۔ اور ایک طرف سر ک گئی۔ پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رات سکیں کس وقت آیا تھا عالیہ؟ بڑی چچی نے پوچھا۔

دکوی بارہ کے قریب، جمیل بھیا بھی جاگ گئے تھے، انھوں نے اس کے دو ہاتھ بھی

جڑ دیئے تھے۔

”اس ارٹکے کے لچھن اچھے نہیں دکھائی دے رہے ہیں“ اماں نفرت سے بولیں۔
 ”میں کیا کروں نظر کی دُکھن، میں پاگل ہو جاؤں گی“ بڑی چچی نے ٹھنڈی سانس بھری
 ”بڑے بھیا سنبھالیں نا اپنی اولاد کو“ اماں نے بھڑکایا مگر بڑی چچی بھلا کا ہے کو کسی
 کے بھڑکانے میں آتیں۔ ان کا خود جب جی چاہتا تو بڑے چچا سے لڑ لیا کرتیں۔

در زمانے زمانے کی بات ہو۔ ایک زمانہ تھا کہ بڑے سرکار کے سب بچے رات بچے کے
 بعد گھر سے باہر قدم نہ نکالتے۔ گزرا زمانہ کر مین بوا کا سایہ بنا ہوا تھا۔

چائے پیا کر وہ چھمی کے کمرے میں چلی گئی۔ دادی اس وقت سو رہی تھیں۔ رات کو تو
 سانس انھیں ایک منٹ کو آنکھ نہ تھپکانے دیتا وہ دبے قدموں چھمی کے پاس جا کر بیٹھ گئی
 چھمی سر سے پاؤں تک لکان اور ٹھے پڑی تھی۔ جگہ جگہ سے پھسا ہوا لکان فقیر کی گڈری
 معلوم ہو رہا تھا۔

”چلو اد پر دھوپ میں بیٹھیں چھمی“ عالیہ نے اس کے منہ پر سے لکان سرکایا۔

”ہم آپ سے نہیں بولتے۔“

”اد پر تو چلو بھگی بھریا میں ہوں گی۔“

چھمی اٹھ کر اس کے ساتھ ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا کرب تھا۔

صبح سے تم مجھ سے بولیں کیوں نہیں؟“ چھمی کو اپنے لکان میں بٹھا کر اس نے پوچھا۔

”واہ مجھے کیا پڑی ہو جو آپ سے بول سجال بند کروں! کوئی میں اس گدھے سے محبت

کرتی ہوں جو آپ سے جلدوں گی“ چھمی نے برا سا منہ بنایا۔

”تم نے آپ ہی آپ یہ کھنا شروع کر دیا کہ تمہیں بھیا مجھ سے محبت کرتے ہیں میں نے

تو پہلے بھی تم سے کہا تھا کہ مجھے ایسی باتوں سے سخت نفرت ہو اور پھر تمہیں بھیا نے بھی

کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی“ وہ صاف جھوٹ بول گئی۔

جمیل بھیا خود ہی مجھ سے محبت کرتے تھے۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔
مگر اب وہ بدل گئے تو بدل جائیں میں کب اس کو سے محبت کرتی ہوں؟

تم محبت کرو یا نہ کرو۔ مگر مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی تھیں۔ اس نے ٹری
ملا مت سے کہا تھمی کو دیکھا تو وہ ایک دم اس سے لپٹ گئی۔ بھلا میں اپنی بھیا پر شبہ تھوڑی کر رہی
ہوں، مجھے تو بس رنج تھا ایک بات کا۔

تھمی کی معصومیت پر اس کا جی چاہا کہ بس اُسے کھینچے میں دھرے۔ پھر بھی وہ اس سے
دٹھی رہی۔

«ارے سنیے تو میں آپ کو سب کچھ بتاتی ہوں» تھمی نے عالیہ کا منہ اپنی طرف کر لیا۔
جس سال بھیا ایف۔ اے کا امتحان دے رہی تھی۔ تو انہوں نے مجھ سے روپے مانگے۔
میں نے انکار کر دیا۔ تو انہوں نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں نے سارے جمع روپے انہیں
دے دیئے اور انہوں نے مجھے زور سے لپٹا لیا۔ مجھے بڑا اچھا لگا ان کا لپٹانا۔ وہ مارے
شرم کے سرخ پڑ گئی۔

«پھر کیا ہوا؟»

«پھر بھیا جمیل بھیا مجھے اچھے لگنے لگے اپنے کھانے کے پانچ روپے بڑی چچی کو دے
دیتی باقی سارے جمیل بھیا کو۔ میں نے ان تین برسوں میں ایک کپڑا بھی نہیں بنوایا۔ دیکھا
ہو نا آپ نے میرے سارے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔»

وہ ایک لمحے کو کچھ سوچنے لگی۔ «جب آپ نہیں آئی تھیں تو جمیل بھیا اسی

کمرے میں رہتے تھے میں رات کو ان کے پاس آجاتی تھی۔ پر بھیا انہوں نے کبھی بدتمیزی
نہیں کی۔ ایک بار میں ان کے پاس لیٹ گئی تھی تو خود ہی اٹھ کر بیٹھ گئے تھے، انہوں نے صرف
پیار کیا تھا۔ تھمی کا منہ حقیقتاً ہورہا تھا۔

پھر کیا ہوا چھٹی؟

”کھیر بچیا، بڑی چچی نے بھیا کی شادی طے کر دی۔ بڑی چچی کا خیال تھا کہ اگر ہمیں بھیا منظر چچا کے داماد بن گئے تو وہ آپ ہی ایم اے کرادیں گے۔ اور ٹرننگ بھی دلادیں گے، ویسے میں چپکے سے آپ کو بتا دوں کہ بڑی چچی آپ کی اماں سے بہت ڈرتی ہیں۔ بس اس لیے بغیر رشتے کے کیسے کہتیں کہ آگے پڑھا دو۔ میرا میاں تو نکتا ہی۔ بڑی چچی نے بڑے ڈرتے ڈرتے تہنہ آپ کا رشتہ مانگا تھا اور جس دن منجھلی چچی نے منظر ری کا خط بھیجا تھا اس دن بڑی چچی خوشی سے روتی رہی تھیں، بھلا میں کیسے کہتی کہ میں نے بی۔ اے کرادیا ہی تو ایم۔ اے بھی کرادوں گی کسی کو کیا پتہ کہ میں نے کتنے دکھ کھیلے۔“ وہ سر تھوکا کر کچھ سوچنے لگی۔

”پھر چھٹی۔“

”یہ دنیا سچ مچ بڑی بڑی ہو بچیا۔ ہمیں بھیا بھی تو بی اے کرنے کے بعد بدلے بدلے نظر آنے لگے۔ میں اگر ان کے پاس زیادہ ٹھہرتی تو بہانوں سے اٹھاتے۔ سب کچھ بھول گئے نا، اور اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہا انھیں! سب کے سامنے میرا مذاق اڑاتے ہیں اٹنی سیدھی باتیں کرتے ہیں خیر کرتے رہیں، میں بھی تو کوئی کتیا نہیں ہوں۔ جو ان کے پیچھے پھروں۔“ چھٹی نے گھٹی گھٹی آہ بھر کر اُسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ اُس کا جی دکھ کر رہ گیا۔ اُسے تہنہ آپا یاد آئیں۔ کہیں یہ چھٹی بھی کوئی بے وقوفی نہ کر بیٹھے پھر کیا ہوگا۔

”کیا پتہ چھٹی، ہمیں بھیا تم سے محبت کرتے ہی ہوں، اور نہ بھی کرتے ہوں تو کیا محبت کے بغیر انسان خوش نہیں رہ سکتا۔“

”تو، تو کیا میں ان پر نچا درہ موتی پھروں گی بھئی جو ہم سے محبت کرے گا۔ ہم اس سے کریں گے۔ یہ تو بدلا ہی۔ اس! تھوڑے اس! تھلے۔“ وہ ہنستی ہوئی اٹھ گئی۔ رات دواوی کا طبیعت بڑی خراب رہی تھی۔ میں سو نہیں سکی۔“

چھٹی کے جانے کے بعد وہ دیر تک یوں ہی لحاف میں ٹھہری جھومستی رہی اور پھر کتابیں اٹھا کر
دھوپ میں جا بیٹھی۔ ہائے کیا مل گیا تمہیں بھیا کو اس بے چاری سے کھیل کر۔ مگر یہ عورتیں محبت
کی اتنی بھوک کیوں ہیں اندر۔

(۲۱)

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اب وہ پڑھتے پڑھتے تھک چکی تھی۔ اس نے میز پر کتابیں
رکھ دیں۔ وہ سونا سچا ہوتی تھی مگر سونہ سکی۔ اور جب نیند نہ آئے تو کتنی بہت سی باتیں ذہن میں
گھبلائے گئی ہیں۔ ابا کا خط کیوں نہیں آیا۔ اپا تمہیں نے عشق کے پیچھے جان گنوا دی اور اب وہ بالکل
تہا ہے کسی کی رفاقت نصیب نہیں۔ اماں! اپنے دکھوں میں مبتلا ہیں، اُنہوں نے کبھی اپنی اس
اولاد کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھا۔ اس کے لیے کچھ نہیں سوچا اور تمہیں گھبلا خواہ مخواہ اس
کی راہ کا روڑا بن رہے ہیں کیا انہیں زندگی میں کوئی اور غم نہیں۔ لاجول والا مگر وہ ان کے لیے
سوچ ہی کیوں رہی ہے؟ کھڑکی سے روشنی اندر آ رہی ہے۔ اس لیے نیند نہیں آتی، اس نے دونوں
پٹ بھیر دیے۔

نچلی منزل میں اچانک سب کے باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔ وہ دم سادھ کر باتیں سُننے
کی کوشش کرنے لگی۔ بارہ بجے ہیں، شاید ٹیکیا آیا ہوگا اور سب اس کی تاک میں ہوں گے۔
زمینوں پر قدموں کی چاپ ہوئی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی تمہیں بھیا اس کی طرف آ رہے تھے۔
"عالیہ، دادی کی طبیعت سخت خراب ہے۔ ذرا دیر کو نیچے چلو" وہ بہت سنجیدہ ہو رہے تھے۔ تم
گھبراؤ گی تو نہیں۔ ایک دن سب پر یہ وقت آنا ہے۔"

اس کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ سب سمجھ گئی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں کانپ
رہے ہیں مگر وہ بڑی ہمت سے تمہیں بھیا کے ساتھ ہوئی۔ تمہیں بھیا اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے

مگرا سے تو پتہ ہی نہ چل رہا تھا کہ یہ ہاتھ اس کا ہے یا کسی غیر کا۔

دادی کی مسہری کھینچ کر ان کا منہ قبلے کی طرف کر دیا گیا تھا۔ اماں، بڑی چچی اور بڑے

چچا مسہری کے ارد گرد خا موشی سے کھڑے ہوئے تھے۔ دادی کی وہ تھکڑا لوسانس جانے کتنی پرکھ

ہو گئی تھی۔ دور دور زندگی کی آہٹ بھی نہ محسوس ہوتی۔ دادی کی آنکھیں دروازے پر مٹکی ہوئی

تھیں۔ ابھی ان میں انتظار کا نور باقی تھا شاید وہ اس وقت بھی اپنے سب سے لاڈلے چھوٹے

بیٹے کا انتظار کر رہی تھیں۔ اور تھمتی، دادی کے قدموں سے لپٹی گھٹی گھٹی سبکیاں بھر رہی تھی۔

ظالم چھوٹے چچا — عالیہ کی نظروں میں ان دیکھے چھوٹے چچا کا بھیانک نقشہ بھر گیا اس

کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ سچ کر کے۔ دادی اب تو ایسی بے کار اور لاڈ کا انتظار نہ کر دے۔

کریمین بوا بڑی بے تابی سے مسہری کے چاروں طرف گھوم گھوم کر دعائیں کر رہی تھیں

مولا مالکن کو صحت دے دے اور بے میں مجھے اٹھالے۔ مولا، مولا۔

بابر نے بھی تو اسی طرح ہاتھوں کی جان کی اماں چاہی تھی۔ ہے کریمین بوا یہ کون سی

محبت ہے جو تمہارے دل میں ٹھاٹھیں مار رہی ہے۔ عالیہ نے کریمین بوا کو بٹھانا چاہا مگر وہ

اپنے کو چھڑا کر پھر دعائیں کرنے لگیں۔ مولا، مولا۔

ایک ہچکی کے ساتھ دادی کو دائی سکون مل گیا۔ کریمین بوا ہاتھ جوڑ کر کھڑی

ہو گئیں۔ ان کی آنکھ میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔ بڑے چچا نے نبض پر سے ہاتھ ہٹا کر دادی

کے ہاتھ سینے پر باندھ دیئے اور لکان سے منہ چھپا دیا۔ کریمین بوا کمرے سے سر تھکائے

نکل گئیں۔

”تھمتی، اب اٹھ جا، مٹی“ بڑی چچی نے تھمتی کو اٹھایا تو دادی کا ڈھکا ہوا منہ

دیکھ کر وہ بے قابو ہو گئی بڑے چچا کا منہ ذنب کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا اور ان کی آنکھوں

سے ماں کی محبت بھری کہانیوں کی یادیں جھانک رہی تھیں اور دائی جی جی کا صد ملرز رہا تھا

بڑے چچا سر ہلکائے بیٹھا کب میں چلے گئے شاید اسرار میاں کو اطلاع دینے۔ اماں اور بڑی چچی تھمتی کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ ہاتھوں سے نکلی جاتی تھی۔ پھر جب تمہیں کھیانے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تو تھمتی کا سر جیسے خود بخود ان کے سینے پر آٹکا اور وہ اس طرح چپ ہو گئی جیسے کبھی رومی نہ تھی۔

وہ کمرے سے باہر آگئی۔ کریمین بوا صحن میں انٹیوں کا چولہا بنا کر بڑے سے پیلیے میں پانی گرم کر رہی تھیں اور وہ جواب تک دادی کی موت پر ایک آنسو بھی نہ بہا سکی تھی اندھیرے میں آگ کے لرزے شعلوں کو دیکھ کر سبک اٹھی۔ کریمین بوانے اس کی طرف دیکھا اور سر ہلکایا رات دادی کی مسہری کے پاس بیٹھ کر کٹ گئی۔ اماں اور بڑی چچی آج دادی کے سارے ظلم و ستم بھول کر انھیں اس طرح بلک بلک کر یاد کر رہی تھیں جیسے ان کے بغیر دنیا سونی ہو گئی ہو جب تک دادی زندہ رہیں ان کے ظلم و ستم نے سب کے کلیجے چھلنی کر رکھے تھے۔ بڑھاپے کے آتے ہی سب نے اتمام لے لیا۔ بے کار چیز کی طرح اٹھا کر ایک طرف ڈال دیا اور پھر زندگی کا ہنسیوں کے اتنے دیر سے پڑے کہ دادی ٹکا ٹکا منہ تکنے کے سوا کچھ نہ کر سکیں۔

غالیہ کا جی چاہا کہ وہ اپنے کانوں میں رومی ٹھونس لے۔ اماں اور بڑی چچی کی محبت کی دہانیں اس سے نہ سنی جا رہی تھیں۔ آخر اس دقت سب کو ان کے ظلم و ستم کیوں نہیں یاد آتے؟ اسے تو صرف تھمتی اچھی لگ رہی تھی جو کوئی بات نہ کر رہی تھی بلکہ بھڑکی دیر نہ لینے کے بعد درمی کے ایک کونے پر لیٹی بڑے سکون سے سو رہی تھی، جیسے اب بھی اس کا سر جمیل کھیا کے سینے پر ٹکا ہو۔ اور کریمین بوا جو سنے ٹھنڈی ہوا میں مٹھی گلی لکڑیاں بھونک رہی تھیں اور گود میں رکھے ہوئے تران پاک کو ہل ہل کر پڑھے جا رہی تھیں، کتنے صبر اور خاموشی سے انھوں نے دادی کی موت کو برداشت کر لیا تھا۔ پھر سال سے تن تنہا دادی کی خدمت کرنے والی کریمین نے ایک آنسو بھی نہ بہایا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی درمی کے ایک کونے پر سُکرا کر سُورہی اُسے دادی سے نہ تو
شاید محبت تھی اور نہ کوئی شکایت، بس وہ اس کی دادی تھیں۔ پھر بھی وہ لیٹ نہ سکی، کیونکہ
اماں نے چھتی کے سوجانے پر بڑی نفرت سے نکتہ چینی کی تھی۔

آخر کو صبح ہو گئی۔ کریمین بُو اُسے صحن میں درمی کھچا دی تھی اور محلے کی عورتوں میں آ کر جمع ہو رہی
تھیں۔ وہ سب اپنے اپنے دکھوں کو یاد کر کے آنسو بہا رہی تھیں اور چھتی انھیں دیکھ دیکھ کر اپنی جان
ہلکان کر رہی تھی۔

جب دادی کو نہلا دھلا کر آخری سفر کے لیے تیار کر دیا گیا تو نہام عورتوں میں برآمدے میں ٹاٹ
کے پردے کے پیچھے پھپ گئیں، ہر طرف کریمین بُو ہاتھ جوڑے لاش کے پاس کھڑی جانے کیا کہہ رہی تھیں
جب میت اٹھانے کے لیے مرد اندر آئے تو اسرار میاں سب سے آگے تھے۔

”خبردار! زندگی میں کبھی مالکن نے منہ نہ لگایا اب ان کی لاش خراب کرنے آئے ہو۔“
کریمین بُو اسرار میاں کے سامنے آئیں اور وہ چوڑوں کی طرح جمیل بھیا کے پیچھے چھینے لگے
نہام لوگوں کی نظریں سو الیہ نشان بن کر اسرار میاں کا تعاقب کر رہی تھیں۔
ارے شکیل کہاں ہو، اپنی دادی کو قبر تک تو پہنچا آتا۔“ بڑی چچی ٹاٹ کے سُورخ سے
شکلیں کو تلاش کر رہی تھیں۔ مگر وہ کہاں تھا۔

”اندر جاؤ کریمین بُو!“ بڑے چچانے کریمین بُو کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔
”اللہ کو سونپا مالکن۔ اللہ کو سونپا!“ کریمین بُو صحن سے ہٹ کر برآمدے میں آ گئیں۔
دادی کی لاش جب صدر دروازے سے پار ہو رہی تھی تو ایک بار سب چنچ کر رو پڑے
مگر کریمین بُو سر جھکائے صحن میں بکھرا ہوا سامان بُو رہی تھیں۔

ذرا دیر بعد سب مہان چلے گئے تو جیسے گھر ایک دم ویران ہو گیا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ
کیا کرے۔

سات نو بجے بڑے چچا کسی کام سے کلان پور چلے گئے۔ عدم تعاون کی تحریک زاروں پر تھی اور وہ بہت دن سے مصروف تھے۔ بڑے چچا کا اسی دن چلا جانا اُسے سخت برا لگا۔ کیا وہ دُر دن گھر میں بیٹھ کر اپنی ماں کا سوگ بھی نہیں مناسکتے تھے۔ کیا ان کی سیاست بازی انہیں اتنا بھی دقت نہیں دے سکتی۔؟

مگر جب اماں نے ان کے جانے پر اعتراض کیا تو وہ چپ چاپ سنتی رہی جانے کیوں وہ بڑے چچا کے خلاف ایک لفظ نہ بول سکتی تھی۔

جمیل بھیلے نے نجمہ بھوپھی، بابا اور تھپتی کے آبا کو تار کر دیے تھے۔ اور اب سب لوگ ان کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

دوسرے دن سے سب کام اس طرح ہونے لگے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ صرف اس وقت دادی کی موت کا احساس شدید ہو جاتا جب کریمین بوا کام سے فارغ ہو کر قرآن شریف پڑھنے بیٹھ جاتیں۔ اور تو گھر میں کسی نے ایک آیت بھی نہ پڑھی۔ عالیہ کو کریمین بوا کی محبت پر رشک آنے لگا تھا اس نے کتنی بار چاہا تھا کہ ایک ادھ بابہ پڑھ کر دادی کی رُوح کو بخش دے مگر اُسے فرصت ہی نہ ملتی۔ امتحان کی تیاری سر پر سوار تھی وہ اب پھر دھیان سے پڑھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنا ایک سال دادی کو بخشنے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ کریمین بوا کے مقابلے میں خود کو کمتر سمجھ کر صبر کر لیتی۔

تھپتی چند دن تک اپنے کمرے میں جانے سے گھبراتی رہی۔ پرانے رفیق کا ساتھ چھوٹنے کے بعد وہ کمرہ شاید اس کے لیے جنگل بن گیا تھا وہ ادھر ادھر ماری ماری پھرتی یا پھر صحن میں چوکی پر بیٹھ کر ٹیپے ہوئے کپڑوں کی مرمت کرتی رہتی یا پھر لوٹوں بانی بھر کر کیاری میں ڈالنے لگتی اور جب اس سے بھی اکتا جاتی تو بربع اور ڈھکڑھکڑ کے گھروں گھروں پھرا کرتی۔

پھر ایک دن اس نے جھاڑو اٹھا کر اپنا کمرہ صاف کرنا شروع کر دیا۔ سارے جا بے پھرا دیئے

محمد علی جوہر کی تصویر سے گرد جھاڑی لگی اس نے سفید کر ڈھی ہوئی پُرانی جاہدوں پر پوند لگا کر
 انہیں دونوں مسہریوں پر بکھیا دیا اور صاف مستحضرے بستر پر لیٹ کر ہمیشہ کی طرح گانے لگی م
 مال سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ

چھٹی کو گرامونوں ریکارڈوں کے سارے گانے اور فقیروں کی گائی ہوئی ساری غزلیں یاد
 تھیں۔ اسے ہر موقعہ کی غزل اور گیت گانے میں مالکہ حاصل تھا۔ آج جب چھٹی کے اسٹیشن
 سے لیٹی گا رہی تھی تو عالیہ کا جی چاہا کہ جا کر اُسے پہلے لے کر چھٹی تو اب تک اس سے سیدھے مسند
 نہ بولتی تھی سب کچھ تباہی کے باوجود اس کے دل میں کوئی بھانسن رہ گئی تھی جسے نکالنا عالیہ کے
 بس میں نہ تھا۔

نجمہ بھوپھی اور چھٹی کے ابا کا خط آیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ جب اماں خست ہو گئیں
 تو پھر آنے کے کیا فائدہ۔ کاش انہیں کوئی پہلے سے اطلاع کر دیتا۔

چھٹی اپنے ابا کا خط پڑھ کر آپلے سے باہر ہو گئی۔۔۔ "ہاں اب آنے کا کیا فائدہ۔ ایک
 دن کے لیے بیوی کے پہلو سے الگ ہو کر انہیں کب قرار آتا ہے۔ میرا بس چلے تو اپنے والد صاحب
 قبلہ کا گرا اپنے ہاتھوں گھونٹ دوں۔"

"چھٹی کہیں تو زبان کو لگام دیا کرو۔" عالیہ کی اماں نے گھر کا تو چھٹی ایک دم گھٹ گھٹ
 کر رونے لگی۔ جانے کیوں وہ اتنے دن گزرنے کے بعد بھی اماں کو جو اب دینے سے چوک
 جاتی تھی۔

ابا کو بھی دادی کی موت کی اطلاع مل گئی تھی۔ ان کا خط آیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا
 کہ تشویر کی دنیا کو کوئی جیل بند نہیں کر سکتا۔ اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ میں نے اپنی
 ماں کو کا نہ دیا تھا۔ میں نے انہیں قبر میں اتارا تھا۔ خیر تم رنج نہ کرنا میری بیٹی۔ تم کو دل شکستہ
 نہ ہونا چاہیے۔ موت بھی زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ محنت سے پڑھو اور اپنے پاس ہونے

خط پڑھ کر عالیہ بڑی دیر تک سر جھبکائے بیٹھی رہی۔ دوپہر ہو گئی مگر اس کا پڑھنے میں جی نہ لگا۔ ایک تو آبا کے خط نے اسے رنجیدہ کر دیا تھا۔ اس پر سے دوپہر کے سناٹے میں کریمین بوا کے ہولے ہولے تران پاک پڑھنے کی آواز جیسے فریاد کرتی معلوم ہو رہی تھی۔

اپنے کمرے سے نکل کر وہ نیچے اتر گئی اور تخت پر کریمین بوا کے پاس جا بیٹھی۔ اماں اور بڑی بیچی شاید سو رہی تھیں کیونکہ ان کے باتیں کرنے کی آواز نہ آرہی تھی۔

کریمین بوا جب تک پڑھتی رہی وہ ان کے پاس سر جھبکائے بیٹھی رہی اور جب وہ تران شریف بند کر کے دعا کرنے لگیں تو عالیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کریمین بوا محبت کی کیسی مثال پیش کر رہی ہیں۔ کام سے تھک کر وہ بھی اردن میں سو سکتی ہیں۔

”تم سوئی نہیں عالیہ بیٹی؟“ دعا ختم کر کے کریمین بوا نے پوچھا۔

”نہیں نہیں آئی کریمین بوا اور سب وہ چپ ہو گئی۔“

”کیا بھوک لگی ہو بیٹی کو؟ ایک روٹی الٹ دوں آگ جلا کر؟“

”نہیں کریمین بوا، تمہارے پڑھنے کی آواز سے جی بھر رہا تھا۔“

”منہبلے میاں اور تجہ کو بیٹیا کو ضرور کرنا چاہیے تھا۔ تھمتی بھی اپنے باپ کو دیکھ لیتی اور

کھیر کچھ نہیں تو ہنس سہری کا دیدار کر لیتے جس پر ان کی ماں نے دم توڑا تھا۔ زمانے زمانے کی بات ہو

کبھی ماں کے بغیر چین نہ پڑتا تھا۔ کریمین بوا کے لہجہ میں شکایت تھی۔

”تم کو دادی سے کتنی محبت تھی کریمین بوا۔ شاید دادی بھی تم کو اتنا ہی چاہتی ہوں گی۔“

”کیا مالکن تجھ چاہتی تھیں۔؟“ کریمین بوا نے اٹسا سوال کر دیا۔ ”تم نے اپنی دادی

کا زمانہ نہیں دیکھا بیٹی، یہ نہیں وہ کسی کو چاہتیں بھی تھیں یا نہیں۔ ہاں صرف چھوٹے میاں

کو چاہتی تھیں جو پتہ نہیں کہاں کھو گئے۔ انھیں خیانت کے جلے لے گئے۔ ہم تو نوکر لوگ تھے

عالیہ ٹیپا، ہارمی کیا حیثیت " کریمین بوانے اپنی قمیص میٹھ پر سے سر کا دی اور اس کی طرف گھوم کر بیٹھ گئیں۔ اُن کی میٹھ پر سیاہ نشان تھے اور ایک جگہ سے سفید سفید چربی سی نکلی ہوئی تھی۔
 "یہ کیا ہوا تھا کریمین بوا؟" اس نے جلدی سے قمیص نیچے کھینچ دی۔

میری اماں مالکن کے جہیز میں آئی تھیں۔ میرے آبا مر گئے تھے، میں چھوٹی سی تھی، پھر جب ذرا بڑی ہوئی تو مالکن نے اپنے گھر کے ایک نوکر سے میری شادی کر دی۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی اس لیے مالکن کی خدمت میں ذرا سی کوتاہی ہو گئی۔ بس یہ اسی کی سزا تھی، "کریمین بوا سر تھکا کر کچھ سوچنے لگیں۔"

انشہ، یہ کریمین بوا بھی کبھی ممتہ ہیں۔ اتنے ستم سہنے کے بعد بھی جب تک دادی زندہ رہیں ان پر کھچا در ہوتی رہیں اور اب بھی انھیں نہیں بھولتیں۔ وہ حیران ہو کر ان کا منہ تک رہی تھی۔
 میں نے ساری زندگی اُن کا نمک کھایا تھا اور اب بھی ان کی اولاد کا نمک کھا رہی ہوں۔
 نمک کا بڑا حق ہوتا ہے ٹیپا عالیہ، میری اماں، انشا انھیں جنت نصیب کرے۔ کہتی تھیں کہ جس کا نمک کا حق نہ ادا کیا وہ خدا کے ہاں بھی معاف نہ کیا جائے گا مالکن کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا مجھے، دوسری دنیا میں تو سکھ کی سانس لے سکوں۔
 کریمین بوا اٹھ کر جھوٹے برتن سمیٹنے لگیں اور عالیہ کو الیا محسوس ہوا کہ کریمین بوانے نمک کا سارا ڈبہ اس کے منہ میں انڈیل دیا ہے جو اُسے زہر سے کڑوا لگ رہا تھا۔

(۲۲)

سورج ڈوب رہا تھا اور اس وقت گلی میں سودے والوں نے جیسے دھوا دبول دیا تھا سب ایک دوسرے سے بڑھ کر آواز لگا رہی تھے اور جھتوں سے کھلی کھڑکیوں سے بچوں اور مردوں کی آوازیں آرہی تھیں، روزہ انظار نے کے لیے سب اپنی پسند کے سودے والے کو آواز سے رہے تھے

کھڑکی کھول کر وہ ایک ہنٹ کے لیے گلی میں جھانکی۔ سارے ہائی اسکول کا سیاہ پھانک بند پڑا تھا اور درختوں کے ٹھنڈے کونے کے کوکنے کی آواز آرہی تھی۔ جانے کیلئے اسکول جانا بھی ہو کہ نہیں۔ اس نے سوچا۔ پر کون ہی جو یہ سب معلوم کرے۔ اگر بڑے چچا گھریزہ رسی بھی تو جب دیدیں تو سب کچھ ٹھیک نہ ہو جائے۔ مگر۔ اُسے ایک دم آبا یاد آگئے۔ اس بار وہ انھیں عید کا روضہ سرد بھیجے گی۔ کھڑکی بند کر کے وہ چھت پر آگئی تو اسے ہلکی سی سردی محسوس ہونے لگی پھر بھی وہ ٹہلتی رہا پھتوں سے بچے پتنگیں اڑا رہے تھے اور شور ہو رہا تھا۔ عالیہ کو یاد آیا کہ ایک بار اس نے بھی بھنگی کے لڑکے کے ساتھ پتنگ اڑانے کی کوشش کی تھی۔ اور آبانے اسے سختی سے ڈانٹا تھا مگر آج تک اُسے پتنگ بڑی اچھی لگتی۔

«عالیہ — بڑی چچی ہانپتی ہوئی اور پر آکر اس کے پاس کھڑکی، دگنیس ان کا منہ سُرخ ہو رہا تھا۔ جیسے بڑی مشقت کی ہو۔ ایسی ہی مجبوری ہوتی جو وہ سیرتھیاں چڑھتیں۔ انھیں نے تو اوپر چڑھنے کے خیال ہی سے احتجاج ہونے لگتا۔ « یہ لو اپنے کپڑے۔ « انھوں نے سانس دیر کرتے ہوئے ہنس کر ایک بٹل اس کی طرف بڑھا دیا۔ « ڈو پیٹہ رنگ کر چن لو اور پا جامہ بھی مشین پر کھٹ کھٹالو، جمیر تو تمہارے پاس ہی ہے۔ «

سُن نے بڑے چاؤ سے بٹل کھول کر دیکھا۔ ڈھا کہ کی مٹاں کا ڈو پیٹہ اور نیلی ساٹن جھک رہی تھی۔

« مگر بڑی چچی اس کی کیا۔۔۔ «

« بس بس، تم آج رات ضرور سی ڈالو اور تمہی خوشی عید منادے « وہ جانے

کے لیے مڑیں۔ « روزہ کھولنے کا وقت ہو رہا ہے، تم نیچے نہیں آتیں۔ «

اشریہ کپڑے کہاں سے آگئے، کون لے آیا۔ عید کے لیے کسی کے بھی تو کپڑے نہ بنے

تھے۔ بڑی چچی نے تو کئی بار بڑے چچا سے کپڑوں کے لیے کہا تھا۔ مگر وہ ہر بار شرمندہ سے

ہو کر بیٹھاک میں چلے گئے تھے۔ پھر اس کے کپڑے کس نے خریدے ہیں۔ کیا تمہیں بھتیانے اپنے ٹیوشن کے روپے اس پر خرچ کر دیئے ہیں یا پھر بڑے چچانے ابا کی جگہ کو پر کیا ہے؟ مارے خوشی کے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ضرور بڑے چچانے خریدے ہوں گے۔

مگر ذرا ہی دیر میں اُسے معلوم ہو گیا کہ کپڑے کس نے خریدے ہیں۔ نیچے سے شکیل کی آواز بڑھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ "تمہیں بھتیانے بجیا کے کپڑے بنوا دیئے میرے لیے کچھ نہیں آیا رکھا دست عمید بھی منوادیں۔"

"بجی اس نہ کرنا مراد؟ بڑی چچی اُسے ڈانٹ رہی تھیں۔" کیا وہ تیری بہن نہیں تو خود اس کے کپڑے بنا، اسے تیرے جتنے لڑکے ایک کنبے کا پیٹ بھرتے ہیں۔"

"ہاں جب تم باہر رہتے ہو تو وہیں کپڑے بھی پہنو، تمہیں تو بہت شریف لڑکا ہے۔" اماں بھی شکیل کا کلیجہ جلا رہی تھیں۔

مجھے اس گھر سے ملا ہی کیا ہے کبھی، کپڑے بھی دوست ہی دیں گے۔" شکیل نے بڑے پچھے پن سے جواب دیا۔

"تم بھی اگر بجیا کی طرح بن جاؤ تو اللہ قسم تمہیں بھتیانے تمہارے دس جوڑے بنا دیں۔ ویسے تم کو کون پوچھے؟" جھمکی بھی تیرا بھائی تھی۔ جو سپرے عالیہ کے کلیجے میں اتر رہے تھے۔

اس نے کپڑے پلنگ پر ڈال دیئے۔ ایک لمحے کو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ کپڑے تمہیں بھتیانے کی انتہائی محبت کا تحفہ ہیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے یہ کپڑے ٹھنڈے اور کفن کی طرح محسوس ہونے لگے۔ ان کپڑوں میں لپٹا ہوا نیلے ہونٹوں والا ایک چہرہ جھانک رہا تھا۔ اس نے کانپ کر کپڑوں کو سمیٹ لیا اور اپنے کمرے میں جا کر انیس کس میں ٹھونس کر تالا لگا دیا۔ لا حول و لا۔ کیا وہ بھی کبھی بے وقوف ہو سکتی تھی۔ یہ سب اسی تھیلی کے چپے تھے ہیں، مرد کی فطرت تو پارے کی طرح ہی ہڈی سی گرمی ملی اور چڑھ گیا۔ کل چھٹی تھی آج وہ منظور نظر ہو۔ پھر کسی اور کی باری ہوگی۔

جب وہ نیچے گئی تو سب لوگ اندھاری کے نشے میں مست سے بیٹھے تھے۔ کریمین بوڑیاں پکانے میں لگی ہوئی تھیں۔ برآمدے میں کچے بوئے پانگوں پر مٹھی ہوئی بڑی چچی اور اماں پان بنا بنا کر کھا رہی تھیں اور جمیل بھیا اس سردی میں اپنی لوہے کی کرکے پر بیٹھے، اسٹول پر رکھی ہوئی لائین کی روشنی میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ جب زور کی سردی ہوتی تو شام کو یہ کرسی بڑی سوئی سوئی معلوم ہوتی دن پیر میں چچی اس کرسی پر بیٹھ کر دھوپ سنکتی، جاڑا گرمی برسات، یہ کرسی ہمیشہ کھاری کے پاس بڑی رشتہ آست کوئی بھی نہ اٹھاتا۔

عالیہ کو ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ کہیں جمیل بھیا کو سردی نہ لگ جائے۔ اب تو اچھی خاصی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

”اب تمھاری پڑھائی کا کیا حال ہے، امتحان کے تو بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں جمیل بھیا نے اُسے دیکھتے ہی سوال کیا اور اس کے ساتھ برآمدے میں چلے آئے۔

”بس ٹھیک ہی ہے۔“ وہ اماں کے پاس بیٹھ گئی اسے تو بڑی ہی لگتا کہ کہیں جمیل بھیا امتحان نہ لینے لگیں۔ بڑے چچا لاکھ بھینیں اپنی لائبریری کی چابی نہ دیتے۔ پھر بھی وہ جمیل بھیا کی ذہانت کی قابل تھی۔

”میاں تم بھی ذرا عالیہ کی پڑھائی دیکھ لیا کرو۔“ اماں نے کہا۔

”ہاں میں ضرور دیکھوں گا۔“ ویسے تو آجکل میں بھی ایم۔ اے کی تیاری کر رہا ہوں۔ جمیل بھیا نے خوش ہو کر بتایا اور پھر لنگھیوں سے عالیہ کی طرف دیکھا۔

”تھمتی جانے کس وقت اپنے کمرے کی دھانیر پر آکر بیٹھ گئی تھی۔“

”ہاں آجائو تھمتی، سردی ہے۔ اور برآمدے میں بیٹھو۔“ بڑی چچی نے کہا۔

”میں ٹھیک بیٹھی ہوں۔“ تھمتی نے تلخی سے جواب دیا۔

پہلے بھی جنگ ہوئی تھی تو یہاں مہنگائی ہو گئی تھی، مگر وہ تو اور ہی زمانہ تھا، ہمارے

گھروں میں تو پتہ بھی نہ چلا بس پتہ چلا بھی تو اس وقت جب میرا بھائی — " بڑی چچی چپ ہو گئیں اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولنے لگیں — " ان دنوں یہ تمہیں پیدا ہوا تھا جب اس کے ماموں کے مرنے کا خبر آئی تھی — " بڑی چچی نے سب کی طرف دیکھا مگر سب نظریں جھکائے خاموش رہی — " مگر اب تو مہنگائی کا پتہ چل رہا ہے — اب تو وہ حالت بھی — " بڑی چچی چپ ہو گئیں کوپڑے اماں کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئی تھیں — جب بھی بڑی چچی مہنگائی کی بات کرتیں — تو اماں کے ماتھے پر شکنیں گہری ہو جاتیں —

" سب لوگ کھانا کھا لو — نہیں تو ٹھنڈا ہو جائے گا " کوئین بوانے تخت پر دسترخوان بچھا دیا۔ تھمتی جیسے تھپت کر اپنی جگہ سے اٹھی اور لیٹ میں اپنا کھانا نکال کر تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عالیہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ ہائے یہ چھٹی یوں ہی ناراض ہو گئی، کوئی بات ہوتی تو بھر ٹھیک تھا اس کا کیا جی چاہتا ہو کہ چھٹی ایک بار پھر پیٹے جیسی ہو جائے، اب اتنے پیار سے کوئی بھی تو بھیا کہنے والا نہ تھا۔ اس نے بڑی ملامت بھری نظروں سے تمہیں بھیا کی طرف دیکھا مگر وہ جیسے اسی کہ تک رہتے تھے۔ اس نے گھبرا کر نظریں نیچی کر لیں۔ ایک جوڑا کپڑے کالا کر شاید وہ اُسے اپنی ملکیت سمجھنے لگے ہیں۔ اس کا جی چاہا کہ کوئی بہت سخت سی بات بھیا کے منہ پر کھینچ مارے۔

" آخر یہ جنگ بدتی کیوں ہے؟ " بڑی چچی نے تمہیل کی طرف دیکھ کر پوچھی۔ ہر چیز

میں جو وہ تھیلے پیسے کا فرق بڑا تھا۔ اس سے کھانے کا معیار اور بھی گر گیا تھا۔

" ویسے تو آپ آبا کی بڑی حامی ہیں مگر کبھی کبھی کیوں لڑ پڑتی ہیں؟ " تمہیل بھیا نے

اُگٹا سوال کر دیا۔

" اور تم اپنے آبا کے دشمن ہو جاؤ۔ بڑی چچی نے اُلٹی تھونک دی۔

دلچسپ بات صاف ہو گئی۔ جب بھی فائدے پر چوٹ پڑتی ہے یہاں اس میں آگ لگتی ہے

ترجنگ ہوئی ہے، تمہیل بھیا نے جواب دیا۔ وہ تو بالکل اس طرح بات کر رہی تھی۔ جیسے

بڑی چچی دو سال کی بچہ ہوں۔

”چل ہٹ۔ بڑا آیا یوں، ہی بکواس کرتا ہے، کبھی ڈھنگ سے بات نہ کی، ایسی مذاق

کی عادت پڑی ہے۔“ بڑی چچی منہ سے لگیں۔

”فائدے داندے کی کیا بات ہے، تمہیں میاں، بس زمانے زمانے کی بات ہے۔ سب

بدل گیا۔ کر تین بوا کیوں چپ رہتیں۔

”یہ سب تمہارے ابا اور عالیہ کے آبا جیسے لوگوں کے کام ہیں، یہی گڑ بڑ کرتے ہیں

جو جنگ ہوتی ہے۔ اب جو جنگی زردوں کے خلاف ہو رہی ہیں۔ تو جنگ نہ ہوگی؟“ اماں نے

بھی اپنی رائے ظاہر ہی کر دی۔ اور تمہیں بھیا بڑے زور سے ہنسنے۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہی

ہیں منجھلی چچی۔“

”سب کھا چکے ہوں تو مجھے بھی کھانا بھجوادو۔ کر تین بوا۔“ سُنناں بیٹھک سے اسرار

میاں کی مری ہوئی آواز آئی۔

بڑے چچا کی کہیں دعوت تھی بس لیے وہ اپنے مہانوں کے ساتھ جا چکے تھے۔ اور

اب اسرار میاں بسین کی دو پھلکیوں سے ریزہ کھول کر کھانے کے انتظار میں گھل رہے تھے۔

”ذرا صبر سے کام لیا کرو۔ اسرار میاں صاحب، کیا گھر والوں سے پہلے تمہاری کشتی

سجا کر بیچ دیا کروں؟“ کر تین بوانے جھلا کر جواب دیا۔

اس اسرار میاں میں کتنا طنز چھپا تھا۔ کئی مذاق نہ تھے لگا رہا تھا۔ مگر جب بڑے

چچا انہیں اسرار میاں کہتے تو کتنا خاص اور کتنی برابری کا درجہ ہوتا جانے یہ لوگ سب اسرار میاں

کے لیے کچھ سوچتے کیوں نہیں۔

”ہے، اسرار میاں اگر میرا بس چلے تو سب سے پہلے تمہاری کشتی سجا کر لے آؤں“

اس نے دل ہی دل میں کہا اور کھانا ختم کر کے جلدی سے ادھر چلی گئی۔ تمہیں بھیا ایک ماں

اٹھاپٹی نظروں سے دیکھتے جاتے، اُس کا جی ڈوب رہا تھا۔ سکون سے کھانا بھی نہ کھانے دیا۔
اپنے بستر پر آکر اس نے بڑے سکون سے کتابیں سمیٹ لیں اور تکیہ سر کا کر اس طرح لیٹ گئی
کہ کٹلی کے بلب کی روشنی سیدھی کتاب پر پڑ رہی تھی۔

سٹرھیوں پر چا پ ہوئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ جمیل بھیا چلے آ رہے تھے۔ "میں نے
سوچا کہ آج تمہارا امتحان لے ڈالوں۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گئے۔

"مجھے سب آتا ہے، آپ اپنا وقت نہ خراب کریں۔ فیل ہوگئی تو فکر نہیں اگلے سال
پھر سہی۔" عالیہ نے بڑی رکھائی سے کہا۔ جمیل بھیا کی آنکھیں وہ فر فر سبت سنا رہی تھیں جو
وہ پڑھانے آئے تھے۔

"تم کو پڑھا کر میرا وقت خراب ہوگا۔ عالیہ کچھ تو سوچو، ایسی باتیں کر کے تم مجھے کتنا
پریشان کر دیتی ہو۔ اگر تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتیں تو دکھ تو نہ دو۔"
"جمیل بھیا۔" آج تو وہ بھی انھیں تھانڈے پٹل لگی۔ "جب آپ ایسی باتیں کرتے
ہیں تو آپ کو شرم نہیں آتی۔ کیا آپ چھٹی کو بھول گئے، وہ آپ کے ساتھ آپ کے گھر
رہتی ہے۔ مجھے سب معلوم ہے۔"

"چھٹی!" جمیل بھیا نے گردن جھکالی۔ "تم کو معلوم ہے تو اب تھا ہی ہے۔ مگر میں ٹھیک
ٹھیک بتا دوں کہ مجھے چھٹی سے کبھی کبھی ایسی محبت نہ تھی، میں اسے چاہتا ہوں مگر بہن کی
طرح۔ تم کو معلوم ہے کہ آپ نے سیارت کے پیچھے اس گھر کو لٹا دیا۔ مگر میں اپنے کو لٹانے کے
تیار نہ تھا۔ میں نے جانے کس طرح پڑھا کچھ اسرار میاں میرے لیے بچت کر لیتے اور کچھ آدمی
کے چوری چھپے کے روپے کام آتے۔ مگر ایف اے کرنے تک گھر کی حالت بگڑ چکی تھی یہ سارے
انراجات چھٹی نے برداشت کئے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ مگر وہ مجھے غلط سمجھنے لگی اور میں ڈر
کی وجہ سے اُسے سمجھانہ سکا اور۔"

” اور پھر اچانک بنی اسے کرنے کے بعد آپ اس کا مذاق مٹا کر اسے سمجھانے لگے، ”اے نا، تمہیں
 بھیا پر ترس آنے کے باوجود وہ چوکی نہیں۔“

”اب میں کیا کر سکتا ہوں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”اس سے شادی کر لیجئے تمہیں بھیا، وہ آپ سے محبت کرتی ہو۔“

”شادی؟“ وہ جیسے اچھل پڑے۔ ”مجھے معلوم نہ تھا کہ تم مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہو۔“

عالیہ، میں نے تمہارے سو کسی سے محبت نہیں کی، ادھر دیکھو عالیہ، انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ
 تھام لیے اور پھر اس کی گود میں سر رکھ دیا۔

میں آج ہی اپنے مانوں کے گھر جا سکتی ہوں۔ مجھے آپ تمہیں صاحب قبلہ؟ ”دھونس جمانے

کے لیے اور کس کا نام لیتی سبخت بے بسی کا عالم تھا۔“

”تم کہاں جا سکتی ہو عالیہ بیگم۔ آج اماں، کریمین بڑا اور مٹھلی چچی سے کہہ رہی تھیں کہ تم ہمیشہ

اسی گھر میں رہو گی۔“

”کون کہہ رہا تھا، کون ہوتے ہیں وہ سب کہنے والے؟“ عالیہ نے دیوانوں کی طرح تمہیں

بھیا کو دھٹکا دے کر پانگ سے اٹھا دیا۔ ”مجھے کون مجبور کر سکتا ہے۔ میں تمہیں آپا نہیں ہوں

بڑے آگے سب لوگ۔“

تمہیں بھیا نے حیرت سے اس کے لال بھبھوکا چہرے کو دیکھا اور پھر کھسیانے سے ہلکے چپکے

سے مر گئے۔

جب وہ سیرھیاں اتر رہی تھیں تو عالیہ بڑبڑا رہی تھی۔ ”بے کار تک بند ہے بڑے چچا

اپنی لائبریری کی کنجی تک نہیں دیتے۔“

(۲۳)

”کل عید تھی۔ آج تمہیں کے آبا کا منی آرڈر آیا تھا۔ تمہیں بڑے چاؤ سے لباگ کو دستخط

کرنے آئی مگر حسب پانچ روپیہ دیکھے تو اس کا منہ مسرخ ہو گیا کوہن پر لکھا تھا کہ ان روپوں سے
عسید کے کپڑے بنوائے۔ تھمتی نے پانچ کا نوٹ وصول کیا اور بیچ صحون میں کھڑے ہو کر نوٹ کے پزے
پزے کر کے پھینک دیا۔ سب ہا میں ہا میں کرتے رہ گئے۔

راتنے روپوں سے تو ہمارے آبا کی تیسری بیوی صاحبہ کا کفن تک نہ آئے گا۔ جانے لوگ
بچے پیدا ہی کیوں کرتے ہیں، اس سے تو کتے کے پلے لیں، تھمتی پانگہ پر بیٹھ گئی۔

”ارے تھمتی تم پاگل ہو گئی ہو، پانچ روپے میں کتنا اچھا جوڑا بنتا، بڑی چچی نے لپک
کو نوٹ کے پزے اٹھالیے اور اس طرح تھمتی پر رکھنے لگیں جیسے جوڑا ہی ہوں۔

”آپ سے کس نے کہا تھا بولنے کو؟“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”اگر میرے جوڑے کی نکر ہوتی تو پہلے
سے منی آرڈر نہ کرتے؟ اب کیا راتوں رات پر یاں آکر میرے کپڑے سی دیں گی۔ تھمتی پاؤں سُختی اپنے
کمرے میں چلی گئی۔

بڑی چچی نے پھونک، مار کر نوٹ کے پزے اڑا دیے اور چوکی پر بیٹھ کر پانچ ان کھیل لیا۔
کرکین بوا اپنی مانتھتے مانتھتے ہاتھ دھو کر ٹھیس اور نوٹ کے پزے چن کر اپنی میں باندھ لیے
پھر تیلیوں کی کالک صاف کرنے بیٹھ گئیں۔ اشرار سے یہ کاغذ کس کام کے، وہ ہوتے تھے اپنے زمانے
میں کھری چاندی کے روپے۔ سونے کی اشرنیاں اور گنیاں، کوئی انھیں پھاڑتا تو دیکھتے۔“
کرکین بوا بڑ بڑاتی رہی اور عالیہ والان کی محراب کے بیچ میں بیٹھی چپ چاپ سنتی رہی۔ وہ
بار بار تھمتی کے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی جو اب خود کو ایندا پہنچانے کے لیے اتنے لٹ و دوک کمرے میں
تہاڑی جانے کیا کر رہی تھی۔

عالیہ کو تو اس کمرے سے ہوا آتا۔ دادی کے انتقال کو کتنے بہت سے دن گزر گئے مگر اُسے
تو آج تک دادی کی منتظر نظر میں کمرے میں ڈرتی اُبھرتی نظر آتی۔ ان کی تیز تیز سانس اب بھی
سائیں سائیں کرتی محسوس ہوتی اب بھلا تھمتی کو کس طرح منایا جائے۔ وہ سخت بیزار ہو رہی تھی۔ اسے

ظفر چپا کر یہ تھمتھی آپ کی ٹہنی نہیں؟ کیا بیوی کے ساتھ اولاد بھی ہر جاتی ہے۔
 وہ ادھر پر کرے میں چلی گئی اور اپنے کورس کی کتابیں اٹھنے پٹنے لگی۔ لاکھ سرمارا گر پڑھنے میں جی
 نہ لگا۔ بس اسے بار بار تھمتھی کا خیال سارا ہاتھ چمتھی خود کو ایذا پہنچا کر ختم کر لے گی۔

کھڑکی سے باہر اسکول کی عمارت کے پیچھے سورج ڈوب رہا تھا۔ نیچے کی منزل میں اب بڑی
 گھاگھی تھی روزہ انظار نے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ عالیہ نے کتابیں سمیٹ کر تپائی پر رکھ دیں اور
 کھڑکی میں اکر ڈوں بیٹھ کر باہر دیکھنے لگی۔ گنڈیریوں والے کے سر پر رکھے ہوئے عین کے کھال میں پھولوں
 کے گجرے سجے ہوئے تھے۔ وہ گاگا گنڈیریوں بیچ رہا تھا۔ عالیہ کو اس کی اس قدر بھونڈی آواز
 بھی جانے کیوں بڑی اچھی لگ رہی تھی اور اس نے ایک دم محسوس کیا کہ وہ اداس ہو رہی ہے۔ شاید
 اُسے ہمیشہ اداس کر دیتیں جانے کیسی نامعلوم سی کیفیت طاری ہو جاتی۔

وہ کھڑکی سے کود کر نیچے آگئی۔ روزہ کھلنے کا وقت اب بالکل قریب آ گیا تھا۔ وہ کریمین بوا
 کا ہاتھ بٹانے کے خیال سے نیچے گئی۔ کریمین بوا پر اُسے کتنا رحم آتا۔ سارا دن چولہے کی کوکھ میں بیٹھے
 بیٹھے ان کی کمر ٹیڑھی ہو جاتی اس نے کتنی ہی بار سوچا تھا کہ یہ کریمین بوا یہاں سے بھاگ کیوں
 نہیں جاتیں۔ یہاں صرف بچے پڑانے کیڑے اور ردٹی اور حق نکل پر زندگی بتائے دیتی ہیں۔
 اتنی مشقت پر تو انھیں کسی بھی گھر میں بس پندرہ روپے مہینے کی نوکری مل جائے گی۔ محنت کا پھل
 روپیہ ہی تو دیتا ہے، مگر شاید کریمین بوانے تو کبھی خواب میں بھی ایسی باتیں نہ سوچی ہوں گی
 کریمین بوا کس قدر فخر سے کہتیں کہ میری ماں مالکن کے جینر کے ساتھ آئی تھیں۔ مالکن کی خدمت
 کرتے کرتے خدا کو پیاری ہو گئیں اور اب خدا مجھے بھی بڑے میاں کے ہاتھوں سوارت کرے۔
 عالیہ کسی حیران ہوتی ان باتوں پر، اس باتوں پر، اس نے کبھی کریمین بوا کو اس گھر سے
 بیزار ہوتے نہ دیکھا۔ وہ کام سے کبھی نہ تھکتیں۔ بگڑے وقت کے ساتھ ان کا احترام کرنا کا طریقہ
 بھی نہ بگڑا۔ کیا مجال تھی جو کبھی ادنیٰ آواز سے بات کی ہو۔

تخت پر دسترخوان بچھا کر افطاری کا سامان چھپا جا چکا تھا۔ بڑی چچی تلے ہوئے چنوں پر
 لیموں نچڑ رہی تھیں۔ کریمین بوا کو شاید روزہ لگ رہا تھا اس لیے نڈھال سی بیٹھی تھیں۔ بڑے
 چچا برآمدے میں بکھے ہوئے کھڑے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ جیب سے نکلی ہوئی گھڑی سینے پر لٹک رہی تھی اور
 ان کے پاس بیٹھا ہوا شکیل بار بار جھک کر گھڑی دیکھ رہا تھا۔ کچھ دن سے تمہیل بھیانے اس پر سختی شروع
 کر دی تھی۔ اس لیے وہ گھر سے زیادہ دیر خائب نہ رہ پاتا۔

چھٹی اپنے کمرے کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ باجی کی بھٹی ہوئی میٹی گوٹ سے اس کے گئے نظر آرہے
 تھے۔ جب اس نے عالیہ کو دیکھا تو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پاس آگئی اور بغیر کچھ بولے شکیل کے پاس
 بیٹھ گئی۔

باہر بیٹھک میں بڑے چچا کے کئی مہمان براجمان تھے۔ اور اسرار میاں بیٹھک کے دروازے
 سے کئی بار سر نکال کر جھانک چکے تھے۔

کریمین بوا ذرا جلدی سے باہر افطاری بھیج دو۔ روزہ کھانے میں صرف دو منٹ رہ گئے
 ہیں، بڑے چچا نے سینے پر لٹکتی ہوئی گھڑی کو دیکھ کر کہا اور کریمین بوا کو ٹیڑھی کیے کیے اٹھیں اور تخت
 پر رکھی ہدی دو پلیٹیں اٹھا کر بیٹھک کی طرف لکیں۔ اسرار میاں تو جیسے تاک ہی میں تھے جب مہمان
 ہوتے تو ان کے مزے ہو جاتے۔ ورنہ وہ غریب تو روزہ بھی اُس وقت کھوتے جب مکروہ ہو چکا ہوتا
 اماں تخت پر ایک کونے میں اس طرح بیٹھی تھی آلیہ کاٹ رہی تھیں۔ جیسے افطاری پر پہرہ
 دے رہی ہوں۔ گھٹیا کام تو انہوں نے کبھی کیے ہی نہ تھے۔ بس یہی کہ کھانے پینے کی چیزوں کے جھتے
 بخرے کر دیئے یا اسرار میاں کا لایا ہوا سودا سلف دیکھ کر اعتراضات کر دیئے۔ شک و شبہ کے ساتھ
 حساب جوڑ لیا۔

قریب کی مسجد میں گولہ چھوٹا اور بچہ نقارہ بجنے کی تیز آواز آنے لگی۔ تو اماں نے پیٹوں میں
 رکھا ہوا سب کا حصہ بانٹنا شروع کر دیا۔ عالیہ نے تانبے کا منقش جگ اٹھا کر سب کے گلاسوں

میں لمبوں کا شربت بھر دیا۔

چھٹی کی پیٹ یوں ہی بڑی تھی۔ اس نے صرف شربت کے گھونٹ سے روزہ کھول لیا تھا
چھٹی کچھ تو کھالو، خالی پیٹ میں شربت لگے گا، بڑی چچی نے پیٹ اٹھا کر اس کے ہاتھ

میں دی تو اس نے بڑی چچی کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”جب بھوک لگے گی تو خود ہی کھالے گی۔“ اماں نے کہا مگر چھٹی خاموش رہی

”اپنے نوٹ کا دکھ ہو گا نا۔ منہ بھلے چچا نے بھیجا تھا۔ ہنوں نے پھاڑ کر پھینک دیا۔ ہمیں

کو دے دیتیں۔“ شکیل روزہ کھول کر ترنگ میں آچکا تھا۔

”تم جیسے فقیروں کو نہیں دیتی۔“ چھٹی نے تڑ سے جواب دیا۔

”بھئی یہ تو سخت بد زبان لڑکی ہے۔“ بڑے چچا نے گھور کر چھٹی کو دیکھا۔ کسی دن

میں زبان کھینچ لوں گا۔“

”آپ کو تو میں اپنی زبان چھونے بھی نہ دوں گی۔ ہر وقت کافروں کی جماعت میں رہتے

ہیں اور دنیا کو دکھانے کے لیے روزے رکھتے ہیں، بس حد ہے۔“ چھٹی نے نفرت سے ہونٹ سکڑائیے

”بشرم نہیں آتی، کوئی اپنے بڑے چچا سے یوں بات کرتا ہے، کوئی لحاظ پاس نہیں۔“

بڑی چچی نے فوراً ڈانٹا۔ مارے غصے کے منہ سرخ ہو رہا تھا یعنی ان کے سامنے چھٹی ان کے

شوہر سے اس طرح بات کرے۔

”میرے کوئی چچا و چچا نہیں۔“ چھٹی نے سخت بے اعتنائی سے کہا۔

”بھئی تم ٹیپ رہو کیوں اس جاہل کے منہ لگتی ہو۔“ بڑے چچا کا دیکھے سے ٹانگ کر نیم راز

ہو گئے۔“

”ہاں ہمارے کوئی منہ نہ لگے۔ ہم جاہل ہیں، سارے دن کی ڈگریاں کھا جائیں گے اور رکار

بھی نہیں لگے۔“ چھٹی پاؤں پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”چودھویں صدی ہی، گلے سینگ بدلے گی اور قیامت آجائے گی۔“ کریم بواکسی
کو کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں۔ اس لیے انہیں قیامت یاد آ رہی تھی۔

”بھئی صاحبہ ہر بدزبانی کی، گھر میں سا نڈپالا، تم نے بھابھی! اماں نے فوراً بڑی چچی پر
حمایہ کر دیا۔“

”اب دیکھو نارملن، یہ تو اس کے باپ کا قصور ہے، اب کیا پہنے گی یہ بچی؟ جب کوئی
چھتھی کے بیچے پڑنے لگتا تو بڑی چچی فوراً آڑے آ جاتی۔“

ذرا دیر کو سب خاموش ہو گئے۔ بڑے چچا نے آنکھیں موند لیں، شکایت اپنے ہسکول کے
کام میں جٹ گیا۔ کریم بوالا لٹینوں کی چمبیاں صاف کرنے لگیں۔ مگر چھتھی کیسے چپ رہتی
کیڑے نہ بننے کا انتقام ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے اندھیرے کمرے میں اپنی ٹنگ بندیا
کو لہک لہک کر گانے لگی۔

کاشی میں تاسی ہوئی سب بھریاں چرکیں گاندھی تہڑ ماتم کر د کاشی کی میاں گئی

بڑے چچا ایک دم چونک پڑے۔ ”دیکھو اسے منع کر لو۔ باہر مولانا صاحب وغیرہ
بیٹھے ہیں۔ سب کیا کہیں گے۔ ساری آواز باہر جائے گی۔ بڑے چچا غصہ سے سرخ ہو رہے تھے
”چھتھی خدا کے لیے کچھ تو سوچا کر، باہر نہ مان بیٹھے ہیں۔“ بڑی چچی چھتھی کے کمرے
کی طرف لپکیں۔

”آپ کو کیا ہم اپنے کمرے میں گارہی ہیں، سیکرہ ہمارا ہی جب آپ کے کمرے میں
آکر گائیں تو منع کیجئے گا۔ باہر سنتے ہیں تو سس زرا انہیں بھی تو معلوم ہو کہ یہاں سب
کافر نہیں رہتے۔ وہ بڑے چچا کو چڑانے کے لیے پھر گانے لگی۔ کاشی میں تاسی۔“

”اری جاہل پاگل، میں کچھ بولتا نہیں اور تو آپ سے باہر ہی، اب گاندھی طرح بڑے

چچا تیزی سے کمرے کی طرف لپکے۔ ”بیٹھک کا دروازہ بند کر دو، شکایت“ انہوں نے مڑ کر کہا اور پھر

پورے جوش سے بڑے چچا نے تھمی کے منہ پر کئی ہتھپڑا دیے۔ شکلیں دروازہ بند کر کے اس طرف کھڑا تھا۔ جیسے تماشہ دیکھ رہا ہو۔

”کاشی میں تلسی بوی“ تھمی زور سے چنچی۔ ”میں گاؤں گی، گاؤں گی“

”جیب! بڑے چچا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا۔

بڑی چچی ہانپ ہانپ کر اپنے شوہر کو الگ ہٹا رہی تھیں۔ اور عالیہ کمرے کی دہلیز پر کھڑی آنکھیں بھاڑے بڑے چچا کو دیکھ رہی تھی۔ بڑے چچا آج کتنے عجیب طریقہ سے اس گھر میں اپنی اہمیت جا رہے تھے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ ان کے سیاسی عقائد کو ٹھیس لگ رہی تھی۔ اس وقت بڑے چچا سے سیاسی ڈاکو معلوم ہو رہی تھی۔

”غضب خدا کا، جو ان لڑکی پر ہاتھ اٹھاتے ہو۔ بن مال کی بچی پر۔“ بڑی چچی کی آواز بھرا رہی تھی وہ بڑے چچا کو کھینچتی ہوئی کمرے سے باہر لے گئیں تو عالیہ دوڑ کر تھمی کے لپٹ گئی جو پرانی مسہری پر پڑی سسک سسک کر رو رہی تھی۔

”بجیا باہر بھاگ جائے۔“ روتے روتے تھمی ایک دم چپ ہو کر جیسے بڑے سکون سے جیت لیٹ گئی۔

عالیہ باہر آکر برآمدے کی محراب سے ٹنگ کر کھڑی ہو گئی۔

بڑی چچی زار و قطار رو رو کر چپکے چپکے کہہ رہی تھیں ”اب اگر کبھی ہاتھ اٹھایا تو یاد رکھنا اپنی جان دے دوں گی۔ سیرا تو کلیجہ پھٹ گیا، بن مال کی بچی، میں نے اسے پالا ہے، میرے دل میں اس کی ماما ہے“ اس وقت انھیں یہ احساس ہی نہ رہا تھا کہ تھمی غریب تو خود سے بن گئی بڑی چچی اسے پالنا تو چاہتی تھیں مگر پھیروں کاموں کے بلے میں دہن کے بعد انھیں اتنی نصرت ہی کہاں ملتی جو تھمی کو بھی اس کا پیار ہی حق دے سکتیں۔

میں تو خود گھر میں کسی سے نہیں بولتا مگر یہ لڑکی عذاب ہی۔ کل ہی ظفر میاں کو خط لکھتا ہوں

کہ کسی کے ساتھ اس کے دل بول پڑھا کر اس گھر سے یہ لعنت دور کر دو۔ بڑے چچا نے کر ڈٹ لے کر
 آنکھیں بند کر لیں اور بڑی چچی آنسو پونچھ کر پان بنانے لگیں۔ اماں ایسے آرام سے مٹھی تھپتھپاتی
 جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ہنگامے کے بعد کاسٹنا اچھایا ہوا تھا۔ بڑے چچا کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ وہ بار بار
 آنکھیں کھولتے اور بند کر لیتے۔ اسی وقت جمیل بھیا آگئے۔

”سب چپ کیوں ہیں، کل عید ہی بھئی؟“ جمیل بھیا نے عالیہ کی طرف دیکھا جو ادنیٰ
 معلوم ہو رہی تھی۔

”پٹائی ہوئی ہی؟“ شکیل نے جمیل بھیا کی طرف جھک کر کہا۔

”کس کی پٹائی ہوئی ہی۔؟“

”ارے کچھ بھی نہیں، وہی چھٹی کاشی میں تلسی بوی کی رٹ لگا رہی تھی۔ باہر
 مہمان بیٹھے تھے۔ تمہارے آبانے ایک تھپڑ لگا دیا۔“ بڑی چچی نے بات کو ہلکا پھلکا بنا
 کر کہا اور پھر جلدی سے ایک پان کٹے میں ٹھونس لیا۔

”مگر آپ نے اسے مارا کیوں۔ آپ اُسے سمجھا سکتے تھے، اس کی بدتمیزی کو روک

سکتے تھے مگر مارنا کہاں کا اوصاف ہی، وہ اپنے خیال کا اظہار کرتی ہی تو آپ چڑتے

کیوں ہیں، جب آپ لوگوں کو نظریے کی آزادی نہیں دیتے تو اپنا ملک کس طرح آزاد

کراہیں گے۔ اور اگر آپ کا ملک آزاد بھی ہو گیا تو اس آزادی کو کیسے برقرار رکھیں

گے؟“ جمیل بھیا نے بڑے جوش سے ایک ہی سانس میں اتنا کچھ کہہ ڈالا۔

”صاحبزادے تم گھریلو باتوں کو ملکی معاملات سے مت نکرا یا کرو اور نہ زیادہ

قابلیت جھاڑا کرو۔ تم کچھ نہیں جانتے۔“ بڑے چچا نے سخت حقارت سے دیکھ کر پھر

آنکھیں موند لیں۔

”آپ میری تاملت کی بات نہ کیا کریں، آپ نے تو مجھے صرف پرانی ٹھیکری تک بڑھا کر
 گلی ڈنڈا کھینے کو چھوڑ دیا تھا اور پھر ملک آزاد کرانے لگے تھے جیسے میں تو آپ کے ملک کا
 باشندہ تھا ہی نہیں۔ جیسے مجھے تو اچھی زندہ گی گزارنے کا کوئی حق ہی نہ تھا۔ میں نے بی اے
 نہیں کیا ہی لوہے کے چنے چائے ہیں۔ ذرا آپ یہ تو بتائیں کہ جب آپ کو ایک گھر کا خیال
 نہیں تو اتنے بڑے ملک کے اتنے بہت سے گھروں کا کس طرح خیال کریں گے۔ یہ بھی
 خوب رہی کہ ایک گھر کو قربان کر کے دو گھروں کو بچا لو۔“

لا حول ولا کیا بے نیکی تقریر کر کے دماغ چاٹ رہی ہو، میاں آزادی اور قربانی کا
 مفہوم تمہاری سمجھ سے بالا ہی۔ بس اپنی شاعری کر۔ اور داد پاؤ، رگ گلی سے بلبل کے
 پر باندھو اور خوش رہو۔ بڑے سچانے کر ڈٹ لے لی۔

”جی بالکل درست ہو مگر۔۔۔ تمہیں بھیا عالیہ کے سامنے کس طرح ہار مانتے وہ پھر
 کچھ کہنا چاہتے تھے کہ بڑی چچی ماتھا ٹینے لگیں۔۔۔ ہائے میں کہتی ہوں کہ اس گھر کا آدا
 ہی بگڑ گیا ہی۔ حد ہی کہ بیٹے صاحب اپنے باپ سے بحث کر رہی ہیں۔ خدا کی قسم ایک دن
 زہر کھالوں گی۔“ بڑی چچی پر رقت طاری ہونے لگی۔

”بھئی ٹھیک تو کہتا ہو تمہیں۔۔۔ اماں نے تمہیں بھیا کی حمایت کی مگر وہ تو چپ ہو کر بڑی
 بے بسی سے اپنی لوہے کی کرسی پر جا بیٹھے تھے اور ہاتھ مل کر کچھ سوچ رہے تھے۔
 ”دونوں دقت میں رہ رہے ہیں اور یہ لڑائی تھکاڑے، اس ملک کے دکھ نے تو سب کچھ
 تباہ کر دیا۔“ کریمین بوا ہر طرف جلی ہوئی لالٹینیں رکھتی پھر رہی تھیں۔

”بڑے آئے ہمدردی کرنے والے۔“ بھتی جھپا کے سے باہر نکل آئی اور بڑے چچا
 کے پنگ کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ہمیں کون روک سکتا ہے ہاں۔ کاشی میں تلسی بوی سب
 بچیاں جو گئیں۔ وہ زور سے تھنی۔

”لاحول دلا“۔ بڑے چچا بے ساختہ ہنس پڑے۔ ”قطعی پاگل ہی“۔
 بڑے چچا کے ہنسنے ہی شکیل، اماں، بڑی چچی اور تمہیں بھی ہنسنے لگے۔

”ہاں اب ٹھیک ہی“۔ چھٹی تمہیں بھی کیا کی طرف بڑھی۔ تم ہنسو، تم سے کس نے کہا تھا کہ
 میری حمایت کر دو۔ میں تم جیسوں کو منہ نہیں لگاتی، اب میں ان جیسوں سے محبت کر دوں گی۔ خواہ
 مخواہ بی اے کرنے کے لیے میرے سلسلے ناک رگڑتے ہیں“۔ چھٹی بھرا اپنے کمرے میں جانے کے لیے
 مڑ گئی۔ مگر کمرے کی دہلیز پر ہی بیٹھ رہی۔ چند لمحوں کے لیے کیسا سناٹا چھا گیا۔

سب نے جیسے چونک کر تمہیں بھی کیا کی طرف دیکھا، سب سے زیادہ گہری نظریں اماں کی
 تھیں مگر تمہیں بھی بڑی سنجیدگی سے نظریں جھکائے شکیل کی کتاب کے درق اٹ رہی تھے۔
 اور اس سناٹے میں بڑے چچا اس طرح کھنکا رہ رہے تھے۔ جیسے گلے میں کچھ پھنس گیا ہو۔

”آج اُکھوں نے اپنا پانچ روپے کا نوٹ بھی بھاڑ ڈالا۔ مجھے دے دو میں تو میں نمٹوں میں
 اپنے عید کے کپڑے سلوا لیتا۔ اب میں ان کے خط نہیں لے جایا کروں گا“۔ شکیل نے نوٹ پھیننے کی
 اطلاع کے ساتھ ایک ہکشان کر دیا۔

”کہاں لے جاتے تھے خط؟“ اماں نے گھبرا کر پوچھا۔

”تھانہ نیدار کے بیٹے منظور صاحب کو دیتا تھا“۔ شکیل نے چھٹی کی طرف دیکھ کر بڑی

موصوفیت سے کہا۔

”ارے ارے“ اماں اور بڑی چچی اس دھلکے سے خائف ہو کر رہ گئیں۔ سب خاموش

تھے۔ کوئی کسی کی طرف نہ دیکھ رہا تھا۔ کتنی گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

چھٹی اٹھی اور بڑی بے نیازی سے سب کے احساسات پر دراتی زبانی پر بولی۔

عالمیہ نظریں گڑ گڑ کر شکیل کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ اب بڑے چچا چھٹی کا

برا حشر کریں گے۔ گیارہ بارہ سال کا شکیل اُسے بچا پانچویں مرد نظر آ رہا تھا۔

بڑے چچا نے کروٹ بدلی تو عالیہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی اسے ایسا محسوس ہوا کہ بڑے چچا
 چھٹی پر حملہ کرنے کے لیے اٹھ رہے ہیں، مگر بڑے چچا کروٹ لے کر گرم گرم پڑے رہے تو اس نے اطمینان
 کا سانس لیا۔

”بھئی حد ہو بڑے بھیا“ اماں نے سمجھ کر بڑے چچا کی طرف دیکھا۔ کیا پیسے کے ساتھ
 ساتھ اس گھر کی حیا بھی اڑ گئی۔ پہلے بھی اس خاندان میں کیا کچھ نہیں ہو چکا جو اب تھمپی کمی
 پوری کرے گی۔ بار بار اس کا بھر کس نکال دیجئے، ناک چپ چاپ لیٹے ہیں؟
 بڑے چچا اٹھ کر بیٹھ گئے۔ شکلیں مٹیہک سے قلم کا غزلے آؤ۔ میں ظفر میاں کو خط
 لکھ دوں وہ شادی کی اجازت دے دیں تو پھر کوئی لڑکا ڈھونڈھ لوں گا۔
 شکلیں بھاگ کر قلم کا غزلے آیا اور بڑے چچا خط لکھنے بیٹھ گئے۔
 کبا بڑے چچا اپنی بیٹی کی طرح تھمپی کو بھی کہیں ڈھکیں دیں گے۔ عالیہ نے دکھے دکھے
 جی سے پوچھا اور آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں منہ تھپا کر بیٹھ گئی۔
 ”میرا بس چلے تو ہڈیاں توڑ دوں۔ کیا مزے سے تھپا وہ اوپر چلی گئی۔“ اماں برابر سمجھتی
 جا رہی تھیں۔

”واہ سب لوگ عید کا چاند دیکھنا تو بھول ہی گئے؟ شکلیں ہڑبڑا کر پلنگ سے کودا
 اور اسی بہانے باہر بھاگ گیا۔ تمہیں بھیا اس کی طرف سے بالکل بے خبر بیٹھے تھے۔
 دروازہ زور سے کھڑکا۔ نجمہ پھوپھی کا تار تھا۔ وہ کل صبح پہنچ رہی تھیں۔“

(۲۴)

نجمہ پھوپھی اپنے ڈھیروں سامان کے ساتھ آگئیں۔ وہ صرف بڑی چچی سے گلے ملیں
 اور سب کو نظر انداز کر دیا۔

عالمیہ نے اپنے ہوش میں نہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ نچی ہوئی بھویں پہلی تاریخ کے چاند کی طرح
 تیکھی ہو رہی تھیں۔ بٹے بکھرے ہوئے تھے اور میکا آپ کے مارے میلی صورت پہچانی نہ جاتی تھی
 چھٹی سب کچھ بھول گئی تھی اور صبح صبح سنگھار کر کے اپنی اماں مرحومہ کے جہیز کا گلا ہوا جوڑا
 پہن کر بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ تخبہ بھوپھی نے اسے لفٹ نہ دی تھی مگر وہ تھی کہ ان کے
 پاس گھسی جا رہی تھی۔ اُسے پتہ تھا نا کہ اماں اور بڑی چچی تخبہ بھوپھی سے کد رکھتی ہیں۔
 جمیل بھیا اپنے لوہے کی کرسی پر خاموش بیٹھے تھے۔ وہی تو انہیں اسٹیشن لینے گئے تھے بڑے
 چچا تو صبح ہی صبح نماز کے بعد ادھر ہی سے کہیں چلے گئے تھے۔

”تخبہ بھوپھی، گھر میں اور لوگ بھی ہیں۔“ جمیل نے انہیں یاد دلایا۔ شاید انہیں برا لگا
 تھا کہ انہوں نے عالمیہ اور ان کی اماں سے ایک بات بھی نہ کی تھی۔

”دیکھ رہی ہوں بھی، اتنے لمبے سفر سے تھک گئی ہوں، بڑے بھیا کہاں ہیں، وہی اپنی
 سیاست بگھارنے گئے ہوں گے کہیں۔ اور تم عالمیہ، کو کچھ پڑھ رہی ہو کہ نہیں۔“
 ”جی، ایف اے کا امتحان دینے والی ہوں۔“ عالمیہ نے دھیرے سے جواب دیا۔

”خوب! خوب! تخبہ بھوپھی کے چہرے پر سخت ناگواری کے آثار تھے۔“ اور تم جمیل میاں
 کیا کر رہی ہو۔“ انہوں نے جمیل بھیا سے پوچھا۔

”بس بی اے کر کے بیٹھ رہا ہوں۔“ جمیل بھیا نے جواب دیا۔

”واہ صرف بی اے سے کیا ہوتا ہے! آدمی جاہل ہی رہ جاتا ہے، تھوڑی تعلیم خطرناک
 ہوتی ہے۔ کرنا ہے تو ایم اے بی ٹی کرو۔ اب مجھے دیکھو جس کالج میں جاؤں ہا تلوں ہا تھلی
 جاتی ہوں مگر ایم اے بھی کر دو انگلش میں، اُردو ایم اے تو ہر جاہل کر سکتا ہے!
 ”درست ہے۔ میں بھی انگریزی ہی میں ایم اے کر لوں گا۔ کبھی“

”منظر بھیا نے بھی جاکر جانے کون سا تیر مار لیا۔ بس حد ہو بھی، کوئی خطا و طبعی آیا

ان کا کہ نہیں؟ یا شہرِ زندگی کے مارے چپ ہیں؟ مجھے تو ایک خط بھی نہ لکھا۔" نجمہ بھوپھی
 اماں سے مخاطب تھیں مگر اماں اس طرح پان بناتی رہیں کہ جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

عالیہ کا جی کڑھ گیا یعنی ابا کی بہن بھی انہیں مجرم سمجھتی ہیں، اس کا جی چاہا کہ نجمہ بھوپھی
 کی زبان کاٹ لے۔ اچھا ہی ہوا جو اماں نے ان کی بات کا جواب نہ دیا۔

"ارے بھئی تھمتی تم نے بھی کچھ پڑھا لکھا یا نہیں؟ تھمتی کے انتہائی عشق کے اظہار
 پر انہوں نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ تھمتی نے سر مار کر سر جھکا لیا۔ جہالت کے حماس سے
 وہ سخت شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

"اب تو یہیں نوکری کرنی ہی ہے اس لیے بس کل صبح سے تھمتی کو پڑھانا شروع کر دوں
 گی، اب بے چاری جاہل ہی رہ گئی اور کسی نے توجہ نہ دی۔ اس خاندان کی یہی تو نصیبی ہے کہ
 لڑکی پڑھی لکھی نہ نکلی۔ نجمہ بھوپھی نے عالیہ کو بھی جاہلوں میں شمار کر لیا۔ " تو اب تھمتی
 تم میری تولیہ صابن وغیرہ غسل خانے میں تو رکھ آؤ۔ ذرا ہاتھ منھ دھو کر عید منانے
 کی سوچوں!"

نجمہ بھوپھی اٹھیں تو تھمتی پا جانے کی گوٹ سے کھتی غسل نہانے کی طرف بھاگی۔ آج
 بن ٹھن کر تو اس نے جیل بھیا کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے ایک بار بھی ان کی طرف نہ
 دیکھا جیسے ظاہر کر رہی ہو کہ یہ سنگھار تمہارے لیے نہیں، منظور کے لیے ہی۔

کرکمن بوانے نجمہ بھوپھی کے لیے جائے بنا کر بڑے سلیقے سے تخت پر لگا دی اور پھر
 سویاں بجانے میں منہک ہو گئیں۔ عید میں منوں کے حساب سویاں پکتی تھیں۔ مگر اب تو وہ
 دن نہیں رہ گئے۔ اشد بڑے میاں کو عقل دے۔ سب لٹا بیٹھے "دوسیر سوئیوں کا زردہ
 پکاتے ہوئے کرکمن بوا بڑ بڑا رہی تھیں۔

بڑی چچی بولیں؟ تم بھی کپڑے بدل لو۔ عالیہ میری بچی، پھر محلے والیاں آنے جانے لگیں

گی تو دیکھ کر کیا کہیں گی۔ تم نے نئے کپڑے بھی تو نہیں سئے۔

”فرصت ہی نہیں ملی بڑی چچی؟“ اس نے آہستہ سے کہا۔ جمیل بھیا اسے بڑی شاک کی نظر

سے دیکھ رہے تھے۔ ”میں ابھی کپڑے بدل لوں گی۔“

وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تجہہ بھو بھی غسل خانے سے آکر چائے

پینے بیٹھ گئی تھیں۔

زینوں پر چڑھتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا کہ شکیل باپن کھائے اور گلے میں ہار ڈالے

گھر میں داخل ہو رہا تھا مگر سامنے ہی جمیل بھیا کو دیکھ کر اس نے ہار گلے سے نوج کر مٹھی میں چھپا لیے۔

کپڑے تبدیل کر کے عالیہ چپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ جیل میں آبا

کی عید کس طرح آئی ہوگی۔ اس کا جی دکھ رہا تھا۔

”مجھ سے عید نہیں ملو گی عالیہ؟“ جمیل بھیا بھی اوپر آگئے۔

گلی میں بچوں اور سودے والوں نے کتنا اودھم ڈھا رکھا تھا۔ اس نے کھڑکی کے

پٹ بھیر دیئے۔

”پھر؟“

”کھپ کر کیا، عید نہ ملو گی؟“ آج کے دن تو دشمن بھی دشمن سے مل لیتا ہے پھر میں

دشمن تو نہیں ہوں۔“

”میں تو آپ کو کچھ بھی نہیں سمجھتی۔“

”کچھ نہ سمجھنا تو انتہائی ہتک کی بات ہے۔“

”خدا کے لیے جمیل بھیا۔ یہ ٹیڑھی باتیں نہ کیا کیجئے۔ اچھے بھلے انسان بن جائیے

مجھے محبت و جنت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جو مرد عورت ایک دوسرے کو محبت کے دھوکے

دیتے رہتے ہیں اس سے مجھے سخت چڑ ہے۔“

”کیا آباکی لائبریری سے اس موضوع پر کوئی کتاب مل گئی ہے؟“ جمیل بھیانے بڑے طنز سے اس طرف دیکھا۔

ہاں اسی لائبریری سے مل گئی تھی جس کی کنجی آپ کو نہیں دی جاتی۔ وہ زور سے ہنسی۔ جمیل بھیا ایک دم سنجیدہ ہو رہے تھے۔

”عالیہ تم مجھے جتنا ٹھکرا رہی ہو، اتنا ہی تم سے قریب ہوتا جا رہا ہوں۔ اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو میں دنیا میں کچھ نہ کر سکوں گا۔“ جمیل بھیا کا منہ تہتا گیا۔ ان کی آنکھوں سے دکھ چھلکا پڑتا۔ عالیہ نے سر جھکا دیا۔ اس وقت اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اسے جمیل کی نظروں میں پناہ نہ ملی تو جانے کیا ہو جائے گا۔

”اگر میں کسی اور سے محبت کروں تو آپ کیسے گلا۔“

”سب جھوٹ، عورت مرد سے محبت کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتی، روایت کے مطابق پیدا بھی مرد کی لپٹی سے ہوئی ہے۔“ جمیل بھیا جوش میں آگئے۔

”اچھا اب میں سمجھی۔ وہ ایک دم ہنس پڑی۔“ یہ مرد ایسا لے تو عورت کو فریب دیتا ہے کہ اسے حضرت آدم کی لپٹی کا درد یاد آتا ہوگا۔

جمیل بھیا بھی اس کے ساتھ بے ساختہ ہنس پڑے مگر پھر سنجیدہ ہو گئے۔ ”تم میری

ہو عالیہ، میں سچ کہتا ہوں کہ میں زندگی میں سب کچھ کروں گا، میں صفر نہیں ہوں جس نے تمہیں کو ختم کر دیا۔“ پھر وہ جیسے سرگوشی کرنے لگے، ”صفر بمبئی میں ہے، وہ کمیونٹ پارٹی کا

ممبر ہے۔ آج کل جیل میں ہے۔“

عالیہ ذرا دیر کو بالکل چپ ہو گئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے جمیل بھیا کا منہ تک

رہی تھی۔ بتی ہوئی باتیں کس تیزی سے انسان کے دماغ پر چھپٹ پڑتی ہیں۔

”عالیہ، میں اپنی ساری زندگی تمہارے لیے وقف کر دوں گا، یقین کرو عالیہ

کہ میں تمہارے لیے سب کچھ کروں گا۔ لیکن اگر تم نے زندگی کے سفر میں میرا ہاتھ نہ دیا تو میں تھک جاؤں گا۔ میں تو کچھ بھی نہ کر سکوں گا، اس نے غور سے جمیل بھیا کی طرف دیکھا۔ یہ کیسی سڑی سڑی باتیں ہیں، وہی باتیں جو آپا تھینہ کہانیوں میں پڑھ کر مہر گئیں۔ یہ عاشق حضرات کس قدر کٹنی صفت ہوتے ہیں۔ اس نے نظریں جھکالیں بھیا کی آنکھوں کی گہرائی سے کیا عجیب لگتا۔

”تو پھر جمیل بھیا آپ ہی تھک جائیے۔ چائے وغیرہ کا انتظام کراؤں؟“
 وہ زور سے ہنسی۔ بات مذاق میں اڑ جائے تو شاید جان چھوٹے مگر جمیل بھیا پر تو سنجیدگی کا بھوت نازل تھا۔

”دیکھو عالیہ۔“ وہ اس کی طرف جھپٹے اور پھر جم کر کھڑے ہو گئے۔

یہ لیجئے اپنا خط، مسلم لیگ کے دفتر کانپور سے آیا ہے میں نے بڑی چچی کی نظریں بچا کر اڑالیا ہے۔ اسے ہاں خواہ مخواہ بے چاری بڑی چچی اس صدمے سے بھی دو چار ہوتیں۔ عالیہ نے کانپنی کے بیج سے لفافہ نکال کر اس طرح جمیل کے ہاتھ میں لٹکا دیا۔ جیسے کہ بات ختم ہو گئی۔

جمیل بھیا مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔ جس بات کو اتنے دنوں سے چھپائے ہوئے تھے وہ دراکر سامنے آگئی تھی۔ ”اچھا بھئی عید مبارک ہو، اماں سے خط کا ذکر نہ کرنا۔“ وہ جلدی سے چلے گئے۔

تھپی، تنجہ پھوپھی کا بستر بند کھینچ کھینچ کر ادھر پڑے کمرے میں لا رہی تھی اور اس کی اماں مرحومہ کے بری کے جوڑے کی گوٹ پھٹ گئی تھی۔

”تھپی، تنجہ پھوپھی بھی تمہاری اس محبت کی کیا قدر کریں گی، تم مجھ سے کیوں روٹ گئیں؟“ عالیہ نے بڑے پیار سے تھپی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کمرے کے دروازے

بند کر کے کپڑے تبدیل کرنے لگی۔

عید گاہ سے دس ہوتے ہوئے بچے گلی میں بڑے زور سے اودھم مچا رہے تھے۔

”کرمین بوا، منجھلی بھابی اور بڑی بھابھی کو میرا سلام کہو اور عید مبارک بھی!“

سٹرھیوں کو طے کرتے ہوئے عالیہ نے ہسرار میاں کا خوشی سے لرزتا ہوا پیام سنا کیا جی

چاہا کہ آج تو وہ بھی ہسرار میاں کو سلام کرے۔ عید کا دن ہے آج۔

”صبر کرو، تم کو بھی سوئیاں بھجوادوں گی!“ کرمین بوائے اس طرح جواب دیا جیسے مذاق

اڑا رہی ہوں۔

تجملہ پھوپھی، کرمین بوا کو تہواری کا ایک روپیہ دے رہی تھیں۔ انہوں نے عالیہ کی

طرف دیکھا تو وہ اُلٹے پیروں اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

(۲۵)

اتوار کا دن تھا۔ چائے پینے کے بعد بڑے چچا مٹھیک میں جانے کے بجائے اپنے بستر پر

لیٹ گئے کچھ بچے بچے سے نظر آ رہے تھے۔ عالیہ ان کے پاس جاٹھی بڑے چچا کو اس طرح دیکھ کر

بے چین ہو گئی تھی۔ ”ہی بے چارے بڑے چچا، کوئی ان کی پروا نہیں کرتا۔ اگر بڑی چچی اس گھر میں

نہ ہوتی تو سب انہیں بھون کھاتے جو اٹھتا ہے اپنی تکلیفوں کا رونا روتا ہے کوئی ان کی تکلیفوں

کو نہیں پوچھتا اور یہ ہیں کہ سب کچھ سے جاتے ہیں اپنی سگی بہن کس طرح شرمندہ کرتی ہے۔

صرف اس لیے کہ اپنے کھانے کے روپے دینا پڑتے ہیں وہ یہ بھول گئیں کہ کبھی بڑے چچا کے

روپوں سے ہی تعلیم حاصل کی تھی۔

”پڑھائی کا کیا حال ہے بیٹیا؟“

”ٹھیک ہے بڑے چچا، آپ کی طبیعت تو خراب نہیں؟“ وہ بھرے بھرے جی سے

بولتی چلی گئی۔ آپ اپنی صحت کی ذرا فکر نہیں کرتے۔ آپ کتنے کمزور ہو رہے ہیں، انسان کچھ اپنے لیے بھی تو کرتا ہے۔

”ایں بیٹیا میں تو ٹھیک ہوں۔“ بڑے چچا حیران ہو کر سائلہ کا منہ تک رہے تھے۔ ارے کیا کوئی میری فکر کرنے والا بھی ہے، کیا کسی کو مجھ سے بھی ہمدردی ہو سکتی ہے۔ میں تو اس گھر کا بھوت ہوں جو سب کچھ کھا گیا۔

بڑے چچا کی آنکھوں میں اس نے دکھ کی وہ مدھم سی تحریر پڑھ لی جسے چھپانے کے لیے وہ خواہ مخواہ ہنس رہے تھے۔

”واہ ری بگلی، مجھے آرام کی کیا ضرورت ہے، ہٹا کٹا ہوں، خواہ مخواہ فکر کرتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ میری لائبریری سے کتا میں پڑھتی ہو کہ نہیں؟“
 پڑھتی تھی بڑے چچا مگر اب امتحان سر رہے ہیں۔ اس لیے سب چھوڑ بیٹھی ہوں۔“
 ”تمہارے جیسے ذہن کی لڑکی کے لیے یہ کتا میں پڑھنا ضروری ہے۔“ بڑے چچا حیرت سے خوش ہوتے تو اپنی لائبریری کی کتابیں پڑھنے کی نصیحت شروع کر دیتے۔

”بڑے چچا جب آزادی مل جائے گی تو پھر کیا ہوگا؟“ اس نے سخت بے وقوفی کے ساتھ بڑے چچا کی دل سپند باتیں پھینکنا چاہیں۔ بڑے چچا کے سامنے اس نے سیاست سے نفرت کا کبھی اظہار نہ کیا تھا۔

”آزادی مل جائے تو پھر کیا رہ جاتا ہے۔ مرنا اور حبلیا دونوں آسان ہو جاتے ہیں دعا کرو کہ میں غلامی کے دور میں نہ مروں۔“

”بڑے چچا خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔“ اس نے دل ہمدل میں دعا کی۔
 گھروں کی اتنی ساری تباہیوں اور بربادیوں کو دیکھنے کے بعد بھی وہ اپنے آبا اور بڑے چچا سے نفرت نہ کر سکتی تھی۔

صدر دروازے کی زنجیر بڑے زور سے کھڑکی تو وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔
 دھڑکھڑ جاؤ، تم مست جاؤ۔ میں دیکھ لوں گا۔ بڑے چچا باہر جا کر فوراً ہی پلٹ آئے
 بڑی چچی برآمدے میں سخت پر مٹھی ڈالیا سامنے رکھے پالک کے پتے چن رہی تھیں۔ بڑے چچا
 ان کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ "میرا بلاوا آ گیا ہے۔ ان کی پیشانی پر ہلکی سی فکر تھی۔

"کہاں کا؟"

"انگریز بہادر کا، چار چھ مہینے بعد واپس آ جاؤں گا۔ تم میرا سامان ٹھیک کر دو؟"
 عالیہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ بڑی چچی ڈالیا پھینک کر ایک دم اٹھ پڑیں
 کر تھیں بوا میلے برتنوں کے ڈھیر سے اٹھریں اور ٹکڑے ٹکڑے سب کا منہ کھینچ لگیں۔
 بڑی چچی کمرے میں جا کر بڑے چچا کے کپڑے کس میں ٹھونسنے لگیں "بھلا ان سب
 حرام زادوں کا کیا بگاڑا ہو کسی نے جو روز بروز پڑتے ہیں، کیا کر لیں گے پوچھ کر، بھلا کسی
 کی زبان بھی بند کی ہو کسی نے؟" بڑی چچی اماں کی طرف دیکھ کر کہہ رہی تھیں، اور اماں
 اس نئی مصیبت پر چچا کو ذمے دار ٹھہراتے ہوئے سخت حقارت سے دیکھ رہی تھیں۔ بڑے
 بھیا اب تو توبہ کر لو۔ اپنا گھرا اپنے بچے سنبھالو۔ سب تباہ ہو گیا۔ اماں نے نصیحت کی۔
 مگر بڑے چچا کچھ نہ بولے۔ برآمدے کے کونے میں کھڑی ہوئی تھیں اٹھا کر ایک ہاتھ میں
 سوٹ کپس تھام لیا؟

"کیا ساری زندگی اسی لیے مصیبت پھیلی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ توبہ کر لیں، بھلا کیا پورا
 کام کرتے ہیں؟" بڑی چچی غصہ اور غم سے رو پڑیں۔

زنجیر زور سے کھڑکی اور بڑے چچا دروازے کی طرف لپکے "اپنی بڑی چچی کو سمجھانا
 بیٹی۔ چھٹی کے رشتے کی بات کی تھی۔ شاید ادھر سے جواب آئے تو فیصلہ کر لینا۔"
 عالیہ کی بیٹی پر ہاتھ پھیر کر وہ باہر نکل گئی۔

بڑے چچا باہر چلے گئے، کھلے دروازوں سے سناٹا دراتا ہوا اندر داخل ہو گیا وہ بیچ میں کھڑی رہ گئی۔ سامنے گلی میں بڑے چچا آٹھ آدمیوں کے ساتھ چلے جا رہے تھے آٹھ آدمیوں میں بیچ میں گھرے ہوئے بڑے چچا اُسے بالکل دولہا سے نظر آ رہے تھے پر یہ کیسی برات تھی کہ کلیجہ مسلا جاتا تھا۔

بڑی چچی نے پاک کی ٹوکری پھراٹھالی تھی۔ کریمین بوا پھر برتنوں کے انبار تلے کھو گئی تھیں۔ نل سے بہتی ہوئی تیلی سی دھار کا سا پانی کیا ریلوں میں جا رہا تھا۔ گیندے کے پھول ہلکی سی ہوا میں ڈول رہے تھے۔ رارے اُس نے ایک پھول ہی بڑے چچا کو توڑ کر دے دیا ہوتا، بہار کا تحفہ مگر اب تو وقت گزر چکا تھا۔

بڑی چچی اپنے میاں کے جیل جانے کی تفصیلیں سنا کر گرفتار کرنے والوں کے ہاتھ ٹوٹنے کی دعائیں کر رہی تھیں۔ عالیہ کو حیرت ہو رہی تھی کہ نہ تو بڑی چچی رو رہی تھیں نہ سینہ کوٹ رہی تھیں جبکہ اس کا دل ہلا جاتا تھا اُسے اپنے آبا کی گرفتاری کا وقت یاد آ رہا تھا۔ شاید بڑی چچی کو حیل اور پولیس کے مطالب ہی نہیں معلوم تھے، اُس کے بچپن کے حانظلے میں ایک قصہ اب تک محفوظ تھا۔ ایک بار دینو کے کو اڑنے میں پولیس کے دو سپاہی آگئے تھے۔ تو ان پھپھیوں کی پوری آبادی خون سے گھردوں میں تھپ گئی تھی۔ اور عورتیں ماتم کر کے رونے لگی تھیں۔ تو کیا بڑی چچی پر ذرا بھی دہشت طاری نہیں ہوئی۔ کیا انہیں کچھ بھی نہیں معلوم۔

دُھوپ ادنیٰ ادنیٰ دیواروں سے اتر کر صحن میں رنگ گئی تھی۔

”مجھ پر ان قصوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا بڑی بھابھی“ اماں بڑے جوش سے کہہ رہی تھیں۔ ”اگر آپ بڑے بھیا کو ان کی حرکتوں سے روکتیں تو آج لاکھ لاکھ خاک نہ ہوتا۔ آپ تو ان کی حمایت کر کے ہت بڑھاتی ہیں۔ بس حد ہی“

عالیہ صحن میں بڑی ہوئی لوہے کی کرسی پر اس طرح بیٹھ گئی جیسے اُسے کسی نے گرا دیا ہو۔ بڑی چچی نے اماں کو کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔

”دُلہن، بڑی چچی دھیرے، دھیرے بولنے لگیں، ”تم نے منظر میاں پر سختی

کی تھی تو کیا ہوا؟ کوئی کسی کے شوق پر پابندی نہیں لگا سکتا۔ سب تھیل گئی، اب اٹھ کرے

گا تو تھیل سکے دے گا۔ تمہارے بڑے بھتیہ کے ساتھ تو ساری جوانی یوں ہی گزر گئی، اُنھیں

تو اس کا بھی دقت نہ ملا کہ بیوی کو نظر بھر کر ہی دیکھ لیتے۔“ بڑی چچی ایک دم روٹ پڑیں

تو اماں نے گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔ ”اٹھ میاں تو ہی اس گنہگار کا بیٹا پار لگانے والا ہی۔

قربان تیری شان کے، تو جو چاہے کر دے“ کریمین بوانے آہ بھری۔

”کریمین بوا اگر — بیٹھک سے اسرار میاں کی مری سی آواز آئی اور کریمین بوا

بیچ ہی میں چنچ پڑیں۔“ ایک دن چائے نہ پیو گے تو کیا جان نکل جائے گی، بیچارے

کو اپنی چائے کی بڑی ہی ہے۔“ کریمین بوانے اسرار میاں کے حشفے کی چائے نالی میں اٹھ دیا

”مردود، سبز قدم، یہ یہاں سے نہیں جائے گا“

”کریمین بوا، میں کہہ رہا تھا کہ اظہر بھائی کا سامان نہ گیا ہو تو میں ہینچا دوں؟“

”سب چلا گیا ہے۔“ کریمین بوا جو لھے کے پاس جھاڑو دینے لگیں۔

تو یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کے ذمے دار صرف اسرار میاں ہیں۔ گنا ہوں کی

برسات سے پیدا ہونے والے کیرے جلدی سے کیوں نہیں مر جاتے؟ اسرار میاں اب

تم دو بجے تک آرام سے بھوکے پھر دو، عالیہ کرسی سے اٹھ کر جلدی سے اوپر چلی گئی۔

اماں اور کریمین بوا کی موجودگی میں وہ اسرار میاں کے لیے چائے تو بنا نہیں سکتی تھی۔

پھر یہاں مٹھنے کا کیا نائدہ۔

دن کے دُرج گئے۔ گلی کے اس پار ایک اُچڑے سے درخت سے آلو کے بولنے

کی آواز آرہی تھی اور یہ آواز اس کے ذہن کے سنائے کو اور بھی بڑھائے چلی جا رہی تھی
 مگر ظالم بھوک تھی کہ دراتی چلی آرہی تھی۔ چاہے صدرے سے دماغ پھٹ جائے مگر بھوک
 نہیں رکتی یعنی کہ آج وہ بڑے چچا کے جل جانے کے غم میں صدرے سے جواب نہیں پاسکتی۔
 وہ بستر سے اٹھ کر نیچے چلی گئی۔ تخت پر بیٹھیں لگی ہوئی تھیں۔ اماں نل کے پاس
 بیٹھی پان کھوک کر مسخ کلتیاں کر رہی تھیں۔ اور بڑی چچی دسترخوان کے پاس بیٹھی
 جیسے ادنگھ رہی تھیں۔ چھٹی اور سخمہ بھوپھی صبح سے بازار گئی تھیں اور اب تک وہاں
 نہ آئی تھیں۔

”کھا لو، سب کا کہاں تک انتظار کروں؟“ بڑی چچی نے کہا اور وہ ان کے پاس
 بیٹھ گئی۔ اتنے میں تمہیں بھیا بھی شکیل کر گھسیٹے آگئے اور جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے
 شکیل پر تھپڑ بڑھانے لگے۔

”یہ کچھ نہیں پڑھتا لکھتا، سارا دن آوارہ گھومتا رہتا ہے، میں نے ابھی ابھی
 اسے سخت لفنگوں کے ساتھ گھومتے دیکھا ہے۔“
 ”اور ماہر بد ذات کو۔“ بڑی چچی نے جل کر کہا۔ ”جب یہ حالت ہے تو
 اس گھر کو کون سنبھالے گا۔“

”انہیں کی کتابوں سے تو پڑھتا ہوں۔“ شکیل بھیا کے دار روکنے کے لیے ادھر
 ادھر بچ رہا تھا۔ اور عالیہ کو سجات طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
 ”بس بھی کیجئے تمہیں بھیا۔ اب نہیں گھومے گا۔“ عالیہ نے سفارش کی تو تمہیں بھیا الگ ہو گئے
 اور نل کے نیچے ہاتھ دھونے لگے۔

”ارے ارے کیوں بچاتی ہو، یہ کبھی نہیں ٹھیک ہوگا۔ میں یوں ہی تڑپ تڑپ کر رہ جاؤں
 گی، ان کا ٹھکانہ تو جیل میں ہے۔“

”کیا آبا بھیر گئے۔“ تمہیں بتایا تھا وہ تھوڑا ہونا بھول گئے۔

”اور نہیں تو کیا آج نوبے کے قریب پولیس آکر لے گئی، اٹھ سے تو بہرے بس! اماں

نے فوراً جواب دیا۔

”خوب تمہیں بتایا تھا وہ تھوڑا ہونے لگے۔“ یہ کانگریسی لیڈر تو جیسے جیل جانے بغیر

کچھ کر ہی نہیں سکتے، خالص ہندوؤں کی جماعت کے لیے اتنی قربانیاں دے کر جانے انہیں
کیا مل جائے گا، کس قدر ہندو طبیعت ہے ان صاحب کی بھی، کیسے کیسے ہندو مسلم فساد ہونے

مگر ان پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔

”شرم نہیں آتی اپنے باپ کو ہندو کہتے، وہ ہندو تھے تم کہاں سے مسلمان پیدا

ہو گئے۔ بڑی چچی مارے غصے کے آپ سے باہر ہو گئیں یعنی ان کے شوہر کو ہندو کہاجائے
جبکہ انھوں نے ہندوؤں کے تہواروں میں آئے ہوئے حصوں کو چکھنا تاکہ نہیں کبھی۔ عدوا

ایسی عورت کا شوہر ہندو ہو سکتا ہے۔؟

”اچھا بھئی کٹر ہندو نہ سہی مسلمان سہی مگر۔“ تمہیں بتایا کھیا کر منہ سے لگے

کھانا یوں ہی پڑا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

”اب تم سنبھالو نا گھر کو، کیا سیری موت کا انتظار کر رہی ہو؟ بڑی چچی کھانا بھی

چین سے نہ کھا رہی تھیں۔

”میں۔ میں۔ بس اب ہی سوچ رہا ہوں۔“ تمہیں بتایا بوکھلا گئے تھے

”دو چار دن میں لاہور جا رہا ہوں۔ وہاں سے آکر نوکری کر لوں گا۔“ وہ کچھ سوچ سوچ

کر کھار رہی تھے۔ ذرا دیر کے لیے خاموشی چھپا گئی۔

نجمہ بھوپھی اور تھپی بندلوں سے لدی پھنڈی اندر داخل ہوئیں تو خاموشی ٹوٹ گئی

”ارے شکمیل ذرا تانگے والے کو یہ رو پیہ ٹرا کر دے دو۔“ نجمہ بھوپھی نے پرس سے

رد پیہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ شکیل اب تک صحن میں لوہے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اسے کھانے کے لیے بھی کسی نے نہ پوچھا تھا۔

”پہلے ہاتھ دھو کر کھانا کھا لو۔“ بڑی چچی نے کہا، مگر تجربہ بھو بھی تو بندل کھول کر سب کو دکھانے کے لیے بہ تاب تھیں۔

”حد ہی بھئی بہر کپڑے پر دم بڑھا دیے ہیں۔ اب بھلا کوئی بتائے کہ یہ ریشمی کپڑا کیا گوردوں کے کفن کے لیے جاتا ہے۔ تجربہ بھو بھی نے داد طلب نظروں سے سب کی طرف دیکھا مگر یہاں تو سب اپنے غم میں مبتلا تھے۔ چچی کو ان کی بات پر بڑے زور سے ہنسی آئی۔

”تم لاہور جا کر کیا کر دگے؟ کیا وہاں ملازمت کرنے کا ارادہ ہے؟“ بڑی چچی نے جمیل بھیا کی طرف دیکھا۔

وہاں سُلّم لیگ کا ایک زبردست جلسہ ہے۔ ذرا اس میں شریک ہوں گا۔ جمیل بھیا جانے کیا سوچتے ہوئے بولے۔

”کیا کہا؟ جلسہ؟“ بڑی چچی اپنی جگہ سے اٹھیں پڑیں۔ ”ارے تو بھی؟“ تجربہ پر بھی جوگ سادھا تھا تو اب تو بھی؟“ بڑی چچی دیوانوں کی طرح جمیل بھیا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا کہ اٹھیں کر گردن دو بوجھیں گی۔

”بس حد ہی، اس گھر کا خدایا ہی مالک ہے۔“ اماں نے بھی ہاتھ کا نوالہ رکھ دیا تھا عالیہ کو ٹھکانے لگانے کی اُسید نے شاید دم توڑ دیا تھا اور جمیل بھیا تھے کہ چپ چاپ بیٹھے گردن جھکائے کھائے جا رہے تھے۔ تیر جو کمان سے نکل چکا تھا۔

”اگر تو نے اس سیاست بازی کو اپنا یا تو جان دے دوں گی، زہر کھالوں گی ایک ایک دن، میری زندگی تڑپ تڑپ کر گزری ہے، اب میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے سب کچھ چاہیے باولے، تو سیاست میں نہیں جاسکتا۔“ بڑی چچی کی دیوانگی کم ہو رہی

تھی۔ جمیل بھیا کھانا دانا بھول کر اپنی اماں کے گلے میں ہاتھ ڈالے، تنس رہے تھے، بھئی
بس بھی کیجئے اماں!

بچہ بھوپو بھی نے کپڑے کے بندل سمیٹ کر پلنگ پر ڈال دیے کوئی کہنت دیکھتا ہی نہ تھا
جان حل کر رہ گئی۔ کریم بونے سینے میں کھانا لگا کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہیں بندلوں
کے ڈھیر کے پاس بیٹھ کر بڑی بے دلی سے کھانے لگیں۔ ان کے چہرے سے نفرت برس رہی تھی
مگر چھٹی آج بڑی مارت کے بعد جمیل بھیا کو بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔

”میں نہ کہتی تھی کہ ہر مسلمان مسلم لیگ میں شامل ہو، مسلم لیگ زندہ باد“ چھٹی نے نعرہ بھی
لگا دیا۔ مگر اس وقت کسی نے اس کی خوشی اور نعرے کی پرہانہ کی، بڑی چچی جو ہاتھوں سے نکلی جا رہی
تھیں۔ زرد کر ان کی آنکھیں سُرخ پڑ گئی تھیں۔ جمیل بھیا انھیں تھپک رہے تھے۔ پانی پیا رہا
تھے مگر ان کی دیوانی آنکھوں میں ذرا بھی ٹھہراؤ نہ پیدا ہو رہا تھا۔

عالیہ سیران نظروں سے بڑی چچی کو دیکھ رہی تھی۔ ارے کیا یہ وہی بڑی چچی ہیں
جنھوں نے اتنے برسوں تک بڑے چچا کی سیاسی زندگی میں ساتھ دیا تھا۔ بڑے چچا کی حمایت میں
سب سے آگے آگے رہیں، لیکن جب اپنا جی جلا تو انھیں جلی کٹی سنا ڈالیں مگر کسی دوسرے
کی زبان سے ایک لفظ نہ سنا۔ بڑے چچا جو بھی کرتے رہے اسے اپنے سر سے گزارتی رہیں
اور آج صبح تک وہ تھکنے کے بجائے گرفتار کرنے والوں کو کوس رہی تھیں۔ کیا یہ صبر و ضبط
اس لیے تھا کہ انھوں نے اپنی ساری امیدیں اور آرزوئیں جمیل بھیا کے گلے میں ہار بنا کر
ڈال دی تھیں۔

”اماں اب آپ دیکھیے گا کہ میں کسی ٹھٹھاٹ کی نوکری کرتا ہوں، آپ کو چاندی کے
تخت پر بٹھا دوں گا۔ اور بس آپ کا یہی کام ہو گا کہ پان کھاتی رہیں اور میری دلہن
آپ کے پان دھو دھو کر لاتی رہی۔“ جمیل بھیا خدمت کے وعدوں کے ساتھ ساتھ

اپنی اماں کو ہنسانے کی کوشش کر رہی تھی مگر جانے کیوں نکالیہ نے بلین کے نام بیان کی آنکھوں کو اپنی طرف اٹھتا دیکھ کر نظریں جھکالی تھیں۔

”واہ کوئی یوں تو کرمی مل جاتی ہو۔ چاندی کے تخت ایسے نہیں ملا کرتے نہ کوئی ٹرننگ، نہ انگریزی میں ایم اے“ سنجہ بھوپھی بڑی حقارت سے بولیں۔ اور چھٹی کو بھر ہنسی آنے لگی۔ وہ سنجہ بھوپھی کے ساتھ بڑے فخر سے کھانا کھا رہی تھی۔

”ہونہہ! مجھے تو مارتے تھے، اب دیکھئے کہ بیٹیا بھی لگی ہو گی۔“ چھٹی کو بڑے چچا کی ماری یاد آگئی تھی۔ اس وقت کسی کو بڑی چچی سے ہمدردی نہ ہو رہی تھی۔

”ایم اے پاس کچھ نہیں جانتے اماں، مجھے بڑی ٹھٹھ کی نوکری ملے گی۔“

جمیل بھیا نے یہ ہوادار کیا۔

سنجہ بھوپھی سبلا اٹھیں۔ ”خدا کی شان ہو۔ اب ایسے ایسے لوگ ایم اے پاس کو جاہل کہیں۔ سچ ہو کھوڑی تعلیم خطرناک ہوتی ہو۔ اب ایسے لوگ بے چارے سیاست میں حصہ نہ لیں تو کیا کریں۔ بڑے بھیا نے بھی تو تیر مار لیا۔ اور بے چارے کرتے بھی کیا۔“ سنجہ بھوپھی نے کھانا چھوڑ کر سبڈل سمیٹ لیے۔ وہ جانے کتنی بار بڑے چچا پر طنز کر چکی تھیں۔ ان کے عربی و فارسی داں ہونے کی پھبتی اڑائی تھی۔ کسی بار کہا تھا کہ جب کوئی ڈگری لینے کی صلاحیت نہ ہو تو لوگ عربی و فارسی پڑھتے ہیں۔

”سنجہ بھوپھی۔ آج صبح نو بجے آپ کے بڑے بھیا جیل جا چکے ہیں۔ جب وہ

آئیں تو آپ ان سے پوچھ لیجئے گا کہ مارا ہوا تیر کہاں لگا ہو۔“ جمیل بھیا نے مڑ کر سنجہ بھوپھی کو دیکھا۔ ایک لمحے کو ان کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ ”ہے بڑے بھیا پھر چیلے گئے!، سنجہ بھوپھی نے سر ہٹام لیا۔ اس گٹر کی کسی بدنامی ہو رہی ہے، جسے

دیکھو جیل کاٹ رہا ہے۔“

جہیں بھیا کی تھپکیاں بڑی چچی کو پرسکون کر چکی تھیں اور اب وہ مگر کچھ تجربہ بھو بھی اور جسمیل
کو لڑتے دیکھ رہی تھیں۔

اب کسی نے بھی تجربہ بھو بھی کو جواب تک نہ دیا وہ اپنے کپڑوں کے بندل چھتی پر لدا کر اوپر
اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

تجربہ بھو بھی کے جاتے ہی ایک بار پھر سناٹا مچا گیا۔ عالیہ نے دیکھا کہ جسمیل بھیا اپنی
اماں سے لپٹ کر میٹھے ہوئے بڑے اچھے لگ رہے تھے اور بیکریں اب تک تانگے کا کرایہ ادا کر کے
نہ آیا تھا۔ عالیہ اس سناٹے میں جھپکے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

(۲۶)

جہیں بھیا کو لانا ہو گئے چوتھا دن تھا۔ ان کے جانے سے پہلے بڑی چچی کی حالت دیکھنے کے
قابل تھی بس جیسے ان سے کچھ بن نہ پڑا تھا کہ اس مصیبت سے کس طرح خود کو بچائیں۔ جسمیل بھیا
چلے گئے اور وہ کچھ بھی نہ کر سکیں۔

جہیں بھیا کے جاتے ہی اخباروں کی خبریں آنکھیں دکھانے لگیں۔ — اخبار فرودش کلیجہ پھاڑ
پھاڑ کر جھینے رہتے۔ پولیس اور خاکساروں کے درمیان تصادم — کتنے ہی خاکسار گولیوں
کا نشانہ بن گئے۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں رکاوٹ کا امکان؟

بڑی چچی اخبار فرودشوں کی آوازوں پر دل تھام تھام لیتیں۔ عالیہ انھیں ہر طرح تسلی دیتی
تھیں کہ جسمیل بھیا تو لگی ہیں، خاکسار نہیں، مگر بڑی چچی کسی طرح چین نہ لیتیں۔ چھٹی بھی
ایک دم خاموش رہنے لگی تھی وہ صبح صبح جا کر محلے سے اخبار مانگ لاتی اور بڑے انہماک سے
پڑھ کر گھنٹوں اپنے بستر پر اوندھی بڑی رہتی۔ جب سے بڑے چچا گئے تھے اخبار آنا بھی تو
بند ہو گیا تھا۔ اب اس مد پر خرچ کرنے کے لیے کس کے پاس پیسے رکھے تھے۔ چھٹی اگر

مہربانی کے موڈ میں ہوتی تو مانگنا ہوا اخبار پڑھنے کو دے دیتی اور بڑی چچی موٹے شیشوں کی
 رنگ لگا کر پڑھایا کرتیں۔ ویسے تو وہ کسی کو بھی اخبار چھپانے تک نہ دیتی۔ "پرایا ہی کھپتے جا بیٹا"
 ان دنوں چھٹی نے پڑھنا لکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ تجربہ بھوپھی لاکھ کہیں مگر وہ کتاب اٹھا کر نہ
 دیتی۔ درنہ اس سے پہلے تو یہ حال تھا کہ تجربہ بھوپھی کا دیا ہوا سبق گھنٹوں ٹھہل ٹھہل کر یاد کیا
 کرتی اور عالیہ کو اس طرح دکھتی جیسے کہہ رہی ہو کہ تم سے آگے نکل کر نہ دکھاؤں تو میرا نام
 چھٹی نہیں۔

کانج سے آنے کے بعد تجربہ بھوپھی بڑے خخرے سے چند لفظ پڑھاتیں اور بدلے میں
 اسے ڈھیروں کام بتا دیتیں۔ سبق یاد کرنے کے بعد بس یہی کام رہ جاتے۔ ابھی کپڑوں پر
 استری ہو رہی ہی۔ تو ابھی سینڈلین پالش سے چمکائی جا رہی ہیں۔ ڈو پٹے رنگ رنگ کر اتنے
 بار یک جینتی کہ انگوٹھے اور انگلیاں تھل کر رہ جاتیں۔
 میں اب ایک لونڈا کام کے لیے رکھ لوں گی۔ تجربہ بھوپھی اسے اتنا کام کرتے دیکھ کر ادھری
 دل سے کہا کرتیں۔

"بیٹے بھائی میں کس کام کے لیے ہوں، واہ اب میں آپ سے نہیں بولوں گی۔" چھٹی مارے
 خلوص کے تجربہ بھوپھی کے لپٹ جاتی۔ اور وہ منال ہو کر اسی وقت کوئی اور کام بتا دیتیں۔
 سچے دن گزر گئے۔ تمہیل بھیا نہیں آئے۔ بڑی چچی تڑپتی تڑپتی پھر رہی تھیں۔ اور اماں اُن کی
 اس بے حسینی پر سمجھ بھرا ٹھٹھیں۔ "ارے بڑے بھائی کیوں اپنی جان جلاتی ہیں، بیٹا بھی
 باپ کے نقش قدم پر چلے گا۔ بس اب اس سے بھی ہاتھ دھولیں۔"
 "مجھے تو اس کے سارے میں بیٹھنا ہی۔" بڑی چچی سے زندگی کی حیل پلاتی دھوپ اب برداشت
 نہ ہو رہی تھی۔

بڑی چچی نے یہ چھپراتیں سچا لہ کاٹ کر گزاری تھیں۔ جب برآمدے سے کس کس کی آوازیں

آج تو عاکیہ اپنے بستر پر کر ڈیں بدلنے لگتی۔ رات کا سناٹا اور گہرا ہو جاتا۔ بڑی چچی کے لیے اس کا دل کھرنے لگتا۔ یہ سب کیا ہے۔ یہ کون سا جذبہ ہے جو اپنے پیاروں کو دکھ کی کھٹی میں جلنے کے لیے جھوڑ دیتا ہے۔

قرارداد لاہور منظور ہو گئی۔ آٹھ کر ڈر مسلمان اپنا حق لے کر رہیں گے۔ صبح سڑک کے سڑک کے اخبار فرڈش حنیچا کھا گتا جا رہا تھا۔ اخبار والے، اخبار والے۔ کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانک جھانک کر لوگ آدازیں دے رہے تھے۔ آج اخبار خریدنے میں سارا محکمہ پیش پیش تھا۔

عالیہ نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ صبح کی سی نکھری ہوئی تھی۔ کان میں جینیو ڈالے اور ہاتھ میں پتیل کی جھپاتی لٹیا کر پڑے کوئی شخص بڑک کے گل پر نہانے کے لیے جا رہا تھا۔ اب یہ ہنا کر پو جا کرے گا۔ ہاتھ جوڑ کر بھگوان کی سورتی کے سامنے جھک جائے گا۔ یہ ہندو پو جا کہتے ہوئے اتنے خوبصورت کیوں معلوم ہوتے ہیں۔ اسے ایک دم کمر دیدی یاد آگئیں۔

نچلی منزل میں جانے کے لیے جب اس نے تہہ پھوپھی کے کمرے کو طے کیا تو کسی نے اس کی طرف دیکھا تاکہ نہیں۔ تہہ پھوپھی کا راج جانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں اور تھمپی ہانڈی کی طرح انھیں چیزیں اٹھا اٹھا کر دے رہی تھی۔ "اللہ کرے تہہ پھوپھی تم کو پڑھا ہی وہی تھمپی" عاکیہ نے دل ہی دل میں دعا کی۔ چند لفظ پڑھنے کا کتنا سخت معاملہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ غریب تھمپی کو۔

جائے تیار تھی۔ کریمین بوا گرم گرم گھی چھری روٹیاں توڑے سے اتار رہی تھیں وہ آٹا اور بڑی چچی کے پاس تخت پر بیٹھ کر چائے پینے لگیں۔ اب تک سو رہا تھا اسکول جانے سے چند منٹ پہلے اٹھتا، وہ بھی ادھر کچھ دنوں سے بڑی چچی اسے زبردستی اٹھاتیں ابھی چائے ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ صدر دروازے کی زنجیر زور سے کھڑکی۔

اور کریمین بوا بو کھلا کر ادھر لپکیں۔

جیل بھیا کا تار تھا۔ وہ خیریت سے تھے۔ اور جلد آرہے تھے۔ بڑی چچی نے تار کے کاغذ کو جھپٹ کر پاندان کی کلھیا میں پھپھایا اور مارے خوشی کے چائے کی دوسری پیالی بنالی۔

اس وقت کریمین بوا کسی آن دکھی طاقت کی بلائیں لے کر پھر سے روٹیاں پکانے لگیں۔ اس گھر کی ہر خوشی اور ہر غم ان کا اپنا تھا۔

عالمیہ ناستہ کر کے بیٹھک میں آگئی۔ جب سے بڑے چچا جیل گئے تھے۔ اس نے پہلی بار بیٹھک میں قدم رکھا تھا۔ میز کرسیوں اور کتابوں کے شیشے دھول میں اٹے ہوئے تھے گا ندھی جی کی بڑی سی تصویر دھندلی ہو رہی تھی۔ تخت کی چاندنی اور گادنگیوں کے غلاف میلے ہو گئے تھے۔ اسرار میاں کی بیڑیوں کے جلے ہوئے ٹکڑے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ماری کا پلو کمر میں کھوس کر وہ کمرہ صاف کرنے لگی اور پھر فرش جھاڑ کر وہ گادنگیوں سے ٹک کر تخت پر بیٹھ گئی۔ اسے بار بار ایسا لگتا جیسے ابھی ابھی دروازہ کھلے گا اور بڑے چچا اندر آجائیں گے۔ بڑے چچا نے جیل خانے کے بعد اسے شط بھی لکھا تھا۔ کہ وہ بہت خوش ہیں سرکار کی روٹیوں میں ایسا مزہ ہی جیسے کریمین بوا کے ہاتھ کے پراٹھے کھا رہا ہوں۔ بڑے چچا کا فرے دار خط یاد کرنے کے باوجود اسے بیٹھک بڑی سونی لگ رہی تھی۔ وہ الماری سے ایک کتاب نکال کر باہر آگئی۔

تخمہ بھو بھو کالج جا چکی تھیں اور چھٹی ساج کئی دن بعد اپنا سبق یاد کرتے ہوئے پورے صحن میں ٹہل رہی تھی۔

بڑی چچی نے دن جہک کر گزارا۔ رات کو بڑی چچی کے سردے کی آواز جلدی سے سو گئی عالمیہ بڑے سکون سے رات کے ایک بجے تک پڑھا کی۔

امتحان ختم ہو گئے تھے۔ اب وہ کچھ عرصے چھٹی منانا جا رہی تھی۔ وہ کس قدر ہنسا گئی تھی۔ لڑکھانے کی کتابوں سے جی اکتا گیا تھا۔ اب وہ راتوں اور دوپہروں کو بڑے چچا کی ٹائبریا سے لائی ہوئی کتابیں پڑھتی رہتی۔ سارا دن گرم گرم لو چلتی رہتی اور اسکول کے درختوں سے آلو کے بولنے کی آواز آتی رہتی۔ اتنی لمبی لمبی دوپہروں کاٹے نہ کھتیں۔ پتا ہوا ماحول کسی طرح چین نہ لینے دیتا۔ اگر بڑے چچا کی کتابیں نہ ہوتیں تو اتنی لمبی دوپہر میں پانگ پڑ کر ادھر ادھر کی باتیں سوچتے سوچتے دماغ خراب ہو جاتا۔ ادھر امتحان کے نتیجے کی فکر۔ اسے تو فیمل ہونے کے خیال ہی سے خوف آتا۔ اگر وہ فیمل ہو گئی تو تجھ بھو بھی کو اس کی دامنی جہالت پر ذرا بھی شک نہ رہے گا۔ ویسے بھی وہ اس پر انکھ پھینکتی رہتیں۔ "گھر بیٹھ کر امتحان دینا بھی کس قدر آسان بنا لیا، لوگوں نے۔ ہم جیوں نے تو کاجول اور یونیورسٹیوں میں جھک ماری تھی۔ بس ایک پندرہ روپیہ مہینے کا ہسٹر رکھ کر کام کی باتیں رٹ لیں۔"

ان ساری شاندار باتوں کے بعد بھی وہ چھٹی کو گھر میں پڑھائے چلی جاتی تھیں۔ اور کئی مہینے گزارنے کے بعد بھی چھٹی کا دوسرا قاعدہ ختم نہ ہوا تھا۔ جمیل بھیا نے ان دنوں مولیٰ سی ملازمت کر لی تھی۔ وہ سارے کے سارے روپے بڑی چچی کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے اور گھر میں بس جینے کا سامان ہوا تھا جمیل بھیا کا باقی وقت مسلم لیگ کی حمایت میں گزر جاتا۔ عالیہ تو اب ان کے سائے سے بھی بھاگتی مگر وہ سایہ تو لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ محبت کی دھوپ چڑھتی جا رہی تھی۔

آج آبا کا خط آیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ وہ اس کے نتیجے کے منتظر ہیں۔ اچھے

اور ہٹے کٹے ہیں۔ کبھی کبھی اختلاج کی تکلیف ہو جاتی ہے۔ جو شاید گرمی کی وجہ سے شروع ہوئی ہے۔ جیل کا ڈاکٹر دوا دے رہا ہے جس سے قطعی فائدہ ہو گیا ہے۔

اماں اس خط کو سن کر ذرا دیر کے لیے نکر مند ہو گئی تھیں اور وہ تو اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے بڑی دیر تک روتی رہی تھیں۔ وہ تو اپنے آبا کی بیماری کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی نہ کہ وہ حقیقتاً بیمار پڑ جائیں اور وہ بھی اس کی نظروں سے دُور۔ جیل کی کوٹھری میں۔

جون کے آخری دن کس قدر گرم تھے۔ دو پہروں میں غضب کا سناٹا چھایا رہتا۔ سووے والوں تک کی آواز نہ سنائی دیتی مگر چھٹی پران دو پہروں میں پڑھنے کا بھوت سوار تھا۔ جیسے اس نے اپنے جی میں ٹھکان لی کہ یا تو پڑھ لکھ کر فاضل بن گئے یا پھر جاہل ہی رہ گئے۔ اتنی محنت کے بعد بھی اس کا دوسرا قاعدہ ختم ہونے کو نہ آ رہا تھا۔ لکھتے لکھتے انگلیاں بندھ جاتیں۔ سارا سبق ایک ہی سانس میں اٹکے بغیر سنا دیتی۔ پرتخبہ بھوپو بھی کے اعتراض ختم نہ ہوتے۔

اس وقت بھی چھٹی کو جا ہیوں پر جا ہیاں آ رہی تھیں مگر وہ ڈھیٹ بنی زور زور سے سبق یاد کیے چلی جا رہی تھی۔ کسی کسی وقت ادھ بھڑے دروازوں سے عالیہ کی طرف بھی دیکھ لیتی۔

پڑھتے پڑھتے تھک کر چھٹی نے کتاب مینر پر رکھ دی۔ "پرتخبہ بھوپو سارا قاعدہ تو یاد ہو گیا ہے، اب تمیر شروع کرادیں نا؟"

"ابھی نہیں، میں جس طرح پڑھاؤں۔ اسی طرح پڑھو، یہ اُردو نہیں کہ ہر جاہل پڑھ لیتا ہے، یہ انگریزی ہی ہے۔" پرتخبہ بھوپو بھی ایک دم برہم ہو گئیں۔

"اب ہمیں نہیں پڑھنا ہے۔ یہ قاعدہ کبھی نہ ختم ہوگا، ہونہہ! بڑی آئیں پڑھانے"

والی - جیسے ہم بے وقوف ہیں۔ اپنے کام کے لیے نوکر رکھ لیجئے، سنجہ بھوپھی ہمیں تو اللہ میاں نے پیدا ہی جاہل کیا ہے۔“ چھٹی نے کتاب کا پنی اور قلم اور پر اُچھال دیئے۔

”اری کیا بگواس کرتی ہو چھٹی، بھئی جاہلوں کو بھانا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ اگر پہلا دوسرا

قاعدہ کمزور رہ گیا تو پھر آگے پڑھنا مشکل ہوتا ہے جلدی سے پڑھو، کل تمہارے لیے

تیسرا قاعدہ لے آؤں گی۔“ سنجہ بھوپھی گڑ بڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ بے دام کا غلام ہاتھوں

سے نکلا جا رہا تھا۔

”بس بھئی اگر ہم قابل ہو گئے تو آپ جاہل کسے کہیں گی۔“ چھٹی پاؤں ٹنختی نیچے

چلی گئی۔

”حد ہی بھئی، اس خاندان کی جہالت کبھی نہ جائے گی، کوئی تو اس لائق نہیں

کہ بات کر کے جی خوش ہو۔“ سنجہ بھوپھی اپنے آپ سے کہہ رہی تھیں۔

عالیہ نے اٹھ کر اپنے کمرے کے دروازے زور سے بند کر لیے۔ ارے سنجہ بھوپھی

میں آپ کو خوب جانتی ہوں۔“ وہ بڑ بڑائی اور پھر کتاب لے کر لیٹ گئی۔

آج تو ایک دم آسمان پر بادل چھانے لگے تھے کھڑکی سے ہوا کا ایک بھینگا بھینگا

ٹھنڈا جھونکا آیا تو وہ کتاب رکھ کر سو گئی۔ گرمیوں کی ساری دوپہر میں جاگ کر اتر پ

گرگزار ہی تھیں۔ یہاں تو پھتوں پر کپڑے اور چٹائیوں کا پنکھا بھی نہ لگا تھا۔ پھر یہاں

کون سے نوکر لگے تھے جو ساری دوپہر پنکھا کھینچتے۔

چھٹی نے جب سے پڑھنا شروع کیا تھا اپنے علی و بی بی آگئی تھی۔ گھر میں طوفان

برپا رہتا۔ ہر ایک سے لڑتی یا پھر بقیہ اڑھ کر محلے میں غائب رہتی۔ سب اس سے

تالاں تھے مگر اماں کو تو اس کی صورت سے نفرت ہو گئی تھی۔ اللہ جانے شادی کا

پیغام دینے والے کہاں مر گئے۔

”جھپتی میں تم کو پڑھایا کروں؟“ — بہت دن بعد عالیہ اس کے کمرے میں گئی تھی۔ دادی کی سوئی سہری پر نظر پڑتے ہی اس کا جی دکھنے لگا تھا۔

”جھپتی صاحب آپ سے ناراض ہو جائیں گے پھر“ جھپتی نے زور سے تہہ لگایا

”خدا کے واسطے جھپتی ایسی باتیں تو نہ کیا کرو“

”اچھا تو پھر بیایے، میں خود ان کا منحوس نام لینا پسند نہیں کرتی منظور کے سامنے اب کوئی نہیں چپتا، اللہ قسم کتنا چاہتا ہے مجھے“ — جھپتی نے زور سے مزے سے آنکھیں بند کر لیں۔

جھپتی کوئی مرد کسی سے محبت نہیں کرنا۔ اپنے آپ سے محبت کرنا۔ واہ اچھی بچا پڑھواتی ہیں جھپتی بھائیوں ہی آپ کے پیچھے دیوانے پھرتے ہیں۔ یہی تو ایک محبت ہوتی ہے دنیا میں، جہت تک چلے چلے نہ چلے تو کھیل ختم یہی مضم۔ لو اپنے آپ سے محبت کرو۔ کچھ دن بعد آپ کہیں گی کہ اپنے آبا ادران تمام گھڑیوں سے محبت کر دیا باپ بھائیوں وغیرہ کی محبت کچھ نہیں ہوتی۔ سب الو کے الو ہوتے ہیں۔ کینے۔

عالیہ جھپتی کو لا علاج سمجھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی، کمرے میں انور کمال پاشا کی ایک تصویر اور اس سال کے کیلنڈر کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جانے کس نے دیئے تھے اسے۔

وہ چپکے سے اٹھ کر چلی آئی جھپتی نے اسے بیٹھنے کو بھیانہ کہا۔ ابھی وہ صحن سے کھڑی تھی کہ سنجہ کھو بھی جھپتی کے کمرے میں جاتے ہوئے اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچیں بخت بوکھلائی ہوئی تھیں۔ — ہوا اتنی بڑھی لکھی عورت کے کام سے ایک جاہل بڑکی نے نے ہاتھ اٹھالیا۔ عالیہ کو ہنسی آرہی تھی۔

جھپتی نہ مننا تھی نہ منی۔ اور اب سنجہ کھو بھی خود ہی کانکھ کانکھ کر اپنی ساریوں پرستری کرتی۔ کونٹے دھکاتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آجاتے اور سینڈ لوں پر پالش کرتے ہوئے قسمت کی ساری لکیریں سیاہ پڑ جاتیں۔

”سنجہ کھو کو تو فکر ہی نہیں کہ کسی کے ساتھ اپنی اس مٹی کے دو بول پڑھا دیں۔

کون سے ایم لے تلاش کرنے ہیں، جیسے بڑے بھتیانے اپنی ساجرہ کی شادی کر دی۔ "نجمہ
 بھوپھی کا بس چلتا تو تھمپی کی ایسی جاگہ شادی کر میں کہ پانی تک نصیب نہ ہوتا، کسی کر بلا میں بٹھکیں دیتیں
 کم بخت کو تاکہ پیاسی مر جاتی۔

"پہلے آپ کیجئے اپنی شادی نجمہ بھوپھی، بڑھا پا کر ہاں ہے۔" جو اب میں تھمپی ان کا کلیجہ نوچنے کی
 کی کوشش کرتی۔

"ہو نہہ! مجھے کس بات کی کمی ہے۔ لوگ ناک رگڑیں گے۔ تجھے تو پندرہ روپے مہینے کا سپاہی
 بھی نہ جڑے گا۔"

تھمپی انھیں جلانے کے لیے ہی ہی منہتی۔ "سپاہی مل گیا تو میں سب سے پہلے نجمہ بھوپھی
 کو پکڑا دوں گی؟"

نجمہ بھوپھی تننا کر اپنے کمرے میں بھاگتیں، بھلا تھمپی جیسی جاہل کے منہ کون لگتا۔
 گھر میں طوفان اٹھانے کے بعد تھمپی برقع اور ڈھکر مٹلے میں گھروں گھروں گھومنے کے لیے نکل
 جاتی اور حبیب واپس آتی تو سخت جوش میں بھری ہوتی۔ سارے قصے نر فرسنانے شروع کر دیتی۔
 "ہے وہ کتو کی اماں کا لڑکا تھانا، وہ مزدوروں کی کسی جماعت میں چلا گیا، وہ جماعت انڈر گراؤنڈ
 رہتی ہے۔ اشدوہ زمین کے اندر کیسے رہتے ہوں گے؟ تھمپی کو نجمہ بھوپھی سے سُن کر اور بڑھ کر
 ابتدائی انگریزی کے چند مطلب تو معلوم ہو ہی گئے تھے۔ جن کا وہ لفظ بہ لفظ ترجمہ کر لیتی۔

شہ بے چاری بوہ "بڑی چچی ٹھنڈی آہ بھر میں۔" "جھبی تو اس بتیا کی ماری نے
 بہت دنوں سے ادھر آنا بھی تھوڑا دیا، ویسے تو سال بھر مہینے میں نکل ہی آتی تھیں؟"

"اور بڑی چچی، وہ محمود کی ماں بے چاری بلک بلک کر رو رہی تھی۔ محمود جنگ پر چلا گیا

کیا سو تھی سہم زادے کو کہ ان کا بھی خیال نہ کیا؟"

"ہو ہو کیا حال ہو گا دکھیا کا؟"

”ہوں،“ خبریں سناتے سناتے جانے کیوں چھٹی کا موڈ خراب ہو جاتا ” میں نے کہا کہ وہ آپ کا لاڈلا پوتہ جو رات دن آوارہ گھومتا رہتا ہی، اُسے کیوں نہیں بھیج دیتیں جنگ پڑ کینہ کل جانے کس دقت میرے تکیے کے نیچے سے اتنی نکال لے گیا۔ ہاتھ ٹوٹیں اس شکل کے خدا کرے“

بڑی چچی ایسے صبر سے ہونٹ سی لیتیں کہ حیرت ہوتی۔ ایک وہی تو تھیں جو چھٹی کی ہر اچھی بڑی بات برداشت کر لیتیں۔ کبھی روکھ کر نہ بھٹھیں۔ چھٹی جب ان سے جواب نہ پاتی تو منہ لپیٹ کر اپنے کمرے میں پڑ رہتی۔

(۲۸)

آج گھر میں سخت دھوم مچی تھی۔ اسرار میاں نے تڑکے چائے کا مطالبہ کر دیا تھا مگر آج کرکین بوانے بھی ان کی اس سخت ناجائز حرکت پر معاف کر دیا تھا۔ آج زندگی میں شاید پہلی بار کرکین بوانے انھیں سب سے پہلے چائے کی کشتی بگڑادی تھی۔

آج صبح آٹھ بجے بڑے چچا الہ آباد جیل سے رہا ہو کر اسٹیشن پہنچ رہے تھے۔ بڑی چچی کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ سوتے ہوئے جمیل بھیا کو بار بار بھنچوڑ رہی تھیں کہ وہ بھی باپ کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر جائیں مگر جمیل بھیا نے ہر بار کوئی بہانہ تراش دیا۔ وہ رات بادلوں کی گرج کی وجہ سے سوئے نہیں۔ سر میں درد ہی۔ آج تو دفتر بھی نہیں جاسکتے۔ کچھ حرارت بھی ہو رہی ہے۔

اور جب اسٹیشن جانے کا وقت نکل گیا تو جمیل بھیا بڑی تیزی سے اٹھے چائے پی اور فٹ کپڑے تبدیل کر کے دفتر بھاگ لیے۔

”شکیل میرے بھیا، چارہ مار تو لا دو بڑے چچا کے لیے“۔ عالیہ نے شکیل کے

ہاتھ پر دونی رکھ دی۔ وہ کچھ خوش نظر نہ آ رہا تھا باپ سے کوئی واسطہ ہو نہ ہو پھر بھی
باہندی تو محسوس ہوتی ہی۔

» ایک میں کچھیں ہار میرے لیے بھی لیتے آنا کہیں سے مانگ کر شکیل بڑا تیر مار کر
آ رہی ہیں بڑے چچا، پھمتی کھی کھی سنسنے لگی اور اد پر کرے کی دہلیز کے کنڈے میں پڑے رستے
کی جھولے پر جا بیٹھی اور لمبے لمبے پیٹا لینے لگی، یہ سب لاسادن میں پڑا تھا جسے آج تک نہ
اتارا گیا۔

» بوائے ڈولار رکھ دے مسافر آئی سادن کی بہار سے — وہ سب کو چڑھا
کر گاہ رہی تھی۔

شکیل باہر چلا گیا۔ کریمین بوا بڑے چچا پر سے خیرات کرنے کے لیے ڈلیا میں سو اسیر
گیہوں تول کر رکھ رہی تھیں۔

افوہ! بڑے چچا سے کس طرح ملا جائے گا۔ عالیہ سوچ رہی تھی اور مارے خوشی کے
آن کا ذل بتیوں اٹھل رہا تھا۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے میں آگئی اور کھڑکی میں بیٹھ کر گلی میں
جھانکنے لگی۔ وقت کتنی سستی سے گزر رہا تھا۔ ایک دن آبا بھی اسی طرح آجائیں گے۔ اس نے
سوچا اور غم کی ایک ٹھیس اس کے کھجے کو چھلنی کر گئی — مگر ابھی تو پانچ سال باقی ہیں۔

سامنے سے ایک سادھو بابا جسم پر بھجوت ملے۔ سُرخ لنگوٹ باندھے اور ہاتھ میں چٹا
پکڑے آ رہی تھے۔ بھکشادے بچے تیری سب مرادیں پوری ہوں گی۔ سادھو بابا دروازے پر
کھڑے تھے۔

» معاف کرو بابا، کریمین بوانے باہر جھانک کر جلدی سے سر اندر کر لیا۔ » یہ بھی نہیں
دیکھتے کہ کس کا گھر ہے۔ رنگ دھڑنگ سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کجنت — کریمین
بوانے زور سے کہا اور سننے لگیں۔

”ارے کرمین بوا بڑے چچا کی خیرات تو کسی ہندو ہی کو دو“۔ تھمتی نے فوراً شور مچا دیا اور پھر گلنے لگی۔ ”اپنے محل میں گڑیاں کھیلت تھی، تیاں نے بیٹھے کہا رے“۔

”اللہ بھلا کرے“ اور سر فقیر بوٹے بوٹے موتیوں کی مالا گلے میں ڈالے دردازے پر اکھڑا ہوا۔ کرمین بوانے ہاتھ بڑھا کر ادھنا پکڑا دیا۔ ”تھوڑی دیر بعد آ کر خیرات بھی لے جانا باجی“ کرمین بوانے کہا۔ جب سے جنگ چھڑی تھی فقیر کتنے بڑھتے جا رہے تھے۔

بچی گلی میں تانگے کے پیوں کی کھڑکھڑاہٹ بوری تھی بڑے چچا آرہے تھے۔ سب سے آگے وہ ہار پہنے بیٹھے تھے ان کے ساتھ اسرار میاں اور پیچھے ان کے دو مین دوست تھے۔

”بڑے چچا آگئے ہیں“۔ عالیہ نے چیخ کر سارے گھر کو اطلاع دی کرمین بوا گیہوں کی ڈلیا اٹھا کر دردازے پر کھڑی ہو گئیں۔ تھمتی جھولے سے اتر کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شکلیں کہاں ہو اللہ، اب وہ بڑے چچا کو کیا پہنائے گی۔ آج پہلی دفعہ اُسے شکلیں کی بے ایمانی پر غصہ آ رہا تھا۔

بڑے چچا نے اندر قدم رکھا تو سب سے پہلے کرمین بوانے گیہوں کی ڈلیا ان کے ہاتھ سے چھوڑی اور پھر دعاؤں دینے لگیں۔ بڑے چچا نے سب کی طرف ایک فاتح کی نظروں سے دیکھا۔

”تم اب بی اے کی تیاری کر رہا ہو؟“ بڑے چچا نے پوچھا۔

”جی بڑے چچا۔ میں نے شکلیں سے ہار منگائے تھے، وہ اب تک نہیں آیا، میں بھی تو آپ کو

ہار پہنائی“

”ہاں، جھبی شکلیں نظر نہیں آ رہا ہو، کیا سو وہ؟“ بڑے چچا نے جیسے رسوا پوچھا۔ وہ چوکی پر بیٹھ کر

جوتے اتار رہے تھے، کرمین بوانے تانبے کے بڑے سے بوٹے میں مٹھ دھونے کے لیے پانی بھر کر رکھ دیا تھا۔ خاکہ انہیں چپکے چپکے دیکھ رہی تھی۔ بڑے چچا سے کتنے کمزور نظر آ رہے تھے۔ تو نہ گھٹ گئی تھی۔

اور دائرے میں آدھے سے زیادہ سفید بال نظر آ رہے تھے۔

”تمہارا بیٹا رات کو بارہ بجے آتا ہے یا پھر ساری رات غائب رہتا ہے۔ نہ بڑھتا ہے نہ اکتھتا ہے، تم کو کیا، تم تو جیل جا کر سب بھول جاتے ہو۔ اور یہاں رہتے ہو تو بھی سب گانے لگتے ہو۔ اور تو اندر تمہارا بڑا بیٹا بھی سلم لیگ کے حلیوں میں شریک ہونے لگا ہے۔ بڑی چچی نے ساری شکایتیں کوکے ہی سانس لی۔ بڑے چچا تو سخت شرمندہ نظر آ رہے تھے۔ یا آخری بات پر ایک دم چونک پڑے ”خوب! خوب! صاحبزادے سلم لیگی بن گئے۔“ بڑے چچا ایک ذرا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئے رات بھر کے سفر نے نڈھال کر دیا تھا۔

”اب اپنے صاحبزادے کا کچھ بگاڑ لیجئے تو جانوں! چھٹی نے اپنے کمرے سے نکل کر وہیں دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ سلام کیے بغیر ہی اس نے بڑے چچا سے انتقام لینا شروع کر دیا عالیہ کا جی چاہا کہ اس وقت وہ بڑے چچا کو کہیں چھپا دے۔ اس وقت تو کوئی ان سے کچھ نہ کہے۔ اس وقت تو کوئی پرانی باتیں نہ یاد دلائے۔ کتنی مدت بعد وہ اپنے گھر آئے ہیں جیل نے انہیں تو ڈر دیا۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

ارے تم کیسی ہو چھٹی؟ بڑے چچا نے مسکرا کر اس کے طنز کو سہ لیا اور چھٹی حلیے جلیلا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”ارے بڑے بھتیجا اس چھٹی چڑیل کے رشتے والے کہاں مر گئے، پورے چار مہینے ہو گئے انتظار کرتے کرتے“ اماں ان کے پاس بیٹھ کر پیالی میں چائے انڈیلنے لگیں۔

ابھی چائے کی پیالی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ بیٹھک کے دروازے کی زنجیر کھڑکنے لگی بڑے چچا باہر دستوں میں چلے گئے اور عالیہ ان کے پاس بیٹھ کر ان سے ڈھیر سی باتیں کرنے کو ترستی رہ گئی۔ وہ تو ان سے اس وقت بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ ان کے اس کا زمانے کو سلنا چاہتی تھی۔ گھر میں سب ان کے لیے بے چین تھے مگر کسی نے بھی ان کا سواگت نہ کیا۔ تمہیں بھتیجا بیمار ہو گئے۔ چھٹی تیر چلا گئی۔ اور بڑی چچی شکایتوں کا دفتر

کھول کر بیٹھ گئیں۔ ہر بڑے چچا آپ کو کیا مل گیا ہے۔ یہ سب کر کے۔ یہ جو آپ نے ملک کا جوگ سا دھ
 لیا ہے تو تباہیوں اور بربادیوں کے سوا کیا ہے اور۔ گھر والے تک عزت نہیں کرتے۔ کاش اس
 وقت تو سب خوش ہو کر انھیں سراہتے۔ کاش۔۔

(۲۹)

شام سے کھڑپنا شروع ہو گئی تھی۔ کرمین بوا کھانا پکاتے ہوئے چلے کی کوکھ میں سمائی
 جا رہی تھیں۔ عالیہ کو ڈر لگنے لگا کہ کہیں ان کے کپڑوں میں آگ نہ لگ جائے، ذرا میں بھین کر راکھ
 ہو جائیں گی، دیے بھی اب انھیں سمجھائی کم دیتا ہے۔ "کرمین بوا ذرا چوڑھے سے سرک کر بیٹھو"
 عالیہ نے بے چین ہو کر کہا۔

ایک جان رہ گئی، وہ بھی جل جائے، نصیب تو پہلے ہی جل چکے، عالیہ میا اسی گھر میں
 جاؤر کے دنوں میں اپنے ہاتھوں سے منوں لکڑی پھونک دیتے تھے، ارے یہ دالان جو ٹھنڈا
 پڑا ہی پہلے آگ کی طرح پتا تھا۔ اب کوئی آگ بھی ہو چوڑھے میں بیٹیا، دو تو لکڑیاں لگی ہیں بھلا
 اتنے میں کیا جلاؤ گی۔؟ کچھ دنوں سے کرمین بوا بڑی کھجی کھجی اور ہر اسال نظر آنے
 لگی تھیں۔ بیتا زمانہ انھیں بہت شرت سے ستانے لگا تھا۔ اتنی تقریر کے بعد بھی وہ چپ
 نہ رہیں آہستہ آہستہ بڑ بڑانے لگیں۔ اللہ مارا سب کچھ جلوں جلوں کی نذر ہو گیا،
 سب کھا گئے موٹی تو ندوں والے، نو بھلا کوئی پوچھے گھر پھونک کر بھی کسی کو آزادی ملی ہے
 اللہ ہریت دے بڑے میاں کو۔"

بڑی چچی اور اماں سخت پریشان تھیں۔ ان کے سامنے مٹی کی کنڈالی میں انگارے
 رکھے ہوئے تھے۔ جن پر اب راکھ جم چکی تھی، وہ دونوں بار بار اپنے ہاتھوں کو سینک رہی تھیں
 بڑی چچی نے ایک لمبی آہ بھری اور سخت کے ایک کونے پر رکھی، موٹی لائٹن کی بتی

کو ذرا سا اونچا کر دیا۔ لالٹین میں شاید تیل کم تھا بستی بار بار نیچی ہو رہی تھی۔ ہر چیز سنبھال
 سنبھال کر کم سے کم خرچ کی جاتی۔ جنگ کو کئی سال ہو گئے تھے، ہنگامی نے اس گھر کو
 بالکل ہی لوٹ لیا تھا۔ سب پریشان رہتے۔ کھانے کو جیسے تیسے مل جاتا تو تن کو کپڑا نہ جڑتا
 تھیل کھیا کی چھوٹی سی تنخواہ اس گھر کے لیے دال میں نمک کے برابر تھی مگر بڑے چچا کی دکان کی
 آمدنی پھر بھی اس گھر میں نہ آتی۔ وہ سب باہر ہی باہر اڑ جاتی۔ بڑی چچی ہر وقت جسمیل کھیا
 کی جان کھاتیں کہ کچھ اور کرو۔ مگر وہ بھی تو ملک آزاد کرانے لگے تھے۔ مشکلیں نے قبل از وقت
 مونچھیں نکال دی تھیں مگر دوسروں کے کورس کی کتابیں ساری رات اندر کئی دن ختم نہ ہوتیں
 اسے تو سب عضو معطل سمجھ کر جیسے صبر کر بیٹھے تھے۔

کریمین بوا جیسے سچ مچ آج اپنے کو جلانے پر تل گئی تھیں۔ وہ اور بھی چوڑھے
 سے لپٹ کر بیڑہ گئیں۔ عالیہ کو وحشت ہونے لگی۔ کریمین بوا ہٹ کر بیٹھو، جلانے کو ایک
 جگہ ری بھی بہت ہوتی ہے۔ عالیہ نے تخت کے پاس کھڑے کھڑے کنڈالی پر ہاتھوں کا چھیر
 سچا دیا۔ ہا، کیسی سردی ہو رہی ہے۔ کمبخت سوٹر بھی تو اتنا پرانا ہو گیا ہے کہ گرمی
 نام کو نہیں رہ گئی۔

ہاتھوں کو سینک کر ذرا جسم گرم ہوا تو وہ بھی بڑی چچی کے پاس ٹنک گئی۔ گلی سے
 ریوڑیوں والے کی ٹھہری ہوئی آواز آہستہ آہستہ دُور ہوتی جا رہی تھی۔ کمر کی رات کس قدر
 دیران معلوم ہو رہی تھی۔

جاڑوں میں یہیں اسی تخت پر بیٹھے بیٹھے سب لوگ ہٹھیاں بھر بھر کر ریوڑیاں کھایا کرتے
 تھے۔ اپنا تو منہ تھک جاتا تھا۔ چباتے چباتے، اب تو جاڑے یوں ہی گزر جاتے ہیں مگر ایک ریوڑیا
 نصیب نہیں ہوتی، واہ رے زمانے، کریمین بوانے لکڑیاں چوڑھے میں سرکا دیں۔ کریمین بوا
 کو اب ہر وقت بولنے کا عارضہ ہو گیا تھا۔

بڑی چچی نے پھر ایک لمبی آہ بھری اور ملاٹین کی بتی اونچی کر دی۔

”ہائے کریمین بوا اتنی سردی میں تمھاری آواز کیسے نکل رہی ہے؟“ عالیہ نے تھنہ جھرا کر کہا

پیلی پیلی روشنی میں بڑی چچی کا چہرہ کیسا مردہ جیسا نظر آ رہا تھا اگر اس کے پاس پیسے ہوتے تو وہ ابھی ابھی کریمین بوا کو روٹیاں منگا کر کھا دیتی، گزرے ہوئے وقت کو آواز دیتی ایسی باتوں سے بڑی چچی کتنی ندبھال ہو جاتی ہیں۔

عالیہ نے اپنی آہ کو سینے میں گھونٹ لیا۔ — اگر اس وقت جلدی سے کھانا مل جائے تو تھوڑی دیر ٹھہرے۔ سارا دن گزر گیا مگر کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کھری کھاٹ پر دھوپ میں لیٹ کر اونگھتے ہوئے دن گزر گیا۔

سب چپ بیٹھے تھے۔ عالیہ یوں ہی ٹکڑے ٹکڑے دالان کی دیواروں اور تھپت تک رہی تھی بجلی کا کنکشن کٹے کتنا زمانہ گزر چکا تھا۔ مگر اس برآمدے میں اب تک ہر کیٹ میں فیوز بلب لگا ہوا تھا جسے دھوپوں نے بالکل سیاہ کر دیا تھا۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس سیاہ بلب کو نکال پینیکے، کریمین بوا ہاتھ نہ لگانے دیتیں۔ — خواہ مخواہ پرانی نشانوں کو کلیجے سے لگا کر رکھ پھوڑا ہی۔ — عالیہ نے اچھ کر انٹریں جھبکا لیں۔

کریمین بوا، کھانا پک گیا؟ آج تو بڑی سردی ہے۔“ ٹھنڈی بیٹھاگ میں سردی سے سکتے ہوئے سرار میاں نے دوسری بار آواز لگائی تھی۔

ٹھہر جاؤ لاٹ صاحب، کریمین بوا نے دوسری بار جمل کر جواب دیا۔ اور کیا مہبکا ہی

ذرا بھی صبر نہیں ہے۔

”تو بہ کیا مرتا ہو کھانے پر نہ دیا، کیسے کیسے لوگ پال رکھے ہیں۔ بڑے بھیانے بھی“

اماں یا تو اتنی دیر سے چپ چاپ بیٹھی ہاتھ سینک رہی تھیں یا ایک دم کلیجہ پھاڑ کر بولیں۔

عالیہ کی جان ہی تو جل گئی مگر اماں کو بھلا کیا کہتی۔ کوئی اتنا نہیں سوچتا کہ سردی کس غنڈے کی ہو رہی

اسرار میاں بھی انسان ہیں سمجھتے تو نہیں۔۔۔ عالیہ سوچتی گئی۔۔۔ کیسے دکھ سے زندگی گزار رہی ہیں۔ وہ تو جب سے آئی ہیں اس نے یہی دیکھا کہ بڑے چچا کے پرانے کھدر کے کرتے اور پاجامے پہنے کوڑی کوڑی کے کام کرتے پھرتے ہیں۔ اسی طرح سردیاں اور گرمیاں گزر جاتی ہیں۔ کبھی ان کو ایک گرم کپڑا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ کیا حال ہو گا غریب کا اس سردی میں۔

”بس کھانا تیار ہو اسرار میاں!“ عالیہ نے مکر ذر سی آواز میں کہا اور گھبر کر اماں کا منہ دیکھنے لگی۔

”تم سے کس نے کہا تھا کہ اسے جواب دو کیا تمہاری بھی شرم اڑ گئی؟“ اماں نے فوراً ڈانٹ پڑائی۔

عالیہ نے جواب نہ دیا وہ ماں کا دل نہ دکھانا چاہتی تھی۔ رستی جل جائے مگر بل نہیں جائے، پڑانی شان چھینے والی ایک دہی تو رہ گئی تھیں۔

”کیا ہو گیا دلہن جو اس نے جو ایشہ دیا، آخر اسرار بھی تو تمہارے خسر کی اولاد ہے“ بڑی چچی اپنی طرف سے مذاق کر کے ہنسنے لگیں۔

”ہے تو مگر اپنی ادقات بھی تو پہچانے رہے“ اماں نے منہ بنا لیا اور پھر کہیں تھمتی کی شادی کا خیال ستانے لگا۔ بڑی بھابی جب پیغام آ گیا ہے تو شادی کی

تاریخ بھی مقرر کرادیجئے، دیکھئے یہ وقت ہو گیا۔ محلے میں گئے اب تک نہیں آئی“

”اکیوں نہیں گئی۔ اپنے کمرے میں ہی رہو۔“ عالیہ نے جلدی سے کہا۔

”مگر اس کے باپ نے جو پانچ سو شادی کے لیے کھینچے ہیں۔ اس میں سب کام کیسے

ہو گا؟“ اب اماں کو دوسری فکر ستانے لگی۔

”بس کچھ ہو ہی جائے گا“ بڑی چچی نے سر جھکا لیا۔

”بس جیسے کمینوں کے ہاں شادی ہوتی ہی“ اماں نے کہا۔
 ”پھر ہزاروں کہاں سے آئیں گے“ عالیہ سے آج اماں کی باتیں برداشت نہ
 ہو رہی تھیں۔

”پانچ پانچ سو کی تو آتش بازی چھوڑی جاتی ہی، اپنے گھروں کی شادیوں
 میں ان آنکھوں نے سب دیکھا ہو“ کرمین بواتیری سے ردٹیاں پکار رہی تھیں۔
 پردہ سرکہ کھینچی اندر آگئی اور کرمین بوا کے باس چو لٹھے کے سامنے بیٹھ گئی تو شادی
 کی بات دہن ختم ہو گئی۔ سب چپ ہو گئے۔ چھتھی سے تو سب چھپا رہے تھے۔ کسی نے اُسے خبر نہ
 کی تھی کہ شادی کی بات پکی ہو چکی ہو۔ جہیز کے لیے اُس کے باپ نے روپے بھیدے ہیں۔
 اور وہ ایک دن ڈوے میں سوار ہو کر چلی جائے گی۔ سب اس سے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی
 طوفان نہ کھڑا کر دے۔ کھلا اس کا کیا اعتبار۔ سب چپ تھے۔ دالان میں پڑے ہوئے
 ٹاٹ کے پردوں میں کتنے بڑے بڑے سُورخ ہو گئے تھے۔ دُھوپ اور بارشوں نے ان
 کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اور اب تو ان سُورخوں سے اتنی ہوا اندر آ رہی تھی۔ جیسے کھلی کھڑکی
 کے سامنے بیٹھ گئے ہوں۔ نکالیہ خاموشی سے اکتا کر ٹاٹوں کے سُورخ گننے لگی۔

اتنی سخت سردی میں بڑے بھیا کانپور چلے گئے، انگریزی لباس سے بھی تو نفرت
 کرتے ہیں، شیریوانی سے کوئی سردی جاتی ہی، ہر طرف سے بھبر بھبرا لگتی ہی ایک کوٹ
 پہن لیں تو کیا حرج ہو گا بھلا۔ بس اللہ ہی رحم کرے“۔ اماں نے پھر باتیں چھپ
 دیں۔ اس خاندان میں جانے یہ حرکتیں کہاں سے گھس آئیں“

”بس اللہ کی یہی زندگی ہو۔ اللہ ہی میں بھلا کرے گا۔ خدا انہیں سردی سے
 محفوظ رکھے۔ انگریزی لباس تو انہوں نے کبھی پہنا نہیں۔ ہمیشہ سے نفرت کی، پھر
 جب سے گرم شیریوانی بھٹی دوسری پہننے کی نوبت نہ آئی۔ پرائی شیریوانی سے کیا سردی

جاتی ہوگی " بڑی چچی نے کہا اور کونلوں پر حجبی ہوئی واکھ تنکے سے کریدنے لگیں۔

عالیہ نے اینا سر باز دوں میں چھپا کر آنکھیں موند لیں۔ اندھیرے میں لال پیلے دھبے ناچنے کو دئے لگے۔ اور پھر اس کے سامنے لوہے کی سلاخیں گھبرنے لگیں اور ان سلاخوں کے پیچھے اس کے آبا کا چہرہ چمک رہا تھا۔ آبا وہاں کتنی سرسوی ہوگی، وہاں تو کوئی کولے دہکا کر کوئی کمرہ بھی نہ گرم کرتا ہوگا اور وہ گرم کپڑے بھی تو اب پرانے ہو چکے ہوں گے۔ رات کس طرح گزرتی ہوگی۔۔۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ یہ دل کو کون چٹکیوں سے منسل رہا تھا۔

"کریمین بوا روٹی تو پکتی رہی گی۔ آج مجھے سب سے پہلے کھانے کو دے دو مجھے پڑھنا ہی" عالیہ نے کہا۔

"میں صدرتے تم گرم گرم روٹی کھا لو، تمہارے ساتھ تھپی ٹپیا بھی کھالیں گی"۔
"مجھے کون سا پڑھنا ہے جو گرم گرم روٹیاں توڑنے بیٹھ جاؤں"۔ تھپی نے تیوریاں چڑھا کر کہا اور بازوؤں میں منہ چھپا کر چوڑھے کے ادر آگے سرک گئی۔

عالیہ بڑی بے دلی سے کھانا کھا رہی تھی۔ اس وقت کھیر سب خاموش بیٹھے اتنے لوگوں کے بیچ میں بھی زندگی کے آثار ڈھونڈنے سے نہ ملتے۔ بڑے سچا ہوتے تو بس گیارہ بجے رات تک بیٹھک ہی آبا رہتی۔ اس نے سوچا۔ اور جانے آج تمہیں بھیا کہاں چلے گئے۔ وہ کن کارروائیوں میں مصروف ہیں اور کیل انڈر ہی جانے کہاں آوازہ گھوم رہا ہوگا۔

"کریمین بوا اب تو اسرار میاں کو بھی کھانا بھجوادو" عالیہ نے اٹھتے ہوئے کہا مگر کریمین بوا تو ایسے موقعوں پر ہمیشہ گونگی بہری بن جاتا کرتا۔
بھجوادیا جائے گا، اب کوئی کریمین بوا اس ہاتھ کر لیں" اماں نے تلخی سے

جواب دیا۔

”ہاں دیکھ لیجئے چھوٹی دلہن“ کرکین بوا جلدی سے بولیں۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ
عالمیہ جلدی سے پردہ سرسکا کر باہر نکل آئی۔ کتنا اندھیرا تھا ذرا سے فاصلے کی
چیز دکھائی نہ دیتی۔ وہ صحن میں بڑی ہوئی لوہے کی کرسی سے ٹکرائی۔ تھمتی کے کمرے
نے نکلتی ہوئی ہلکی سی پیپا روشنی کھرکی دیوار کے اس پار رہ گئی تھی۔ صحن پار کر کے وہ جلدی
جلدی سٹیرھیاں طے کر گئی۔ کرکین بوا کے دس ہاتھوں کے خیال نے اُسے بُری طرح
بھنچھلا دیا تھا۔

سجہ بھوپھی کا کمرہ طے کرتے ہوئے اس نے نیچی نیچی نظروں سے دیکھا کہ سجہ بھوپھی
آرام کرسی پر لیٹی اپنے سے دگنی بڑی کتاب میں غرق ہیں۔ اور ان کے پیروں پر شی لچکا
لگی دلائی بڑی نفاست سے بڑی ہوئی ہو۔ سجہ بھوپھی نے حسب معمول نظر اٹھا کر بھی
نہیں دیکھا۔ اب بھلا وہ اس راستے کو کیسے چھوڑ دے۔ وہ ہوا میں اڑ کر تو اپنے
کمرے میں جانے سے رہی۔

اپنے نتھے سے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے
پٹ کھول دیے۔ بجلی کی تیز روشنی میں اس نے اپنا بستر ٹھیک کیا پھر لکان میں دبک کر
لیٹ گئی اور جب ذرا ہاتھ گرم ہو گئے تو چچا کی الماری سے نکالی ہوئی کتاب اٹھا کر
پڑھنے لگی۔

کھڑکی کھلنے کی وجہ سے سردی کتنی زیادہ ہو گئی تھی۔ مگر کھڑکی بند کرنے سے تو اندھیر
میں غوطے لگانا پڑتے۔ لائٹن کی پیاسی اور بیماریا روشنی سے اس کو کتنی اگھن ہوتی۔ ویلے
ایک زمانہ وہ بھی تھا جب لائٹن ہی کی پیاسی روشنی میں زندگی کا ایک حصہ گزار گیا تھا۔
ہر سات کے دنوں میں جب لائٹن کے گرد تینگے جمع ہو جاتے تو اُسے کتنا مزہ آتا۔

لو اب ایک تنگے نے شیشے سے سڑکرایا اور اوندھا ہو گیا، اب دوسرا اور اب تیسرا
 — اسی طرح تنگے گنتے گنتے سو جاتی مگر اب تو خیرات میں ملی ہوئی بھلی کی ریشنی کے بغیر
 اس سے ایک منٹ کو نہ پڑھا جاتا۔

ابھی تو رات کا ابتدائی حصہ گزرا تھا مگر گلی میں کیسا سناٹا اٹھایا ہوا تھا اسکول کی
 عمارت اور اس کے آس پاس کے گھنے درخت کھر کی چادرؤں میں ڈھکے ہوئے تھے۔ نیچے
 کی منزل سے اب زور زور سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ اور ان آوازوں سے ہسرا رسیاں
 کی نحیف سی آواز اُکھ رہی تھی۔ — کرکمن بوا کھانا پک گیا ہو تو دے دو۔

”کھالینا ہسرا رسیاں، دیو سے کھاؤ گے تو خوب بھوک لگے گی۔ اس ہنگامی کے
 زمانے میں اگر تھاری بھوک نہ کھلی تو ہم سب کیا کریں گے،“ تھپسی اپنی منہوں سے ادا سے
 کہہ رہی تھی اور بھرا اس کی ہنسی کی آواز عالیہ کے کانوں کے پار ہو گئی۔

عالیہ نے کتاب سینے پر رکھ لی۔ رحم کی ایک ٹیس اس کے کلیجے کو پار کر گئی۔ — ارے
 ان بے چارے کا کیا تصور ہو، یہ سب لوگ ان کے لیے ستھیر کیوں بن گئے ہیں۔ آخر یہ
 آپ ہی آپ تو دنیا میں نہیں آگئے جو اب سب لوگ ان کے بے گانے بن گئے۔ وہ کسی کے
 ماموں نہیں، کسی کے چچا نہیں، کسی کے بھائی نہیں، کسی کے باپ نہیں، باپ، بھلا
 کسی کو کیا پڑی ہے کہ اس سلسلے میں سوچے۔ یہ کس کے باپ نہیں گے، جبکہ ان کا کوئی باپ نہیں۔
 اس کا کیا جی چاہا کہ بس اسی وقت دوڑ کر نیچے چلی جائے۔ اپنے ہاتھوں سے کشتی سجائے
 اور بھرا رسیاں کے سامنے رکھ دے اور جب تک وہ کھاتے رہیں، سعادت مند بھتیجیوں
 کی طرح ان کے پاس کھڑی رہے مگر یہ سب کچھ کتنا ناممکن تھا۔ اس طرح تو اس کی آہاں کے
 اتنے پرانے وقار کو ٹھیس لگ جائے گی اور کرکمن بوا تو یقیناً جیتے ہوئے زمانے کا ماتم کرنے
 لگیں گی۔ — ”خیر یہ میرا گھر تو نہیں“ وہ بڑبڑائی۔

اس نے پھر کتاب اٹھائی۔ چنگیز خاں کے مظالم پڑھ پڑھ کر مارے وحشت کے دل کا نپا جاتا۔

کتاب رکھ کر اس نے لکان میں منہ چھپالیا۔ اس اشراف المخلوق نے کیسے کیسے ظلم سے تاریخ مرتب کی ہے۔ اس وقت وہ سراسر مفکر بنی ہوئی تھی۔ اقتدار کی آگ کبھی نہیں بجتی لاکھ تہذیب جنم لیتی رہے۔ کچھ نہیں بتا۔ اقتدار سب کچھ جلا کر بھسم کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود دعویٰ ہے کہ اب ہم مہذب ہو چکے ہیں۔ سرود کے پیار بنا کر اور ان فنوں کو سنجیدگی میں بند کرنا تو صدیوں پرانی وحشت کے دور کی یادگار ہیں۔ مگر آج جو جنگ ہو رہی ہے۔ ایک سے ایک بڑھیا ہم لو، جس سے سب سے زیادہ بے گناہ مرے وہ صوبے سے ترقی یافتہ ہتھیار۔ پھر حلبیا نوالے بارغ کا قصہ کون سا صاری پڑانا واقف ہے۔ اسی مہذب دور نے تو اس واقعے کو جنم دیا تھا۔ اور اسے ایک دم کسم دیدی یاد آگئیں۔ اندھیرے میں ان کی لاش آنکھوں کے سامنے تیرنے لگی۔ سبنتی ساری سے قطرہ قطرہ سکتا ہوا پانی اس کے دل پر گورہا تھا۔

کسی نے ہولے سے اس کا لکان سر کا یا تو وہ بو کھلا کر اٹھٹھٹھی۔ "ارے تم تو ڈر گئیں" جمیل بھیا اس کے سر ہانے کھڑے تھے۔

"ہاں ہیں تو سچ سچ ڈر گئی، ابھی ذرا دیر پہلے میں چنگیز خاں کے مظالم پڑھ رہی تھی" اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مجھ ہی کو چنگیز سمجھ رہے ہو، بھلا مجھ میں اتنی ہمت کہاں جمیل کتیا ہنسے۔

"تمہیں کیسے کہہ سکتی ہوں، تم تو مہذب ہو اور پھر شاعر۔ اسرار میاں کو

کہا نا مل گیا۔"

"میرا کہن بوا کے معاملات میں دخل نہیں دیتا"۔ جمیل بھیا نے بڑے پھیکے پن سے

کہا — اس وقت تو میں تم سے باتیں کرنے آیا ہوں اور —
 جمیل بھیا اس وقت بخت وغیرہ کے موڈ میں نہ تھے۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ وہ
 پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں اور کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اور اب جبکہ رات سو رہی
 ہے، اس سردی میں سب لوگ اپنے بستروں میں دبے پڑے ہیں تو وہ اس کے کمرے میں کیوں
 آئے ہیں — پھر اسے خیال آیا کہ تجہ پھو پھی کچھ سوچنے لگیں — اس نے کھڑکی
 کے دونوں پٹ کھول دیے۔

جمیل بھیا کرسی سرکا کر اس کے پانگ کی پٹی کے پاس بیٹھ گئے اور اسے بڑی گہری
 گہری نظروں سے گھورنے لگے۔ وہ جمیل بھیا کو ٹانے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
 ”تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں، شاعر نے شاید بسی ہی آنکھوں کو
 جنت کے نام سے یاد کیا ہے۔“

”شکر یہ بھیا جمیل“ وہ زور سے ہنسی ”یہ اصلی جنت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے
 کہ شہ آد کی جنت ہو۔“

”عالیہ بیگم، سروں کے مینار بنانا اتنا بڑا ظلم نہیں جتنا کسی کے جذبات
 کا مذاق اڑانا۔“

”کیا یہ بھی شاعری کا کوئی باریک ٹکڑہ ہے، خیر حلو، معاف کر دو، جذبات
 کا مذاق اڑانے کے بجائے اب سروں کے مینار بنالیا کروں گی۔“ اس نے اپنے
 ہاتھ لکان میں چھپا لیے۔ ”جمیل بھیا اگر اس بار میں پاس ہو گئی تو مزہ آ جائے
 گا، تجہ پھو پھی کی قابلیت کو ضرور تھوڑی ٹھیس لگے گی۔“

وہ تو گفتگو کا موضوع بدل رہی تھی۔ مگر جمیل بھیا نے ذرا بھی دلچسپی نہ لی۔
 سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ کھلی کھڑکی سے ہوا کے کتنے سرد جھونکے اندر آ رہے

تھے۔ مگر وہ کھڑکی بند بھی تو نہ کر سکتی تھی۔ اندھیرا جذبات سے ساری روشنی چھین لیتا ہی۔

”مجھے معلوم ہے تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں۔ تم مجھے ڈالتی ہو عالیہ۔ کیا

تم میری محبت کا احترام بھی نہیں کر سکتیں۔“

”بھیا آپ کیسی باتیں کرتے ہیں، میں — میں —“ وہ جمیل کی آنکھوں میں

آنسو دیکھ کر بوکھلا گئی۔ اس سے بات نہ کرتے بن پڑی۔

”عالیہ!“ جمیل بھیانے اسے ایک جھٹکے سے اٹھالیا اور عالیہ کو ایسا محسوس ہوا

کہ کھڑکیوں کے دونوں بیٹ بند ہو گئے ہیں اور اس کے ہونٹوں پر انگارے رکھے ہوئے ہیں

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہو گیا کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکی اور جب اس نے جمیل بھیا کو

اپنے آپ سے جھٹکنا چاہا تو وہ اس کے بازو پر ہسر رکھے بچوں کی طرح سسک رہے

تھے اور ان کا ایک ایک آنسو کھولتی ہوئی بوند کی طرح اس کے دل پر گرتا محسوس ہو رہا تھا۔

اُسے ان بوندوں کے گرنے کی آواز تک محسوس ہو رہی تھی۔ ان بوندوں کی روشنی سارے

کمرے میں پھیل گئی تھی اُسے ایک صاف ستھرا رستہ نظر آ رہا تھا۔ جس پر دوڑنے کے لیے

جیسے اس کے پاؤں بتیاب تھے۔

وہ بے سُدھ سی بیٹھی تھی۔ اور جمیل بھیا اب سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے

ہوئے بڑے بیٹھے پن سے مسکرا رہے تھے۔ کتنا نخر اور کتنا سکون تھا اس مسکراہٹ میں۔

”بس اب آپ تشریف لے جائیں جمیل صاحب۔“ عالیہ نے ڈانٹوں کی طرح

ان کی طرف دیکھا۔ کسی اور کو آواز بنائے گا۔ میرا نام ہی عالیہ، چلے جائیے۔ ورنہ

اتنی زور سے چیخیں لگیں گی کہ ہاں —“

جمیل بھیا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے اسے ٹک ٹک دیکھ رہے تھے۔ ان کی

نظر یہاں پہنچ رہی تھیں، "تم کسی سے محبت نہیں کر سکتیں عالیہ بیگم، تم سچ مچ ڈائن ہو۔"
 اور جب تیل بھیا کھڑے کھڑے ایک دم چلے گئے تو عالیہ نے کھڑکیوں کے پٹ
 بھیر دیئے اور سسکیاں بھر بھر کر روتے لگی۔ "جیسا میرا جسم میں جو تم جادو کی سوسیاں
 چھبے گئے ہو اسے اب کون سا ہزارہہ آکر نکالے گا۔"

روتے روتے جب اس کا جی ہلکا پڑ گیا تو وہ اپنی بے وقوفی پر منہ سے لگی۔
 حد ہی بھئی۔ کیا وہ آپا اور کسم دیدی سے کچھ کم ہے۔ ہو نہہ! پتہ نہیں وہ
 کیسے پاگل ہو گئی تھی۔

وہ اپنے کورس کی کتاب اٹھا کر بڑے سکون سے پڑھنے لگی۔ اور پھر نہ جانے کس
 وقت کتاب اس کے ہاتھ سے پھٹ کر سینے پر گر پڑی تو کچھ نیند میں وہ چونک پڑی۔
 اسے یہ چھٹی اتنی ٹھنڈ میں سنگے باؤں کیوں چپ چاپ کھڑی ہے۔ عالیہ نے
 کتاب میز پر رکھ دی۔

"تو کیا آپ اب تک جاگ رہی ہیں بھیا۔؟" کھڑکی کی طرف بڑھتے بڑھتے
 وہ ایک دم ٹھٹھک کر رہ گئی۔

"مگر تم کیا کرتی پھر رہی ہو۔ اس سردی میں؟ اور پھر لجان میں آ جاؤ چھٹی۔"
 "منظور نے کہا تھا کہ رات بارہ بجے گلی میں کھمبے کے نیچے کھڑا ہوں گا تم کھڑکی
 میں آ کر کھڑی ہونا۔ خیر آپ سو جا بیئے، خواہ مخواہ نیند خراب کی میں نے۔ وہ کمرے کا
 دروازہ کھول کر جلدی سے چلی گئی۔

"اے چھٹی! عالیہ نے آواز دی مگر وہ تو سٹیرھیاں طے کر کے اپنے کمرے
 میں جا چکی ہوگی۔"

عالیہ نے کھڑکی کے پٹ کھول کر نیچے گلی میں جھانکا، گھر بھٹ گئی تھی۔ چاند کی

۱۶۴
ملکھی روشنی گلی میں لوٹ رہی تھی۔ وہاں اور کچھ بھی نہ تھا

(۲۰)

جنگ جاری تھی۔ مہنگائی نے گھر میں جھاڑو پھیر دی تھی۔ جمیل بھیا کی تھوڑی سی آمدنی صحیح معنوں میں کسی کا بھی پیٹ نہ بھر سکتی تھی۔ گھر میں سب کتنے خود غرض ہو رہے تھے۔ اماں کی پیشانی پر ہر وقت شرکائی خشکنیں پڑی رہتی۔ بڑے چچا کی صورت سے انھیں نفرت ہو گئی تھی انھیں شدت سے حساس تھا کہ اگر دکان کے روپے گھر میں آنے لگیں تو یہ حالت ذرا کے ذرا میں بدل جائے۔ ذرا ڈھنگ کی روٹی تو نصیب ہو، دھمکی کے طور پر وہ ہر وقت اپنے بھائی کے گھر جانے کی ضد کرتی اور بڑی چچی اس خیال سے لڑا کھتی کہ اس طرح تو گھر کی بارنامی ہوگی۔ سب یہی کہیں گے نا کہ پیٹ بھر روٹی بھی نہ کھلا سکے۔ ادھر چچی کی یہ حالت تھی کہ ہر وقت لڑنے بھرنے پر تیار رہتی۔ چھینکے پر رکھا ہوا شکیل کا کھانا اتار کر چیلے سے کھا جاتی اور جب بدلے میں وہ بکواس کرتا تو مزے سے ہنستی یا پھر مارنے مرنے پر تل جاتی۔ سنجہ بھوپھی یہ ہنگامے دیکھ کر حقارت سے منہ پھیر لیتی۔ ”بہالت میں ہی سب کچھ ہوتا ہی۔ اگر سب کے پاس تعلیم ہوتی تو آج یوں بھوکے مرتے؟“ وہ بڑے غور سے کہتی۔ اور پھر اپنی تعلیم کے آفاق پر بیٹھ کر بڑے نخر سے مسکرانے لگتی۔ جمیل بھیا یہ سب کچھ دیکھتے، سننے اور ان سب کے بیچ میں بڑے بے بس اور خاموش نظر آتے مگر وقت کی اس خرابی کے باوجود کریمین بوا ذرا بھی نہ بدلی تھیں۔ جنگ کی وجہ سے فقیروں کے گلے پیدا ہو گئے تھے۔ کریمین بوا کھیلے زمانے کی دی ہوئی منوں خیراتوں کو یاد کر کے کڑھا کرتی۔ اور اسرار میاں کی روٹیوں کے ٹکڑے نوالے کاٹ کاٹ کر فقیروں کو خیرات لے ہی دیا کرتی۔ اس عجیب و غریب خیرات پر عالیہ کا جی ملنے لگتا۔ آخر یہ اسرار میاں اتنے دیا نندار

کیوں ہیں؟ کیا وہ دوکان سے ایک آدھ روپیہ اڑا کر عیش نہیں کر سکتے۔؟ اس ایشیا ر اور شرافت کا چلہ کاٹ کر انھیں کیا مل جائے گا؟ اس طرح وہ دادا کی جائز اولاد تو کہنے سے رہے۔ کچھ بھی کرتے رہیں پھر بھی دادا کی دہشتہ کی اولاد ہی کہلا سینگے۔ انھیں کوئی باپ کے نام سے یاد نہ کرے گا۔ یہ دنیا ان کے لیے میدان قیامت ہی رہے گی۔

گھر کی ایسی بڑی حالت دیکھ کر بھی بڑے چچا کا دل نہ سپجایا تھا۔ مقاصد کے تیردوں نے انھیں اس بڑی طرح گھائل کر رکھا تھا کہ سارے دکھ درد ہیج تھے۔ "جنگ نے آزادی کو بہت قریب کر دیا تھا"۔ وہ سب کی طرف دیکھ کر کہتے مگر کوئی بھی تو انھیں جواب نہ دیتا۔ وہ شرمندہ ہو کر سر تھک لیتے۔ مجرموں کی طرح اٹے سیدھے نوازے توڑتے اور مہیچاک کی راہ لیتے۔

سردیوں میں اب وہ شدت نہ رہ گئی تھی۔ عالمیہ رات گئے تاک گلی کی کھڑکی کھلی رکھتی۔ اور گلی کی روشنی سے پڑھ پڑھ کر امتحان کی تیاری کرتی رہتی۔ ان دنوں اس نے سوچ بچا سے ہاتھ اٹھایا تھا۔ آبا کے خط اس کی ہمت بڑھاتے رہتے۔

دھوپ ڈھل چکی تھی۔ ساری دوپہر تھی پڑھنے کے بعد بھی وہ چھت سے نہ سر کی سائے کی وجہ سے اب اسے سردی لگ رہی تھی۔

پڑھتے پڑھتے اس نے سراٹھا کر دیکھا تو تھپی اس کے پاس کھڑکی تھی۔ رات سے وہ چپ چپ تھی اور صبح سے کئی بار عالمیہ کے پاس سے گزری تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر چپ بھی عالمیہ اس کی طرف دیکھتی تو چلی جاتی۔

"کیا بات ہے تھپی؟"

"کچھ بھی نہیں سچیا، بس یوں ہی سچی چاہا کہ آپ کے پاس بیٹھوں"۔ وہ عالمیہ کے پاس کر سی پر ٹک گئی۔

تھپی نے آج کتنی مدت بعد سے پیار سے سچیا کہا تھا وہ اسے بڑی پیاری لگ رہی تھی

کھوئی کھوئی سی مٹی سے تک رہی تھی۔

”کچھ تو ضرور ہو چھٹی ورنہ تم ایسی کیوں نظر آ رہی ہو۔“ عالیہ نے اسے اپنے قریب سرکایا تو چھٹی اس کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی۔۔۔ وہ منظور بھی جنگ میں بھرتی ہو گیا بجیا، ایک سہارا تھا سو وہ بھی گیا۔“ چھٹی نے روتے روتے کہا۔

”ہونہہ! اگر اُسے تم سے محبت ہوتی تو پھر جنگ پر کیوں جاتا بنگلی، ادرا ب تم اسے یاد کر کے رورہی ہو، بے دقونی نہ کرو چھٹی۔“ عالیہ نے اسے لپٹا لیا۔

”بس ویسے ہی رونا آگیا۔ کوئی مجھے اس سے محبت تھوڑی تھی۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اس لیے مجھے بھی اچھا لگنے لگا تھا۔ چلو کوئی مجھ سے محبت تو کرتا تھا۔“ چھٹی نے بے بسی سے ہنستے ہوئے آنسو پونچھ لیے۔

عالیہ سے کچھ کہتے نہ بن پڑی۔ بھلا وہ کہتی بھی کیا۔ میں جو تم سے محبت کرتی ہوں چھٹی؟ ”آپ، آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں بجیا۔؟“ وہ زور سے ہنسی۔ کتنی تضحیک تھی۔ اس کی بے تحاشہ ہنسی میں۔ عالیہ اسے کیسے یقین دلا سکتی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہو۔ وہ اس سے ہمدردی رکھتی ہو۔ وہ چھٹی کی ہنسی سے بوکھلا کر اس کا مُنہ تک رہی تھی۔

”یہ دیکھئے بجیا میرے پا جاے کی گوٹ کس بڑی طرح پھٹ گئی ہو میں نیچے جا کر اسے سی لوں تو پھر آؤں گی۔“

چھٹی بھدرا بھدرا کرتی چلی گئی اور عالیہ کتاب گود میں رکھے بے دقونی کی طرح بیٹھی رہ گئی۔ یعنی اس نے اپنی بے کار بات کی تھی کہ چھٹی کو پا جاے کی گوٹ سینا یاد آگئی۔ چھٹی اس کی محبت پر اعتبار نہیں کرتی۔ دنیا نے اس کے اعتبار کا جنازہ نکال دیا ہو۔ عالیہ رنجیدہ ہو رہی تھی۔

چھت کی منڈیر پر بیٹھا ہوا کو آ کا میں کا میں کرتا ہوا اڑ گیا۔ دھوپ چھت کی منڈیوں

پر چڑھتے چڑھتے غائب ہو گئی تھی۔ اب اچھی خاصی سردی ہو رہی تھی۔ کتابیں سمیٹ کر وہ اسپینے کمرے میں رکھ آئی۔ چھٹی کے جانے کے بعد ایک لفظ بھی تو نہ پڑھ سکی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ آنکھیں بند کر کے اپنے بستر پر پڑی رہی اور پھر نیچے چلی گئی۔ کیا رسی میں گنبدے اور گل عباس کے پھول بہار کا پتہ دے رہے تھے۔ عالیہ نے ایک پھول توڑ کر اپنے بالوں میں لگایا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ جمیل بھیا دالان کی محراب کے پاس کھڑے اُسے بڑے اشتیاق سے دیکھ رہے ہیں تو اس نے بوکھلا کر پھول کیاری میں اُچھال دیا۔ جانے کیسے اس کو احساس ہوا کہ سنگھار مرد سے محبت کرنے کی چٹنی کھاتا ہے۔

پھول کھینک کر اس نے دیکھا کہ جمیل بھیا کی آنکھیں جیسے کھلا گئی ہیں۔ وہ لوہے کی کرسی پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

اماں تخت پر بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں اور بڑی چچی چنے کی دال چن رہی تھیں اُن کا دکھوں میں گھرا ہوا چہرہ کس قدر کھنڈر ہو رہا تھا۔ سارے دکھ، سارے درد ان کے چہرے کی رعنائی کو توڑ کھوڑ کر اب بھی اپنا چہرہ نہ چھوڑ رہے تھے۔ ادھر دو دن سے وہ ایک نئے دکھ میں مبتلا تھیں۔ دو دن ہو گئے مگر تمکین گھر نہ آیا۔ جمیل بھیا نے اُسے تلاش کیا۔ لیکن کوئی بہتہ نہ چلا۔ جانے وہ کتابوں کی تلاش میں کتنی دور چلا گیا تھا۔

”شامیں ہمیشہ اُداس ہوتی ہیں“ جمیل بھیا نے عالیہ کی طرف دیکھا۔

”سب شاعری ہے، مجھے تو کوئی اُداسی نہیں لگتی“ عالیہ ہنسی اور اماں کے پاس تخت پر

بیٹھ کر پانہ ان کی کھسیاں صاف کرنے لگی۔

”میرے سامنے اتنی خوبصورت اور اتنی مکمل غزل ہے کہ اب اپنا سارا کلام بے معنی معلوم

ہوتا ہے، اس لیے شاعری و ادبی چھوڑ دی ہے، تم نے فیض اور نذیم کو پڑھا ہے؟“ انہوں نے

پوچھا۔

عالمیہ خاموش رہی، وہ بھلا خود کو غزل کیسے سمجھ لیتی۔ یہ جمیل بھیا بھی خوب ہیں، ہر سزا میں اپنا مطلب تلاش کر لیتے ہیں۔ اسے عقلمند آ رہا تھا۔

”تمہارے بڑے چچا کی لائبریری میں نہیں اور ندیم کا کہاں گزر ہو سکتا ہے؟ وہ ہنسے ”سناؤ گاندھی پر اندر کوئی کتاب تھی؟“ جمیل بھیا بھول کھینکنے کا ہتھم لے رہے تھے وہ بڑے انہماک سے پاندان صاف کرتی رہی۔ اس نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا جیسے اسے معلوم ہی نہیں کہ اس سے کوئی مخاطب بھی ہے۔ جمیل بھیا کے لیے اس نے کچھ اور بھی نہ سوچا تھا پھر بھی کیوں وہ ان سے گھبرانے لگی تھی۔

”کیا تم نے آج بھی شکیل کو تلاش کیا تھا۔ بھلا تم کو اپنی مسلم لیگ سے کب فرصت ملے گی“ وال کے کھنکھانے کرتے کرتے بڑی چچی نے سر اٹھا کر پوچھا۔

”اماں اب آپ اس کی فکر نہ کریں، وہ بمبئی چلا گیا ہے۔ وہاں مزے سے کھا کھائے گا۔“

جمیل بھیا نے جیسے ڈھکیا کھینچ مارا۔

”بمبئی میں؟“ اتنی دُور؟“ — بڑی چچی کی آواز لرز رہی تھی۔ — ارے اسے شرم نہ آئی، بھاگتے ہوئے، اسے اپنی ماں کا بھی خیال نہ آیا۔ بڑی چچی کلیجہ تھام کر رونے لگیں۔

عالمیہ تخت سے کود کر بڑی چچی کی طرف لپکی اور انھیں اپنی بانہوں میں لے لیا۔

نہ روئے بڑی چچی، وہ آجائے گا۔

”وہ کیوں آئے گا عالمیہ بیگم، یہاں اس کے لیے کیا رکھا تھا اور اب اسے کس کا خیال آئے گا۔ وہ اپنی زندگی بنانے گیا ہے۔ یا بگاڑنے، اس نے کچھ سوچا ہی ہوگا۔ اس گورکھ دھندے میں رہ کر کیا کرتا؟“ جمیل بھیا کی نظروں تک میں طنتر تھا۔

”جمیل میاں کوئی کیا کر سکتا تھا۔ اس کے باپ کا فرض تھا۔ کہ گھر کی فکر کرتے، اپنی

اولاد کو دیکھتے، پڑھتے لکھتے، تربیت کرتے، وہ غریب آوارہ پھرتا رہا، کبھی پلٹ کر نہ
 پوچھا: "اماں کو تو بڑے سچا کے خلاف زہرا گلنے کا موقع ملنا ہی چاہیے تھا۔ بس مجھ پر تھیں
 جو کھلے خزانے ان کے سامنے کچھ نہ کہتیں۔ ان سے یہ احساس کوئی نہیں بھین سکتا کہ سب گھر
 کی تباہی کے ذمہ دار صرف بڑے سچا تھے۔ باقی تمام افراد موصوم تھے وہ بڑے یقین سے کہتی
 تھیں کہ بنیاد ٹیڑھی رکھی جائے تو ساری عمارت ہی ٹیڑھی بنے گی۔"

جمیل بھیا سر بھکا کر جانے کیا سوچنے لگے۔ بڑی سچی ڈوڈیے کے بلوں میں منہ چھپائے
 روئے سبار ہی تھیں۔ ان کی کوکھ سے جنم لینے والا ان کے دکھوں پر تھوک کر ساتھ چھوڑ
 گیا۔ وہ لاکھ آوارہ ہو گیا تھا بھر بھی ایک ماں کو اس سے کوئی اس تو تھی۔

"مت روئے بڑی بھبا بھی، جب ملک آزاد ہوگا۔ تو شکیل بھی وہاں آجائے گا۔ اماں
 نے منہ کی خیز طریقے سے کہا اور داد طلب نظروں سے دیکھنے لگیں۔"

"اور جب ملک آزاد ہوگا تو سارے انگریزوں کو دبا کر بھاگ جائیں گے۔ ہمارے پاکستان
 میں تو ایک بھی انگریز نہ رہے گا۔ تمہیں اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔"

"میرے اللہ، عالیہ زریب بڑ بڑائی۔ " ایک دفعہ بھر سب لوگ سن لو کہ شکیل بھاگ
 گیا۔ بڑی سچی کا کلیجہ صدمہ سے بھٹ رہا ہے۔ آپ لوگ ذرا دیر کو اپنی صحبت سے ملنا تھا کھائیں
 عالیہ کے لیے میں سمجھتی تھی۔"

ذرا دیر کے لیے سب چپ ہو گئے۔ شام اتنی دیر ان اور اس ہو رہی تھی کہ عالیہ کو
 لگا کہ شکیل بھاگا نہیں بلکہ ابھی ابھی اس کی میت اٹھائی گئی۔ بڑی سچی کیسے بابا کر
 رو رہی تھیں۔

"اماں اس کے لیے مت روئے۔ وہ تو سخت نالائق لڑکا تھا۔ جمیل بھیا اپنی ماں
 کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ " میں جو ہوں آپ کا نور مت گزارو۔"

”تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔“ بڑی چچی نے سب سے کہا۔

”میں کہاں جاؤں گا ماں۔ میرا آپ کا تو جہنم جہنم کا ساتھ ہی اور تو اس دنیا میں میرا

کوئی ساتھی نہیں۔“ انھوں نے نظریں سجا کر عالیہ کو دیکھا تو ہنس نے گھبرا کر بڑی چچی کی

اڑلے لی۔

جمیل تھپا کی ذرا سی تسلی سے بڑی چچی چپ ہو گئیں، وہ چپ نہ ہوتیں تو کیا باتیں

کرتیں۔ ان کی ساری زندگی ان کی مرضی کے خلاف گزرتی رہی، اور وہ صبر کی سیل سینے

پر دھرے دو سردوں کے اشارے پر جلتی رہتی۔

الشاہ اس گھر کو تباہیوں سے بچالے۔ ”کریمین بوا دعائیں کر کے لائسنس جلا رہی

تھیں۔ اور سب لوگ بڑی عقیدت سے اذان کی آواز سن رہے تھے۔ سچہ بھوپھی نے اپنے

لمرے کی کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا اور اس طرح ہٹ گئیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ مر جاؤ

جاہلو، تم سب کی یہ سزا ہی، بھوکے مر مر کر ایک دن سب بھاگ جائیں گے۔

رات آٹھ بجے کے قریب بڑے چچا گھر میں داخل ہوئے تو بڑی گہری خاموشی سچائی

ہوئی تھی۔ کریمین بوا نے تخت پر دسترخوان کھینچ کر کھانا لگا دیا۔

شکیل بھاگ گیا، مہی میں ہی۔ بڑی چچی نے خبر سنائی۔ ان کی آواز بھرا رہی تھی

”ارے، بھاگ گیا، آخر کیوں بھاگ گیا۔ وہ مردود۔“ مارے غصے کے بڑے

چچا کا منہ سُرخ ہو رہا تھا۔ آئے گا تو اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔ اُسے شرم نہیں آئی۔

”تم کیوں ہڈیاں توڑو گے، تم نے اس کیلئے کیا کیا ہے! تم کو یہ بھی یاد نہ تھا کہ شکیل

بھی تمہاری اولاد ہی۔“ بڑی چچی نے تاڑ توڑ جواب دیا۔ آج پہلی بار وہ سب کے سامنے

بڑے چچا سے لڑنے پر آمادہ تھیں۔

”وہ۔ وہ میں نے کہا کہ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بڑے چچا نے بوکھلا کر

سر جھکا لیا اور جلدی جلدی نوالے توڑنے لگے۔ چچی دانٹوں سے انگلی رکھ کر اپنے مخصوص انداز سے ہنسنے لگی تو بڑی چچی نے اسے گھور کر دیکھا اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

عالیہ نے بڑی خاموشی سے سب سنا، دیکھا اور کڑھ کر رہ گئی، بڑے چچا کا جھکا ہوا سر دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھا تھا۔ کاش بڑے چچا سے اب کوئی کچھ نہ کہے انہیں ان کے حال میں مست رہنے دیا جائے مگر یہاں تو کوئی انہیں معاف کرنے کو بھی تیار نہیں کھانے کے بعد بڑے چچا مٹیہاک میں چلے گئے تو عالیہ نے بڑی منتوں سے بڑی چچی کو کھانا کھلایا۔ آج تو وہ پیٹ کے دوزخ کو پاٹنے کے لیے بھی تیار نہ تھیں۔

کرکمن بوا، بڑی بھابھی سے پوچھو کہ میں بمبئی جا کر شکیل کو تلاش کروں۔“
جب عالیہ اپنے بستر پر لیٹ رہی تھی تو سرار میاں کی ککیپاتی آواز اس کے کلیجے کے پار ہو گئی۔ کیا سچ مچ یہ آواز سرار میاں کی تھی اسے یقین نہ آ رہا تھا۔

(۲۱)

امتحان کے بعد جب عالیہ نے سراٹھایا تو بہار جا چکی تھی۔ ہواؤں میں گرمی بس گئی تھی۔ نالی سے ڈھیروں پانی کیاری میں جاتا مگر بھولوں پر رونق نہ آتی، پتیاں مڑھبا مڑھبا کر تھرتی رہتیں۔ مار سے پیاس کے ننھی ننھی چوڑوں کی چونچیں کھلی تھیں اور چوڑھے کے پاس کام کرنے ہوئے کرکمن بوا کے ہاتھ سے پنکھیا نہ چھڑتی۔ شام کو صحن ٹھنڈا کرنے کے لیے کتنی ہی بانی کی بالٹیاں تھپڑک دی جاتیں۔ بھبر بھی سکون نہ ملتا۔ سارا ماحول جل رہا تھا۔

ان بے کار، ویران اور گرم دنوں میں بڑی چچی نے تھمتی کے جہیز کے پانچ جوڑے کیڑے اس کے سر پر کر دیئے تھے۔ دو پہر میں جب سناٹا بھجا جاتا تو وہ مشین پر کیڑے

سینے بٹھ جاتی۔ بڑی ججیا سے تو اب کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ ہر وقت کبھی کبھی سی رہتیں۔ ان کا کسی کام میں جی نہ لگتا۔ اور اماں تو دیکھے بھی تھیں کہ برداشت نہ کرتیں۔ ان کا بس چلتا تو جہیز کے کپڑوں سے تھمتی کا لفن سی ڈالتیں۔ بس ایک عالیہ رہ گئی تھی جو بڑے خلوص سے جہیز سی رہی تھی اور ہر وقت تھمتی کے اچھے نصیب ہونے کی دعائیں کر رہی تھی۔

ادھر تھمتی تھی کہ اپنے نصیب کی بازی لگنے سے بے خبر سارے گھر میں اُدھم ڈھاتی پھر رہی تھی۔ منظور کی محبت نے جو درہی سنجیدگی پیدا کر دی تھی وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ بڑے سچا کو دیکھتے ہی اسے پاکستان کا خیال ستانے لگتا۔ انگریزوں کو وہ بے نقط سناتی کہ اماں کے چھکے چھوٹ جاتے اور جب سب کو چڑا چڑا کر وہ تھک جاتی تو پھر عالیہ کے پاس آگھتی۔ اے بجیا یہ کس کے کپڑے سل رہی ہیں، ہے اللہ کتنے پیارے ہر، یہ کون اپنے گا۔ ۹" وہ اٹھلا کر پوچھتی۔

کسی کے ہیں تھمتی۔ " عالیہ لرز کر بہانہ کرتی کہ کہیں سچی بات کا تپہ نہ چل جائے۔
"ایک ڈوٹہ ہیں دے دیجئے۔ اس میں سے لچکا لگا کر ادڑ ہوں گی۔ وہ چنے ہوئے ڈوٹے کو اٹھا کر مڑنے لگتی۔ "دیکھئے میرا ڈوٹہ کیسا لٹے ہو رہا ہے۔"

چھوڑ کر تھمتی۔ "جینٹ کھل جائے گی۔" عالیہ ڈوٹہ چھیننے لگتی۔

"آخر یہ ہیں کس کے جہیز کے، بے چاری بتا بھی نہیں سکتیں، زبان تھکتی ہے۔" مارے تجسس کے تھمتی لڑنے پر آمادہ ہو جاتی۔

"میں تم کو بیوں گی جو مجھ سے لڑیں۔" عالیہ بڑے پیار سے اپنی بڑائی کا رعب ڈالتی

تو تھمتی ہنسنے لگی۔

آج وہ پہر میں کیسا سناٹا تھا۔ وہ تھمتی کے ڈوٹہ میں کرن ٹانگ رہی تھی اور

اپنے مستقبل کے خیال کو جان پر نازل کیے جا رہی تھی۔ اگر وہ فیل ہو گئی تو کیا ہوگا۔ اگر پاس

ہوگئی تو لے دے کے ایک ہی بات رہ جاتی ہے کہ بی بی ٹی کرے۔ اُستانی بن جائے مگر کیا وہ بی بی ٹی
 کر سکے گی۔ کیا اہل اسے علی گڑھ جانے دیں گی۔ اور کیا ماموں اسے اتنے روپے کھجواتے رہیں گے
 ہائی اسکول کے احاطے میں آم کے درختوں پر کون مسلسل چینی جا رہی تھی۔ اور پاس کے
 کمرے میں سوئی ہوئی نخبہ پھو بھی کے خراٹے تھپتھپ کر اٹھائے ہوئے تھے اس کا جی چاہا کہ وہ بھی
 سو جائے اور اتنے خراٹے لے کہ نخبہ پھو بھی اپنی بے فکر غنیزہ سے چونک پڑیں اور پھر ساری
 دوپہر مٹی کھڑکات دیں۔

بالم آئے بو مورے من میں۔ چل جلاتی دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی راہ گیر بالم
 کا سایہ تلاش کرتا نکلی سے گزر گیا۔

وہ ایک لمحے کو گلی میں تھانکی اور پھر کرن ٹانگنے لگی۔ کتنی صدیاں گزر گئیں۔ مگر ان
 بالم صاحب کی سچ دھج میں فرق نہ آیا۔ کتنوں کو قبر میں سُلا دیا۔ مگر خود موت کا مُنہ نہ
 نہ دیکھا۔

”کیا ہو رہا ہے۔ تمہیں کھتیانے آتے ہی پوچھا۔“

آج کتنی ہی مدت کے بعد وہ پھر اس کے پاس آ بیٹھے تھے۔ لو ایک اور بالم صاحب
 آگئے۔ عالیہ بو کھلا کر اٹھے سیدھے ٹانگے مارنے لگی۔ ”تھمبی کا ڈو پیٹہ ٹانگ رہی ہوں۔“
 وہ ڈو پیٹے کا ایک سرا پکڑ کر یوں ہی اُلٹنے پلٹنے لگی۔ عالیہ نے نیچی نیچی نظروں سے
 دیکھا کہ آج پھر ان کی آنکھوں میں باگل بن جھانک رہا تھا۔ اور حیرے پر زندگی سے تھک
 جانے کے اشارے رہے ہیں۔ ہائے یہ کون سا جذبہ ہے جو اتنی جھڑکیاں کھانے کے بعد بھی
 ختم نہیں ہوتا۔

”اتھیا، تو تھمبی بی بی کا جینر تیار ہو رہا ہے۔“ وہ جیسے بات کرنے کی خاطر بولے۔

”ہاں تمہیں کھتیا، ابھی خیر ہے۔ خوب سوچ لیجئے۔“

”عالیہ، مارے غصے کے جمیل بھیا ایک دم چپ ہو گئے۔ تم مجھے چڑا کر خوش ہوتی ہو؟“ چند لمحوں بعد وہ بولے تو ان کی آواز میں لرزش تھی۔

”بھئی حد ہے، آپ تو ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہوتے ہیں۔“ وہ ہنسنے لگی۔ اس نے سوچا کہ بات یوں ہی ہنسی میں مل جائے تو ٹھیک ہے، جمیل بھیا تو سنت سنجیدہ ہو رہے تھے۔

”عالیہ! انھوں نے پکارا۔

”ہوں“ عالیہ نے سرتک نہ اٹھایا۔

”ذرا یہ ڈو پیٹہ تو اوڑھ کر دکھاؤ۔ ان کی آواز جزبات کے بوجھ سے بھاری ہو رہی تھی۔“

”کیوں۔“

”بس یہی دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم دھن بن کر کیسی لگو گی۔“

”آپ کی دھن کے لیے بھی ایسا ڈو پیٹہ ایک دوں گی۔“

”میری کوئی دھن نہیں؟“

”کیئے تو آپ کی چار شادیاں کر لاؤں؟“

”بیویوں کا کیا ہے۔ وہ تو بہت سی مل جائیں گی مگر مجھے میری دھن کبھی نہ ملے گی۔“

تم میری شادیاں کرنے کی زحمت نہ کر دو اچھا ہے۔“

جمیل بھیا کی آنکھوں میں ایسا دکھ تھا کہ وہ ڈوب کر رہ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ

سے ڈو پیٹہ کو اس طرح تان لیا جیسے اب سر پہ ڈال لے گی۔ وہ اس وقت تو جمیل بھیا کی

فرمائش ضرور پوری کر دے گی۔ جمیل بھیا اسے کس شوق سے دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک دم جیسے

وہ چونک پڑی۔ اس نے ڈو پیٹہ کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

اگر آج اس نے یہ ڈو پیٹہ اوڑھ لیا ہوتا تو پھر ہی ڈو پیٹہ گھونگھٹ بن جاتا۔ اور یہ

گھونگھٹ اس کی آنکھوں پر پردہ بن کر پڑ جاتی۔ اس گھر میں ایک اور بڑی چچی زندگی کی

راہ پر بھٹکنے کے لیے جنم لے لیتی اور پھر ملک آزاد ہوتا رہتا۔

”تم یہ دوپٹہ اوڑھنا چاہتی ہو مگر زبرد ہو۔ جمیل بھیا پھر آپے سے باہر ہونے لگے

جانے تم کس قسم کی لڑکی ہو۔“

”جمیل بھیا صاحب، آپ اپنی اماں کی زندگی سے عبرت حاصل کیجئے، کسی سیدھی

سادھی عورت سے شادی کر لیجئے۔ اور بس، وہ سب سہ جائے گی۔“

جمیل بھیا نے اسے غور سے دیکھا، شاید وہ اس کے طنز کی گہرائی کو پار کر گئے تھے۔

”مجھے نہیں معلوم کہ میرے باپ کس مٹی کے بنے ہیں، بہر حال یہ خیال غلط ہے کہ ماک کا غم

گھروں کے غموں سے نجات دلا دیتا ہے۔ یا سیاست میں حصہ لینے والے کسی سے محبت

نہیں کرتے۔“ وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”تم اس شخص کے دکھ کا اندازہ لگا ہی

نہیں سکتیں جس کا کوئی ارمان پورا نہ ہوا ہو۔“

وہ ذرا دیر ٹھہر کر چلے گئے مگر عالیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جواب دینا بھی نہ

چاہتی تھی۔ اس وقت جمیل بھیا کے سامنے وہ کسی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنے کی طاقت نہ رکھتی

تھی۔ اس وقت اسے ان کے دکھ کا احساس ہو رہا تھا۔ مگر ان دکھوں کا علاج اس کے بس میں تھا

اس نے بھر سے دوپٹہ ٹانگنا چاہا مگر جی نہ لگا۔ نا سیدیوں کے بولوں کے بعد کتنا کتنا

بہ چھل ہو رہا تھا وہ بڑی دیر تک یوں ہی خالی الذہن سی پڑی ادھر ادھر دیکھتی رہی۔

شام کو جب وہ نیچے اتری تو کمرن بواصحن میں پانی چھڑک رہی تھیں۔ جمیل بھیا لوہے کی

کرسی پر بیٹھے انگلیاں مڑا رہے تھے اور بڑے چچا بڑے آدے میں ٹہل ٹہل کر جیتے کسی چھڑکا انتظار

کر رہے تھے۔ ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اور آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ بڑی چچی سب سے بے نیاز

تخت پر بیٹھی آگے جمیل رہی تھیں۔

۔ بڑے چچا۔ آپ کی طبیعت کسی ہڈی عالیہ نے بڑے چچا کے قریب جا کر پوچھا۔

”سر میں درد ہی بڑی“

بڑی چچی نے چونک کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ”کریمین بوا جلدی سے پلنگ بچھا دو۔ بس صحن

ٹھنڈا ہو گیا۔

”نامس جائے اس درد کا۔“ کریمین بوا برآمدے میں ایک طرف کھڑے ہوئے پلنگ اٹھا

اٹھا کر آئین میں بچھانے لگیں۔

بڑے چچا جمیل بھیا کی طرف سے کروٹ لے کر لیٹ گئے۔ عالیہ کو سخت کوفت ہو رہی تھی

کہ بیبا بس بیٹھا ہو مگر باپ کو پوچھتا تک نہیں۔ کتنا عرصہ ہو گیا۔ دونوں کے درمیان بات چیت

بند تھی۔

”تم آج درد سے گھر میں کیوں بیٹھے رہتے ہو؟“ بڑی چچی نے جمیل بھیا کی طرف دیکھا۔

”لو کری چھٹ گئی ہو اماں، سرکار کے دفتر میں سیاسی لوگوں کا گزارا مشکل ہی سے

ہوتا ہے۔“

عالیہ نے جل کر جمیل بھیا کو دیکھا۔ خوب، اسی برتے پر اپنی دھن تلاش ہو رہی تھی۔ اس

نے سوچا اور پھر جمیل بھیا کو کٹتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

”مسلم لیگیوں کی کھپت تو انگریز بہادر کے دستروں ہی میں ہوتی ہے۔“ بڑے چچا نے کروٹ

بدلے بغیر کہا۔

”آپ کا خیال بالکل غلط ہے۔“ اصل بات تو یہ ہے کہ جب کانگرس کی سفارش کر دیتے ہیں تو

پھر نوکری مل جاتی ہے۔“ جمیل بھیا بھی کیوں چپ رہتے۔

”ہوں۔“

باپ بیٹے دونوں ہی اپنے اپنے وطن کی آگ میں جل کر خود بخود کھڑ گئے اور دونوں نے

اس طرح منہ پھیر لیا۔ جیسے ایک دوسرے کو بات کرنے کےائق نہ سمجھ رہے ہوں۔ عالیہ نے

جمیل بھیا کو ملامت بھری نظروں سے دیکھا اور بڑے چچا کے پاس بیٹھ کر ہو لے ہو لے سر ہلانے لگی سااں گیلے بال جھٹکتی ہوئی غسل خانہ سے نکل آئیں اور سب کو ایک جگہ جمع دیکھ کر بڑی سبیرا کا سے پاندان اٹھا کر آخری پلنگ پر جا بیٹھیں۔

اب کیا ہوگا؟ بڑی چچی نے جمیل بھیا سے پوچھا۔

”فکر نہ کیجئے اماں، ایک بڑی اچھی نوکری ملنے والی ہے۔ آپ سب کے ٹھاٹ ہو جائیں گے“

”شکیں کی پھر کوئی خیریت معلوم ہوئی یا نہیں؟“ بڑی چچی نے اچانک پوچھا۔

اماں آپ اس کی فکر نہ کیا کیجئے۔ وہ بڑے مزے میں ہے۔ یہاں کے سارے دکھ بھول

گیا ہوگا۔ جمیل بھیا نے پھر بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔ انھوں نے عالیہ کو ساری حقیقت بتا دی تھی کہ انھیں شکیں کا پتہ تک نہیں معلوم۔

”خیر جہاں رہی خوش رہی“ بڑی چچی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”بٹے چچا آپ کا پلنگ باہر چوتھے پر بھجوا دوں، کھلی نضامیں درد کم ہو جائے گا۔“

عالیہ نے پوچھا۔ دو مختلف کسٹرز نظریات ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ تو اسے ڈر لگنے لگتا۔ شکیں کے ذکر سے وہ پریشان تھی۔ جمیل بھیا موقع پر چوکنے کا نام نہ لیتے۔

”ہاں وہیں بستر لگوادو تو بڑا اچھا ہو“ بڑے چچا نے اسے ممنونیت سے دیکھا اور

پھر باہر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

گلی میں کانگریسی بچوں کا جلوس نکلی رہا تھا وہ بڑے بے ہنگم طریقے سے شور مچا رہی

تھی ”جھنڈا اونچا رہی ہمارا“ کانگریسی زندہ باد“ گاندھی جی زندہ باد۔ جو اہر

لال نہرو زندہ باد۔ ہندوستان نہیں بٹے گا۔ جھنڈا اونچا رہی ہمارا۔“

بڑے چچا کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ پھیل گئی ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں

جمیل بھیا ہنس رہی تھی۔ اور اماں جو بڑی دیر سے چپ بیٹھی تھی اسی کاٹ رہی تھیں۔ آخر

بول ہی ٹپینا پہلے آزادی تو مل جائے۔ پھر سب ہوتا رہے گا۔ اور پھر یہ ہندوستانی لوگ پہلے
حکومت کو ناسمجی تو سیکھ لیں۔

سب چپ رہ کر کسی نے بھی تو آماں کو جواب نہ دیا۔ باہر بڑے چچا کا بستر لگ گیا تھا۔ وہ
چلے گئے اور جمیل بھیا کھیر انگلیاں مڑبڑانے لگے۔ جلوس کا شور دروازے کے قریب ہوتا جا رہا تھا
تھمسی دیوانوں کی طرح بھدر بھدر کرتی اپنے کمرے سے نکلی بڑھی۔ "اگر میرے دروازے کے
پاس سے جلوس نکلا تو ڈھیلے ماروں گی۔ وہ دروازے کی طرف لپکی۔

"خبردار جو آگے بڑھیں بیٹھ جاؤ چپکے سے۔" جمیل بھیا زور سے گرجے اور تھمسی جانے کے
ریعب میں آگئی اس نے جمیل بھیا کو گھور کر دیکھا اور بڑبڑانے لگی "ہونہہ! بڑے آئے بے چارے آج ہی
مسلم لیگ کا جلوس نہ نکالا ہو تو میرا نام تھمسی نہیں جلوس دراصل دروازے کے پاس سے گزر گیا۔ تو
جمیل بھیا کپڑے بدل کر باہر چلے گئے۔ تھمسی جیساں کے جانے کا انتظار کر رہی تھی جمیل بھیا کا
جاتے ہی برقع ادرٹھ کر خود بھی باہر نکل گئی۔ عالیہ اسے روک نہ سکی۔

زمانے زمانے کی بات ہو۔ پہلے تو جب بی بیایاں گھروں سے نکلتیں تو دو دو چار چار
ماما میں ساتھ ہوتی تھیں "کریمین بوا تھمسی کے دل باہر نکل جانے پر ہمیشہ کڑھا کرتی۔
عالیہ نے کو اڑوں کی اوٹ سے جھانک کر باہر دیکھا بڑے چچا اپنے صاف ستھرے
بستر پر یازن کھیلانے سکون سے لیٹے تھے اور اسرار میاں ان کے قریب آرام کر سی پر بیٹھے
باتیں کر رہے تھے۔ سامنے پیپ کے گھنے درخت سے چاند کی روشنی ابھرتی معلوم ہو رہی تھی
عالیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی باہر چوتڑے پر جا بیٹھے۔ اسرار میاں کی باتیں سُننے۔ انھیں
پاس سے دیکھے۔ وہ کس طرح بولتے ہیں، وہ کیسی باتیں کرتے ہیں وہ جو اس کے دادا کی
بدذمتی کا نتیجہ ہیں۔ ان کی سان کی آنکھوں میں کونسی کیفیت ہوگی۔ اپنے آپ کو پہچاننے کے
بدکون سے اثرات ان کے چہرے پر لڑاں ہوں گے۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے اور جب

وہ یہ سب کچھ معلوم کر لے گی تو ایک بار انہیں چپکے سے اسرار چچا کہے گی کہ وہ بھی اسے بڑے
 چچا کی طرح عزیز ہیں وہ ان کی بے حار عزت کرتی ہے۔ اور زندگی میں ایک بار ان کی خدمت
 کرنا چاہتی ہے اور وہ ان کے دل سے ان تمام تیروں کو کھینچ پھینک دے گی جو کرکین ہوانے
 بیوست کیے ہیں۔ وہ انہیں سمجھائے گی ان کی کسی بات کا برا نہ مانا کریں۔ وہ کسی کی دشمن نہیں
 وہ خود کچھ نہیں کہتیں۔ یہ ظالم شاہان سے سب کچھ کہلواتا ہے۔

» عالیہ بیٹی۔ ایک پان کھلا دو۔ « بڑی چچی نے فرمائش کی۔ تو وہ سخت پر آکھٹی اور
 پانہ ان کھول کر پان بنانے لگی۔ باہر چوتھے پر جا کر نہیں بیٹھ سکتی۔ اسے عجیب سی بے بسی کا
 احساس ہو رہا تھا۔

محلے کی مسجد سے اذان کی آواز آرہی تھی۔ اس نے بارے احترام کے ساری کا پلو سر پر
 ڈال لیا۔ کرکین پو اجلدی جلدی لالینیں جلا رہی تھیں۔

» اللہ شکیل کو خیر سے رکھیو۔ بڑی چچی دونوں ہاتھ پھیلا کر دعا کرنے لگیں۔ وہ اس
 وقت کتنی دکھی اور ماتا سے بھر پور نظر آ رہی تھیں۔

اندھیرا ہر طرف در آیا تھا۔ مگر تھپی اب تک گھر نہیں لوٹی تھی۔ عالیہ کو خواہ مخواہ
 فکر ہو رہی تھی، نیسے گھر میں اور کسی نے نہ پوچھا کہ وہ ہے کہاں۔

ذرا دیر بعد تھپی آئی تو منہ سُرخ ہو رہا تھا۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ « اسے
 بجیا میں نے ایسا شاندار جلوس تیار کر آیا ہے کہ آپ دکھتی رہ جائیں گی۔ بس ذرا دیر میں

ادھر سے گزرنے والا ہے۔ غدرا کی اماں نے جھنڈا بنایا طاہرہ کی اماں نے ایک بوتل مٹی کا تیل
 دیا تھا۔ میں نے شعلیں تیار کیں، سارے محلے کے لڑکوں کو جمع کر دیا ہے۔ ہائے بڑے چچا دکھیں

گے تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ میں نے سارے بچوں کو سمجھا دیا ہے کہ میرے دروازے پر آکر خوب
 نعرے لگائیں۔ « تھپی ایک ہی سانس میں سب کچھ کہ گئی۔ اور پھر برقعہ پھینک کر جاؤس

کے انتظار میں ٹھٹھنے لگی۔

خوشیوں کا کوئی پیمانہ اس وقت چھٹی کی مسرت کو نہیں ناپ سکتا تھا۔ عالیہ نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پریشان ہو رہی تھی کہ کہیں یہ ننھے منے بچوں کا جلوس گھر میں فٹا نہ کرادے اس نے بھی بہتر سمجھا کہ اوپر اپنے کمرے میں کھسک لے۔ دوسرے بچوں کے نعروں کی آواز آرہی تھی۔

بڑے کمرے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ نجمہ بھوپھی اپنے صاف ستھرے بستر پر بیٹھی کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہی ہیں۔ گرمیوں میں بڑی چھت پر نجمہ بھوپھی کا ڈیرہ جتا تھا اس لیے وہ اپنے کمرے کے پاس والی چھوٹی چھت پر گزارا کر لیتی۔ اتنی قابل نجمہ بھوپھی کا ادراہ اس کا ساتھ کیسے ہو سکتا تھا۔

جلوس قریب آگیا۔ بچے بڑے زور زور نعرے لگا رہے تھے "مُسلم لیگ زندہ باد قائد اعظم زندہ باد" بن کے رہے گا پاکستان، دھتیاراج نہیں ہوگا۔ چٹیاراج نہیں ہوگا۔ عالیہ چھت کی منڈیر سے جھک کر گلی میں جھانکنے لگی، دو بڑے لڑکے مشعلیں اٹھائے سب سے آگے تھے۔

"نہیں دیکھنے دیا ظالم نے۔" چھٹی بھاگتی ہوئی آئی اور عالیہ کے برابر کھڑے ہو کر نیچے گلی میں ادھی لٹک گئی۔ "ہائے کیا شاندار جلوس ہے، وہ آپ کے بڑے چچا نے مجھے درد از سے جلوس نہیں دیکھنے دیا۔ جل کر خاک ہو گئے حضرت!"

"چھٹی ذرا سرک کر جھاٹو کہیں جلوس کے ساتھ تمھاری لاش بھی نہ نکل جائے"

عالیہ نے چھٹی کے لٹکنے ہوئے دھڑک کر اپنی طرف کھینچا۔

"ہائے بچیا۔ میں نے مشعلیں کیسی اچھی بنائی ہیں۔ ہیں نا؟" چھٹی نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔ "کج آپ کے بڑے چچا جلتے جلتے ختم ہو جائیں گے"

”تھمتی، کیسی باتیں کرتی ہو۔ بس پتہ چل گیا کہ لگی دیکھی کچھ نہیں ہو، بڑے چچا کو جلا
کے لیے یہ سوانگ رچا یا ہو۔“

”واہ، ہاں کیوں نہیں؟“ وہ شرمندہ سا ہو گئی اور عالیہ کے گلے میں ہاتھ ڈال
کر تھبول گئی۔

جلوس گئی کے موٹر پر غائب ہو گیا۔ تو تھکی تھکی سی تھمتی عالیہ کے بستر پر لیٹ کر لمبی
لمبی سانس لینے لگی۔ اور عالیہ خاموشی سے ٹہلتی رہی۔ اب کتنے دن یوں صبح کو جلا نے
کے لیے تھمتی بیٹھی رہی گی۔ آخر تو ایک دن اپنے گھر چلی ہی جائے، جا جائے وہ گھر بھی اس کا
گھر بنے گا کہ نہیں۔ تھمتی کو وہاں محبت ملے گی یا نہیں کیا وہاں بھی سب سے بدلے چکانے کے
طریقے ایجاد کر کے زندگی گزارے گی۔

”عالیہ بیبا اور تھمتی بیبا دونوں کھانا کھانے نیچے آ جاؤ“ کہہ کر مین بوا کی آواز آئی۔

(۳۳)

وہ پاس ہو گئی تھی مگر اب پورا سال برباد جا رہا تھا۔ وہ بی۔ ٹی کرنے علی گڑھ نہ جا سکی
بس اتنی سی بات تھی کہ وہ اپنے قلم سے لکھ کر ماموں سے زیادہ روپوں کی فرمائش نہ کرنا چاہتی
تھی جب اماں سے بات ہوئی تو انہوں نے بڑے لاڈ سے کہا تھا کہ اپنے ماموں کو لکھو۔ وہ
زیادہ روپے بھجوا دیں گے۔ اس وقت عالیہ نے سختی سے انکار کر دیا تھا اس نے یہ تک کہہ دیا تھا۔
کہ وہ انہیں خط لکھنا پسند نہ کرتی تھی۔ بس اسی دن سے اماں نے مسخہ پھیلایا تھا اپنے کھانسی اور
انگریز بھارج کے لیے اپنی اکلوتی اولاد کے دل میں عناد پا کر ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی
انہوں نے عالیہ سے بات کرنا سچوڑ دی تھی اور اس طرح ایک قہرٹی سال ضد کی بازی پر ہار دیا تھا۔
ارے اُردو لے کر بی اے کر لیا۔ یہی غنیمت ہے اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ مغرب، ایک دن تھمتی

بول ہی پڑیں شاید انھیں یقین ہوگا کہ بس اب تعلیم کا سلسلہ ختم۔ عالیہ نے سُن کر مُنہ پھیر لیا۔ وہ اس کے آبا کی بہن تھیں۔ وہ ان کے مُنہ نہ لگنا چاہتی تھی۔ اگر اس کے حالات نہ خراب ہوتے تو ایم اے بھی اُردو ہی میں کرتی۔ اُردو تو اس کی مادری زبان تھی اس کے جیتے چچا کی زبان تھی۔ بڑے چچا تو انگریزی زبان تک سے نفرت کرتے تھے۔ انھیں کے کہنے سے اس نے بی اے میں اُردو بھی لی تھی اُسے خود انگریزی زبان سے نفرت نہ تھی اور نہ وہ نالائق تھی وہ تو انگریزی میں ایم اے کر کے تخرمہ بھوپھی کے مُنہ پر اپنی ڈگری مار سکتی تھی۔ مگر یہ سب کچھ کرنے کے لیے اُسے بڑے چچا کا حکم ماننا پڑتا

ستمبر کی بیس تارخ تھی کے نکاح کے لیے مقرر ہو چکی تھی۔ اماں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود عالیہ نے تھی کا سارا جہیز تیار کیا تھا۔ اسرار میاں نے بازار کے چچا سوں چکر لگانے کے بن۔ تھی کے جہیز کے برتن خریدے تھے۔ نقشین ٹوٹا، کٹورا، جگ، اگالداں، پاندان، دپیلیا اور چھ پٹیں جب بس میں رکھی جا رہی تھیں تو کریمین بوادیر تک سرگڑے مٹی رہیں۔ ان کی آنکھوں کو یہ زمانہ بھی دیکھنا تھا کہ ان کے مالک مرحوم کی پوتی کو ایسا جہیز دیا جائے، اچھے زمانے میں تو ایسا جہیز باندیوں کی بیٹیوں کو دے کر رخصت کیا گیا تھا۔ بس اتنا ہی فرق تھا کہ وہ برتن نقشین نہ ہوتے تھے۔

جب بڑی چچی برتن بند کر کے اٹھیں تو کریمین بوا کو بے سجا شاردنا آ گیا۔ بڑی چچی نے انھیں سمجھا بچھا کر بڑی مشکل سے چپ کرایا۔ کیا فائدہ تھا چھی کو پہلے سے خبر ہو جائے سب اُس سے ڈرے ہوئے تھے، بڑے چچا کی لگائی ہوئی شادی سے کہیں انکار ہی نہ کر دے۔

بڑی چچی کو شادی کے دن کا سخت انتظار تھا۔ شادی میں شریک ہونے کے لیے ساجدہ آیا بھی آ رہی تھیں۔ ساجدہ آپا کی شادی کو کتنا عرصہ گزر گیا تھا مگر بڑی چچی گھر کے دھندوں سے چھٹ کر ایک دن کے لیے بھی اپنی بیٹی کے گھر نہ جا سکیں۔ ساجدہ آپا شریعت میں تو گھراتی رہیں

پھر جیسے سب کی طرف سے صبر کرو کے بیٹھ رہیں۔ یہاں ساجدہ آبا کے لیے کون بھڑکا جا رہا تھا۔ عالیہ نے شاید دو چار دفعہ ہی ان کا ذکر کیا تھا۔ پھر میکے میں ان کے لیے کون سے جوڑے بگے رکھے تھے جنہیں لے کر خوشی خوشی رخصت ہوئیں اور مہران کے میاں بھی یہاں آنے سے کترانے۔ جب سے کانگوس کو تیسرا باد کہا تو بڑے چچا بھی ہجرت گئے تھے ان کے سامنے کس منہ سے آتے۔

جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔ عالیہ کو یہ فکر ستا رہی تھی کہ وہ تھپی کو کیا دے۔ اماں نے تو اپنے جینیر کے کپڑوں سے گلا ہوا جوڑا نکال کر تھپی کے نام لگا کر دیا تھا اس طرح وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئی تھیں۔ انہوں نے عالیہ سے مشورہ تک نہ کیا تھا عالیہ کو اپنی اماں کی اس زیادتی کا شدت سے احساس تھا۔ ادھر بڑی چچی بھی عالیہ سے کچھ کم پریشان نہ تھیں۔ جمیل بھیا کو رذرا نہ ٹھو کے دیتی رہتیں کہ کچھ روپیے کا انتظام کر کے تھپی کے لیے کپڑا خرید لائے۔ جمیل بھیا ان کی باتیں سن کر حسیب ہو رہتے۔ آج کل ٹیوشنوں سے گھر کا کچھ کام چل رہا تھا۔ نوکری وغیرہ کے سلسلے میں وہ کوئی خاص فکر مند بھی نظر نہ آتے۔ مسلم لیگ کے کارکنوں نے انہیں دنیا کی فکروں سے نجات ہی دلادی تھی۔ مگر جمیل بھیا کے سلسلے میں بڑی چچی بھی ہار ماننے والی نہ تھیں۔ جب بھی وہ گھر میں آتے، پچھلے پڑجائیں "تم کو کب ملے گی نوکری۔ منگائی نے کھا لیا ہے۔ گھر میں دھیرا نہیں پھر تھپی کی شادی کے دن قریب ہیں۔ کیا تمہاری مسلم لیگ نے کچھ دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔"

سب کچھ ہو جائے گا اماں آپ پریشان نہ ہونے دیجئے۔ جمیل بھیا شرمندہ ہو جاتے۔

"ہاں کوئی آبا کی طرح ہوں جو اپنے گھر کو تباہ ہوتے نہ دیکھوں گا۔"

"آبا کے طعنے مت دو کچھ کر کے دکھاؤ۔"

"اماں میں تو سب کچھ کرنے کو تیار ہوں مگر کوئی کرنے نہیں دیتا۔" وہ عالیہ کی نظر

دیکھنے لگتے تو وہ مہمہ پھیر لیتی۔

کون نہیں کرنے دیتا۔ میں اس کا کلیجہ کھالوں گی، وہ ہی نا تمھاری مُسک لیاگ۔ ۶
 "نہیں اماں، تمہیں بھیا زور سے ہنتے تو عالیہ اپنے کمرے میں بناہ لینے چلی جاتی اتنی
 فضول باتیں سن کر وہ اکتا جاتی۔"

ادھر کچھ دنوں سے تھمتی بالکل خاموش رہنے لگی تھی۔ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ کوئی بات
 کرتا تو اس طرح جواب دیتی۔ جیسے باگزر رہا ہی۔ کھانا کھانے کے لیے اپنے کمرے سے نکلتی
 اور پھر جا چھپتی۔ بہت ہوتا تو گراموفون پر ریکارڈ بجانے لگتی۔ اس کے چہرے سے ساری شگفتگی
 غائب ہو گئی تھی۔ عالیہ اسے یوں چپ چاپ دیکھ کر مارنے لگی تھی۔ کہیں تھمتی کو اپنی شادی
 کے سلسلہ میں شہ نہ ہو گیا ہو۔ کہیں وہ بڑے چچا کی عزت برباد نہ کر دے۔ یہ تھمتی ہی۔ ساجدہ
 آیا نہیں ہو سکتا، وہ یوں ہی چپ ہو۔ وہ اپنی اتنی سی عمر میں اتنا بول چلی ہو کہ اب تک
 تھک گئی ہوگی اور کیا پتہ وہ منظور کی جدائی میں سو گوار ہو مگر تھمتی منظور سے محبت کب کرتی
 تھی وہ تو اسے صرف سہارا سمجھتی تھی۔ اس کی محبت سے لطف لیتی تھی۔ عالیہ، تھمتی کے
 سلسلے میں سوچ سوچ کر تھکی جاتی۔ لاکھوں کے ساتھ سر کھپاتی مگر تھمتی کھی کھی کر کے
 ٹال دیتی۔

بڑے چچا دتی گئے ہوئے تھے، ہبھیک سونی بڑی تھی۔ جمیل بھیا بھی آج صبح سے
 غائب تھے۔ تھمتی گونگی بن گئی تھی اور یہ بادلوں سے لاپہندان بے حد اداس ہو رہا تھا۔ کوئی
 کام نہ تھا جس سے عالیہ اپنا جی بہلا لیتی۔ تھمتی کا جہیز تیار ہو چکا تھا۔ بڑے چچا کی لائبریری
 سے کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک چکی تھی اور اب آج اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ یہ
 رنگتا ہوا دن کسی طرح تو کٹے اور کچھ نہیں تو تھمتی ہی اسے پھیرے، اس سے لڑے، شور کرے
 یہ دیران خاموشی کسی طرح تو دور ہو۔

عالمیہ چھتی کے کمرے کی دہلیز پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ "اور نہیں چلتیں میرے کمرے میں

اس نے پوچھا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے سبیا۔" چھتی نے کر دٹ بدل لی۔ اس نے اپنی مسہری سے

اٹھنے کی زحمت تک نہ کی۔

دو تین گھنٹے کی بارش نے جیسے ساری دیرانی اور اُداسی کو دھو دیا تھا۔ شام کو

جب جمیل بھیا گھر آئے تو وہ بھی خوش نظر آ رہے تھے۔ عالمیہ نے سوچا کہ آج یہ حضرت

خوش کیوں ہیں، کون سا کارنامہ انجام دے کر آئے ہیں جو آج اسے دیکھنے کے بعد

بھی صورت پر ماتم نہ پر سا وہ تو جمیل بھیا کے لیے سچ مچ تخریب بن گئی تھی۔

، اماں، حیدرآباد سے ظفر چچا کا خط آیا ہے اور مزے کی بابت یہ ہے کہ میرے نام

ہے۔ "وہ لوہے کی کرسی پر بٹھیکر سب کی طرف دیکھ کر کہتا ہے "بھئی یہ انھیں میری شکایتیں

کون لکھتا ہے، میری بیکاری کی کس نے اطلاع دی ہے۔" ۶۔

"تمہاری خجہ بھو بھپی سے خط و کتابت ہے، انھوں نے لکھا ہے۔ اور تو کسی کو پوچھتے

بھی نہیں " بڑی جچی نے کہا۔

میرا شکایتیں لکھنے کی وجہ سے خط و کتابت ہوگی، بھلا میرا کوئی کیا بگاڑے گا۔

چھتی اپنے کمرے کی دہلیز پر بیٹھے بیٹھے بولی۔

"کیا لکھا ہے انھوں نے ۶،" اماں نے پوچھا۔

"انھوں نے لکھا ہے کہ حیدرآباد چلے آؤ۔ یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ یہ ہندوستان

پاکستان کا حصہ چھوڑو۔ یہاں تو بنا بنایا پاکستان ہے " جمیل بھیا ہنسنے لگے۔

"تو پھر چلے جاؤ نا، جہاں رو پیہ ہے وہاں سب کچھ ہے " اماں نے مشورہ دیا۔

"پھر میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔ آپ میں سے کوئی یاد نہ آئے گا۔ وہاں کے

پانی کا یہی اثر ہے۔“

”بس بو نہی بکواس کرتا رہتا ہے۔“ بڑی چچی کو غصہ آ گیا۔ پھر یہاں کوئی نوکری

کر کے دکھانا۔“

”نوکری تو مل گئی ہے اماں۔ بس اب جانے والا ہوں۔“ جمیل بھیانے ہٹامع دی۔

”کہاں۔“ مارے اشتیاق کے بڑی چچی کی آنکھیں کھل گئیں۔

فوج میں بھرتی ہونے کی درخواست تھی سو منظور ہو گئی اور اب بندہ آپ کو ڈھیریں

رد پے بھیجا کرے گا۔“

”فوج میں؟“ بڑی چچی کی آنکھیں اس طرح ساکن ہو گئیں جیسے وہ مر گئی ہوں۔

ارے تو بولا گیا ہے۔ جمیل پھر مجھے زہر کیوں نہیں دے دیتا۔“

”بھئی حد کرتی ہیں اماں، ہزاروں آدمی فوج میں جاتے ہیں تو کیا سب مر جاتے

ہیں اور پھر جناب اگر ہٹلر کا مقابلہ نہ کیا تو انگریزوں سے بدتر ثابت ہو گا۔ اس کی غلامی

بھینا آسان نہ ہوگی۔“ جمیل بھیانے سمجھانا چاہا مگر بڑی چچی بے بسی کی تصویر بنی سمجھی تھیں

عالیہ کا جی چاہا کہ جمیل بھیا کو چیخ چیخ کر کہنے، ظالم کہہ۔ یہ اپنا بے روزگاری دور کرنے

نہیں جا رہی ہیں۔ اور یہ نہیں جانتے کہ وہ خود اپنی اماں کے لیے کتنے عظیم ہٹلر ہیں۔

”اب اپنا نام کڈ لو جمیل میاں۔“ کریمین بوانے بڑی التجا سے دیکھا تو جمیل بھیا ہنس

پڑے۔ ”کریمین بوا میں تو صرف تمہاری خاطر جا رہا ہوں۔ تمہارا باورچی خانہ آباد ہو جائے

گا۔ اور تم گزرے ہوئے زمانے کو بھول جاؤ گی۔“

بڑی چچی رونے کے قریب ہو رہی تھیں۔ ”جنگ پر جانے کے بجائے تم بھی شکیل کی طرح

جھاگ جاتے تو پھر مجھے صبر آ جاتا۔“ وہ رد پڑیں۔

”میری اماں۔“ جمیل بھیا ان کے لپٹ گئے۔ اماں، کوئی میں بندوق اٹھا کر لپٹوں گا

بھئی میں تو قلم سے لڑوں گا۔ میں تو صرف ہٹا کے خلاف پروپیگنڈا کروں گا۔ اور انچا اماں کی خدمت کروں گا۔“

”تم لڑو گے نہیں۔“ بڑی چچی نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

”قطعی نہیں اماں، میں تو دوسرے ہی کام کروں گا۔“

”کیسے؟“ ”نخبہ کھوپڑی نے پوچھا۔ وہ جانے کیسے اس وقت سب کے بیچ میں

آئی تھی۔“

”میں فوج میں جا رہا ہوں۔“ جمیل بھتیانے فوراً جواب دیا۔

”بہت اچھی بات ہے، اب اتنی تعلیم پر اور کوئی نوکری بھی کیسے ملتی؟“ نخبہ کھوپڑی

نے اطمینان کی رائی لیا۔

”بالکل درست، وہ تو کیسے کہ عورتوں میں تسلیم نہ ہونے کے برابر ہو ورنہ آج آپ

بھی بے کار پھرتی، موتیں۔“

نخبہ کھوپڑی اسے بیروں واپس بولیں، بھلا ان جاہلوں کے کون منہ لگے۔ اس گھر میں

ان بے چاری کی قابلیت کی ذرا بھی تو عزت نہیں۔ عالیہ کو منہسی آ رہی تھی۔

سب سے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ لڑو گے نہیں۔“ بڑی چچی نے جمیل بھتیانے کا ہاتھ اپنے

سر پر رکھ لیا۔

”اس سر عزیز کی تم اماں۔“ جمیل بھتیانے قہقہہ لگا یا تو سب منہس دیئے اور چچی جو اتنی

دیر سے چپ بیٹھی تھی ایک دم اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا منہ سُرخ اور ہاتھ تھا۔

(۳۳)

جمیل بھتیانے چلے گئے۔ جانے سے پہلے رات گئے عالیہ سے رخصت ہونے اس کے کمرے

میں آئے تھے اور بڑی دیر تک اس کے پاس کرسی پر بیٹھے پاؤں ہلاتے رہے تھے دونوں خاموش تھے اور باہر بارش ہوئی چلی جا رہی تھی۔ عالیہ کو اپنی کمزوری پر غصہ آ رہا تھا۔ آخر وہ کیوں نہیں بولتی۔ وہ اتنی خاموشی کے ساتھ کس سوگ کا اعلان کر رہی ہے۔

دُت گزرتا جا رہا تھا۔ بارش اب ہلکی ہو گئی تھی۔ خاموشی اور تپیل بھیا کی موجودگی سے اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ "آپ صبح جا رہے ہیں؟" عالیہ نے بڑی ہمت کر کے پوچھا۔ "ہاں جا تو رہا ہوں، پھر؟" جمیل بھیا نے سخت اکھڑپن سے جواب دیا۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ جانے وہ اپنے کس جذبے کا گایا گھونٹ رہے تھے۔ جوان کی آنکھیں مارے درد کے جھنجھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

"پوچھنا کوئی گناہ تو نہیں" عالیہ نے سر جھکا لیا۔ جمیل بھیا کے جواب سے دل پر چوٹ لگی تھی۔

"تم مجھے یاد کرو گی عالیہ؟" جمیل بھیا نے جیسے جھپٹ کر اس کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔ "نہیں! میں آپ کو کس لیے یاد کروں گی؟" آپ میرے لیے میرے چچا زاد بھائی۔ یہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ میں آپ کو اور کچھ سمجھنا بھی نہیں چاہتی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے مرد کی محبت پر اعتبار ہی نہیں۔ اور اگر فرض کر لیجئے کہ کبھی اعتبار کیا بھی تو وہ آپ جیسا نہیں ہوگا۔ ابا اور بڑے چچا جیسا بھی نہیں ہوگا۔ پر امی آگ میں جلنے والے اپنی گھر پلو آگ سے ہمیشہ بے خبر رہتے ہیں۔ بہر حال میں جسے چاہوں گی اس کے لیے کچھ نہیں بتا سکتی کہ کیا ہوگا آپ سے۔ یہ سب کچھ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ آپ وہاں اتنی دور رہ کر مجھے کبھی یاد نہ کریں گھر سے دور رہ کر اور سب کو چھوڑ کر ان کی یادیں بہت اذیت ناک ہو جاتی ہیں تو آپ آج ہی اس اذیت سے ٹھیکارا پا لیجئے۔ جہاں تک گھر اور بڑی چچی کا سوال ہے تو وہ آپ کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ بڑی چچی اور کتنے دن حسین گی؟" عالیہ کی آنکھوں میں آنسو

آگے تھے۔ جانے کیوں وہ اس وقت جی بھر کر رونا چاہتی تھی۔

”تم نے بہت اچھا کیا جو سب کچھ کہہ دیا۔ اگر تم نہ بھی کہتیں تو مجھے معلوم تھا ویسے میں تم کو یہ بتا دوں کہ اماں مجھے بہت عزیز ہیں اور جہاں تک پرانی آگ کا تعلق ہے تو وہ پرانی نہیں، میری اپنی آگ ہے، اس آگ میں جل کر میں ذرا بھی جلن نہیں محسوس کروں گا کاش اس آگ کو اور کھڑکانے والا کوئی ساتھی بھی ہوتا۔ تم میں اور چھٹی میں فرق کیا ہے۔ خیر خدا حافظ۔“ جمیل بھیا اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”مگر ایک بات تو بتاؤ کہ کیا بدلے کی قابل ہو، میرا خیال ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا بدلہ ضرور چاہتا ہے۔ تو مجھ بھی جانے سے پہلے بدلہ چاہیے۔ شاید یہی بدلہ وہاں اتنی دور میرے لیے تسکین کا سامان بن سکے جمیل بھیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں تو وہ کانپنے لگی تھی۔

”کیا بدلہ؟“ وہ جانتے بوجھے انجان بن رہی تھی۔

ذرا دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ جمیل بھیا اُسے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی نظروں میں تلخی تھی، کچھ کھو جانے کا دکھ تھا۔ کچھ پالنے کی تمنا تھی۔

”میں آپ کو کیا بدلہ دے سکتی ہوں۔؟“ اس نے جمیل بھیا کو چونکایا تھا۔ اب وہ اُن کی نظروں کا مقابلہ نہ کر پا رہی تھی۔

”بس یہی۔“ جمیل بھیا نے آگے بڑھ کر اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ اُسے پاگلوں کی طرح چوم رہے تھے۔ اُسے اپنے سینے میں جذب کر رہے تھے اور وہ ذرا سی مزاحمت بھی نہ کر سکی تھی وہ نفرت سے انھیں دھکا بھی نہ دے سکی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ سب اتنے اچانک کیسے ہو گیا تھا۔ اور وہ یہ سب کچھ کیسے قبول کر رہی تھی۔ اور پھر جمیل بھیا جیسے اُسے بستر پھینک کر چلے گئے تھے اور وہ مارے مارے بسی کے روتے لگی تھی۔ کھلا وہ کس بات کا بدلہ چکانے پر رضی ہو گئی تھی وہ خود کو ملامت کرتے کرتے جانے کب سو گئی۔

جسٹیل کھیا صبح صبح چلے گئے تھے، وہ تو اس وقت سو کر بھی نہ اٹھی تھی۔ چچی اسے جگا کر
شکایت کرنے آئی تھی۔ بجایا آپ سوئی رہیں۔ آپ نے تو جہاں بھیا کو خصلت نہ کیا۔ اچھا ہوتا کہ
ابھی کچھ دن اور نہ جاتے۔

”کیوں۔“ بستر سے اٹھتے ہوئے اس نے چونک کر چچی کو دیکھا۔ ”یہاں سے کن دنوں
کا انتظار ہے۔“

”بس نہ جاتے۔“ وہ گڑ بڑا گئی بے چاری بڑی چچی سخت رنجیدہ ہو رہی ہیں، اس اولاد
کا بھی کوئی سکھ نہیں ملتا۔ کیوں پالتی ہیں مائیں۔ میں سب سے اچھی جو خود بخود پہل گئی میرے
لیے کوئی دکھی نہیں۔“ چچی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”ماں بے چاری بڑی چچی کو کوئی سکھ نہ ملا۔“ عالیہ نے کہا اور چچی کا ہاتھ تھام کر
نیچے اتر آئی۔

یشٹیل کھو گیا۔ جسٹیل کھیا جنگ پر چلے گئے۔ بڑی چچی مٹی جون کی پیٹیا چڑیا کی طرح نظر
آ رہی تھیں۔

”اللہ سے خیریت سے رکھے۔ گھر میں پیسہ تو آئے گا۔ بڑی بھابھی، آپ کو سکھ تو
ملے گا۔“ اماں بڑی چچی کو سمجھا رہی تھیں۔ اور وہ خاموش بیٹھی ٹھنڈی سانس بھر رہی تھیں
زمانے زمانے کی بات ہے۔ آج مالک مرحوم کی اولاد میں نوکر یوں کی تلاش میں کہاں
کہاں جا رہی ہیں۔ کبھی وہ زمانہ بھی تھا کہ دولت اپنے قبیلوں چل کر آتی تھی اور کوئی اُسے اٹھا کر
رکھنے والا نہ تھا۔ کریمین بوا کی نظر میں جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

دوپہر میں بڑی چچی نے کپڑوں کا ایک بندل عالیہ کو تھما دیا۔ یہ کپڑے جسٹیل چچی کے لیے تھے
گیا ہے۔ اور کہہ گیا ہے کہ عالیہ سے سلو لینا۔ سب کا خیال تو کرتا ہے مگر اس بڑے وقت نے
اُسے دُور جانے پر مجبور کر دیا۔ اگر کوئی اچھی سنی لو کری مل جاتی تو پھر وہ کیوں جاتا۔

خدا انھیں خیریت سے پس لائے گا۔ بڑی چچی آپ پریشان نہ ہوں۔ " وہ کپڑے لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ تھمتی کو یہ کپڑے دکھا دے۔ اور اسے بتائے کہ جمیل بھی اس کے لیے دے گئے ہیں۔ مگر کس لیے، وہ اس کا کیا جواب دے گی۔ اسے تھمتی سے ڈر لگتا تھا۔ شادی میں صرف پندرہ دن رہ گئے تھے۔

شام کو بڑے چچا دلی سے آ گئے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ جمیل بھی فوج میں چلے گئے ہیں۔ تو ایک دم مبلا اٹھے۔ "ارے اس نالائق سے اور کیا ہو سکتا تھا۔ انگریزوں کی مدد کر کے ہی تو پاکستان بنائے گا، یہ سب انگریزوں کے ٹھہروں میں۔"

"تو کیا اللہ مارے کافروں کا ساتھ دیتا؟" اماں نے فوراً جواب دیا۔ اور بڑے چچا سر جھکا کر رہ گئے۔

"آپ کپڑے وغیرہ تو بدل ڈالیے بڑے چچا۔ سفر سے تھک گئے ہوں گے، ذرا دیر آرام کر لیجیے۔ عالیہ نے باتوں کا رنج بدلنا چاہا۔ بڑے چچا کا تھکا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کا دل مل رہا تھا اتنے دن بعد وہ گھر آئے ہیں تو اب انھیں آرام کی ضرورت ہے۔"

کریمین بوا چلے تیار کر رہی تھیں۔ اور بڑی چچی ان کے کبس سے کپڑے نکال رہی تھیں عالیہ ان کا سامان اٹھا کر کمرے میں رکھ آئی۔

بڑے چچا کپڑے تبدیل کرنے کے بعد بڑی چچی کے کمرے میں سہری پر لیٹ گئے۔ شاید وہ اتنے تھک گئے تھے کہ بیٹھاک تک جانے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ کریمین بوا نے سر ہانے رکھی ہوئی تھی تیبا پر لائین رکھی۔ عالیہ ان کے پاس بیٹھ کر سر دبانے لگی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے، یہ لنگی ملک کو بانٹ نہ دیں۔" بڑے چچا نے دکھ سے کہا۔

"ہاں ڈر تو مجھے بھی ہے۔" اس نے بڑے چچا کا دل رکھنے کے لیے ہاں میں ہاں ملائی

"تم نے دیکھا جمیل فوج میں چلا گیا، یہ میری اولاد ہے۔"

بہت بڑا کیا بڑے چچا " وہ ہاں میں ہاں ملائے جا رہی تھی۔ وہ ان سے یہ کس طرح بوجھ سکتی تھی کہ اگر تمہیں کبھی جنگ پر نہ جاتے تو پھر ان پیٹوں کی بھٹی کو کیسے سرد کیا جاتا۔

”منظر کا خط آیا۔ ۶“

ادھر کچھ دنوں سے نہیں آیا " وہ ایک دم رنجیدہ ہو گئی۔ اُسے آبا کے خط کا کتنا انتظار تھا۔ وہ ساری کے پلو کو اس طرح مڑوڑنے لگی کہ سہرے ہو گیا۔ بہت پرانی ہو گئی ہے " وہ شرمندہ ہو کر منہسی۔

"ارے ہاں تمہارے کپڑے تو اب بہت پرانے ہو گئے ہیں۔ نئے کپڑے بنے بھی تو نہیں " وہ بھی شرمندگی سی منہسی ہنسی۔

"ابھی تو میرے پاس کئی جوڑے رکھے ہیں " وہ صفا جھوٹ بول گئی۔ جانے کیوں وہ بڑے چچا کو ایک لمحے کے لیے بھی شرمندہ دیکھنے کو تیار نہ تھی۔

بڑے چچا جانے کیا سوچنے لگے اور پھر انہوں نے اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے سو رہے ہوں۔ عالیہ دبے قدموں برآمدے میں آگئی۔ کمرے میں کتنی جلدی رات ہو گئی تھی۔ مگر باہر تو ابھی مغرب کا وقت بھی نہ ہوا تھا۔ کریمین بوالاٹینوں کی چیمیاں صاف کر رہی تھیں اور چھٹی صحن میں کرسی پر مٹھی بس بارہ سال کے ایک بھکاری لڑکے کو باہی روٹی کھلا رہی تھی۔ ایہ بہت اچھا گاتا ہے سچیا۔ میں نے زنیب کی ماں کے گھر گاتے سنا تھا " عالیہ کو دیکھتے ہی چھٹی نے تعارف کرایا۔ بس اب گاؤ " چھٹی نے حکم دیا۔

منہسی کے دہن سے ہاتھ منہ صاف کرنے کے بعد لڑکا آنکھیں بند کر کے گانے لگا۔

چڑیوں نے باغ اجاڑا، پتہ پتہ جاگ ڈارا

عالیہ کو اس کی آواز بڑی اچھی لگی وہ بڑے شوق سے سن رہی تھی۔ مگر چھٹی کو

جاتے کیا ہوا کہ اچانک سسکیاں بھرتی اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔ اور لڑکا گھبرا کر
سب کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر بھیک کی پوٹلی سمیٹ ڈرا ڈرا سا بھاگ نکلا بس عالیہ
پریشان کھڑی رہ گئی۔ چھٹی دیوانی نے اس گانے سے کون سے روتے کے ہیبتناش
کر لیے مگر اس نے دیکھا کہ بڑی چچی بھی تو آنسو پونچھ رہی تھیں۔

”یہ زمانے بھی آگئے کہ بھکاری لڑکے بنی بوں کے پاس ٹھہرا گانے گائیں۔“
مالان کی محراب کے کندے میں لالٹین لٹکاتے ہوئے کریمین بوا بڑ بڑا رہی تھیں۔

”کریمین بوا ایک پیالی چائے بنا لادو۔ پڑھتے پڑھتے سرد کھنے لگا ہو۔“ کھڑکی سے
جھانک کر تجربہ بھوپنی نے حکم دیا۔ اور کریمین بوا چوٹھے کی طرف سرک گئیں۔

عالیہ نے تجربہ بھوپنی کی طرف دیکھا اور منہ پھیر لیا ہر وقت انگریزی کی موٹی موٹی
کتابیں پڑھ پڑھ کر تجربہ بھوپنی کی آنکھوں میں کیسے حلقے پڑ گئے ہیں۔ آخر یہ کس
لیے پڑھتی ہیں؟ یہ سب کس کام آتا ہو۔ یہ سب صرف اس لیے ہو کہ صحیح انگریزی
بولنے پر فخر کر سکیں۔

اب اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اور صحن میں پڑی ہوئی لوہے کی کرسی اس
اندھیرے میں ڈوبتی محسوس ہو رہی تھی۔ تبدیل بھیا کا سفر ختم ہوا ہو گا کہ نہیں۔
عالیہ کو بار بار خیال آ رہا تھا۔

”کریمین بوا، پرکاش بابو آئے ہیں۔ بڑے بھیا کو تبادو۔“ بیٹھک سے ہسرار میاں
کی آواز آئی۔

”انھیں کوئی آرام بھی نہیں کرنے دیتا۔ وہ سو رہے ہیں۔ وہ اس وقت نہیں
آئیں گے۔“ کریمین بوا نے تھکا کر جواب دیا۔ مگر بڑے چچا تو جیسے ہسرار میاں کی آواز
کے منظر تھے۔

شادی سے چار دن پہلے ساجدہ آپا اپنے چار عدد تے اد پر بچوں کے ساتھ آگئیں
 بڑی چچی مدت سے بچڑی ہوئی بیٹی کو گلے لگا کر دیر تک روتی رہیں۔ اور پھر ساری مٹی موٹی
 خبریں سنا ڈھولیں۔ شکلیں کا بھاگ جانا، حمل بھیا کا نوج میں جانا اور تھپی سے شادی کی
 خبر چھپانا۔ اتنی بہت سی دردناک خبروں کو سن کر ساجدہ آپا کا رنگ پیلا ہو گیا تھا اور بھالی
 کی جدائی کے غم میں وہ دیر تک سر بوڑھائے مٹھی رہیں۔

عالیہ نے اماں کی زبانی سنا تھا کہ ساجدہ آپا خوبصورت ہیں مگر اب وہ دیکھ
 رہی تھی کہ مبینہ حسن کا کہیں دور تک نشان نہ تھا۔ ہڈیوں کا ڈھیر تھا جس پر سفید کھال
 منڈھی ہوئی تھی۔ وہ عالیہ سے اس قدر پیار سے پیش آ رہی تھی کہ اسے بار بار
 اپنی تہنیتہ آپا یاد آ رہی تھیں۔

ساجدہ آپا کے آنے پر نجمہ بھوپھی کو بھی ان سے ملنے کے لیے نیچے اترنا پڑا
 وہ ان سے گلے ملنے کے بجائے الگ ہی کھڑی رہیں۔ "تمہاری صحت بہت خراب
 ہو رہی ہے۔ ساجدہ، " نجمہ بھوپھی نے انہیں غور سے دیکھ کر کہا۔
 "بچوں نے تنگ کر رکھا ہے۔ نجمہ بھوپھی، اد پر سے گھر کے ڈھیروں کا م۔ وہ
 دو بھینسوں کی دیکھ بھال۔"

"رتو تمہارے میاں ہل چلا تے ہیں۔" نجمہ بھوپھی نے حقارت سے پوچھا
 "جی ہاں نجمہ بھوپھی۔"

کنا پڑھے ہیں۔ ۶۔

"دش درجہ نجمہ بھوپھی۔" ساجدہ آپا نے فخریہ جواب دیا۔

بس بھر ٹھیک ہی ہے، اتنا بڑھ کر اور کیا کر سکتا ہے۔ بے چارہ اور ساجدہ بھائی
 بچے سخت شرمی ہیں، انہیں خوب پڑھانا۔ کم از کم انگلش میں ایم اے ضرور کرانا۔
 "ضرور پڑھاؤں گی تجربہ بھوپھی" ساجدہ آپ کا منہ لٹک گیا۔ اور تجربہ بھوپھی آپ
 اپنے گوشہٴ عافیت میں چلی گئیں۔ عالیہ تخت پر مٹھی سارے مکان لے سن سن کر کڑھتی رہ گئی۔
 جب سے ساجدہ آپ کی تھیں کرکین بوا بہت جوش نظر آ رہی تھیں۔ بچوں
 نے سارے گھر میں تھلکہ مچا رکھا تھا۔ اور کرکین بوا انہماں ہو ہو کر ایک کے گندے ہاتھ
 دھلا میں تو دوسرے کا منہ اور تیسرے کو بہانے کے لیے روٹی کا ٹکڑا پکڑا دیتیں۔
 شام کو بڑے چچا گھر آئے تو اپنی مٹی کے پاس ٹک گئے۔ وہ بڑے چچا سے باہر
 کر رہے تھے کہ چھٹی کو ایک دم جوش آ گیا۔ ساری سبیدگی غرق ہو گئی اور وہ بچوں کو جمع
 کر کے نعرے لگانے لگی۔ "مسلم لیگ زندہ باد، بن کے رہے گا پاکستان، دھتیا راج
 نہیں ہوگا، چٹیا راج نہیں ہوگا"
 بچے چھٹی کے گرد جمع ہو کر ساتھ رہے تھے۔ بڑے چچا حیلے سے بیٹھاک میں
 سرک گئے۔

"اللہ کی مار ہے ان منحوس نعروں پر، ادھر آؤ تم سب، خبردار جو شور مچایا شادی
 کا گھر اور یہ نعرے؟" ساجدہ آپ نے اپنے بچوں کو کھینچ کھینچ کر بٹھانا شروع کر دیا۔
 "بھئی کس کی شادی ہو رہی ہے؟" چھٹی فالتحانہ نہیں منہں رہی تھی۔
 "تمھاری اور کس کی؟" اماں نے جل کر جواب دیا۔ اور سب نے گھبرا کر چھٹی کی طرف
 دیکھا۔ عالیہ کو اپنے روئے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ چھٹی نے سب کو
 حیران سی نظروں سے دیکھا اور سر جھٹکائے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بڑی چچی نے اطمینان
 کی لمبی سانس لی۔ چھٹی سے کیسی کیسی تو قنات دابتہ تھیں۔ مگر اس نے تو ہوں بھی

نہیں کی۔ سب کی توقعات کو ٹھکرا کر سر ہٹکا دیا۔

”لڑکی ذات کبھی ہی شرم پر کیوں نہ ہو مگر ہوتی اندھیاں کی گائے ہی۔ جدھر

چاہو ہنکا دو۔ ہوں نہیں کرتی۔ بڑی چچی آنسو پونچھنے لگیں۔

ذرا دیر بعد عالیہ چھٹی کے کمرے میں گئی تو وہ اپنے بستر پر جانے کن خیالوں میں گم تھی

”آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا بھیا؟“ چھٹی نے بھگی بھگی آنکھوں سے اس

کی طرف دیکھا۔ ”خیر کوئی بات نہیں۔ جب سے ساجدہ آپ آئی تھیں ان کے روپ

میں میں اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔

”ارے بابا میں نے تو صرف اس لیے نہیں بتایا کہ تم شرم مار کر کمرے میں چھپ ہوگی

مجھے ایسی شرم سے چڑھ رہی آج تمہاری مہندی لگے گی تم مائیوں بھائی جاؤ گی، بس

آج شرم شروع کر دو۔“

”اچھا!“ چھٹی اسے جھٹیوں کی طرح تک رہی تھی اس کے چہرے پر ذرا بھی

شرم نہ تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے کی دہلیز پر اکرٹوں بیٹھ گئی۔ اور عالیہ کو تہنیدہ آپا یاد

آگئیں ڈھیروں خدشات نے اسے جکڑ کر رکھ دیا۔ اری چھٹی تو بھی کہیں باؤنی نہ ہو

جانا۔ اس نے سوچا کہ ان دنوں وہ چھٹی کا سایہ بن جائے گی وہ چھٹی کو کچھ بھی نہ کرنے دیگی

عالیہ بھی چھٹی کے قریب تک گئی۔ شام دے قدموں چلی آ رہی تھی چھٹی ٹٹی پٹی

دیران بیٹھی تھی۔ سب مصروف تھے۔ بچے شور مچا رہے تھے کہ زمین بواؤز میرا باد کی مہندی

پس رہی تھیں مگر عالیہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ ہر طرف سناٹا مچا ہوا ہے۔ سہانے

بن باس میں شاید ایسی ہی شامیں گزاری ہوں گی۔ ہائے یہ مہندی کی سل سے ایک

چھوٹا سا گلابی ہاتھ کیوں ابھر رہا ہے۔ عالیہ نے گھبرا کر اپنا منہ چھپا لیا۔ اور پھر

چھٹی کو لپٹا کر اس طرح بیٹھ گئی جیسے وہ ہاتھ چھٹی کو کھینچنے لے جا رہا تھا۔

تھمتی برابر روئے جا رہی تھی۔

”تم نے مجھ سے کہا پھرتا تو منظور کے سلسلے میں بات کرتی۔ مگر اس نے بھی تو پیغام نہیں دیا۔ تھمتی، پھیردہ بے مروت تم کو چھوڑ کر جنگ پر چلا گیا۔ اب اُسے کیوں یاد کرتی ہو پھرتی۔“

تھمتی نے اُسے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ عالیہ پہچان نہ سکی ان نظروں کے سامنے اس کا علم اور سمجھ جواب دے گئی۔ ”کیا بات ہو تھمتی؟“ اُس نے کچھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں بچیا۔“ اُنہو پوچھ کر وہ ہنسنے لگی۔

”یہ گیس کا ہنڈا اندر لے جاؤ۔ کرہن بوا اور اگر سب نے چائے پی لی ہو تو۔“ بیٹھک سے اسرار میاں کی آواز آئی تو عالیہ کا جی دکھ گیا۔ آج تو کرہن بوا کا ہے کو چائے دینے لگیں۔

”کبھی تو چائے بھول کر بھی دے جایا کرو۔ اسرار میاں آج ایک گلاس پانی پی لو کرہن بوا جواب دیتے ہوئے ہنس رہی تھیں۔ اور میرا شنب ان کا ساتھ دے رہی تھیں۔ ارے اسرار میاں اتنے عالم آشکارا راز ہیں۔ عالیہ کا جی چاہا کر سب کے مُنہ زنج لے۔“

بڑی چچی ساجدہ آیا اور اماں مہندی کا تھال اور پیلا جوڑا لیے اندر آ گئیں تو تھمتی نے سر جھکا کر ڈوٹے میں مُنہ چھپا لیا۔ رسم کے مطابق یہ جوڑا اور مہندی سُسرال والوں کو لے کر آنا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا، کون آتا۔ اتنی دور سے۔

صدر دروازے پر بھکاری لڑکے کے گانے کی آواز آرہی تھی۔ چڑیوں نے باغ اجاڑا۔ ”بھاگ بھاگ جاںموس کہیں کا۔ بھاگ جا“ کرہن بوا دھاڑ رہی تھیں چادر کی آڑ میں چھپ کر تھمتی نے پیلا جوڑا پہن لیا۔ اور ساجدہ آپا نے اس کے

ہاتھوں میں ہندی لگا کر اپنے آنسو پونچھ لیے

ہاتھی جھولیں سردرد جو ا۔ میرا تنوں نے گانا شروع کر دیا۔ اور عالیہ کو خیال آیا کہ اس نے ساجدہ آپا سے چھٹی کی سسرال کے لیے تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔

ہندی لگا کر سب باہر چلے گئے چھٹی نے کھیر بھی نظر نہ اٹھائیں، "تمہیں کھبیا تمہارے جنیر کے لیے ایک بڑا خوبصورت جوڑا بنا گئے ہیں" عالیہ نے اطلاع دی۔

"اچھا، چھٹی نے بڑی اتنا ہی سے اس کی طرف دیکھا اور ہندی کر دینے لگی۔

اڑیا یہ جو رکھو جی دیا تو جلاؤ۔" میرا نہیں بہت ہوش سے گائے چلے جا رہی

تھیں۔ رسم سونی سونی دیکھ کر میرا نہیں مانجھے کے گیتوں کے بجائے گرامونوں ریکارڈوں کے چلنے ہوئے گانے گانے لگیں۔

چھٹی تم مجھے اپنی سسرال بلاؤ گی نا۔" عالیہ اسے بہلانے کے لیے برابر باتیں کیے

جا رہی تھی۔

دیکھئے کس حُسن سے پوشیدہ غم کا راز ہے

تیر میرے دل میں ہے پردے میں میرا انداز ہے

میرا نہیں اب تو آئی پر یاد بھار کھا بیٹھی تھیں۔

"مجھے کیا معلوم۔" چھٹی نے آہستہ سے جواب دیا۔

"اچھا تم مجھے نہیں بلاؤ گی۔ بس معلوم ہو گئی تمہاری محبت۔" عالیہ بن کر رد تھی

مگر چھٹی تو جیسے کچھ حُسن ہی نہ رہی تھی۔

"آنے والے جلد آؤ آخری آواز ہے" میرا نہیں گاتے گاتے چپ ہو گئیں۔ چھٹی

یوں ہی خیالی خالی نظروں سے کرے میں ادھر ادھر دیکھے جا رہی تھی۔ "آنے والے

جلد آؤ آخری آواز ہے۔" دیکھتے دیکھتے چھٹی کنگانے لگی۔

”تمہیں یہ قوالی اتنی پسند کیوں ہو تھی؟“ عالیہ نے جیسے بھپکر پوچھا۔

”واہ تو میں کسی کو بلا تھوڑی رہی ہوں۔“ تھپی نے بھی غصتے سے جواب دیا۔

عالیہ کا جی سچا ہا کہ تھپی کو پیٹ کر رکھ دے اور آنے والا نہ آئے تو انیون کھا لو گیلی، مر جاؤ اور اسے دنیا کے سینے پر در آنے کے لیے چھوڑ کر قبر میں جا رہو۔

بڑی دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے سے نہ بولیں اور جب میرا نہیں گا بجا کر چلی گئیں

تو تھپی اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ”آپ اوپر کمرے میں جا کر سو رہیں۔ خواہ مخواہ اتنی دیر سے بٹھی ہیں۔“ آنکھیں بند کئے تھپی نے اکھڑ پن سے کہا۔

”میں تو یہیں تمہارے پاس لیٹوں گی۔“ عالیہ نے اسے پیار سے لپٹا لیا۔ خواہ مخواہ

تھپی سے یوں بات کی، ویسے ہی بے چاری کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔

پرسوں برات آرہی تھی مگر تھپی کے آبا بھی تاک نہیں آئے تھے۔ ادھر بڑے چچا کو اپنے

کاموں سے فرصت نہ ملتی۔ کر تین ہوا سخت فکر مند ہو رہی تھیں۔ ”اب کیا اسرار میاں برات

کی آؤ بھگت کریں گے۔ اگر انھیں پتہ چل گیا کہ یہ کون ہے تو کیا کہیں گے دل میں۔ آخر تو

انھیں معلوم ہی ہو جائے گا۔“ وہ برابر بڑبڑا کے جا رہی تھیں۔ عالیہ ان کی باتیں سن

سنا کر جل رہی تھی۔ اور اگر انھیں نہ معلوم ہو تو تم بتا دینا کر تین ہوا۔ تم تو اسرار میاں

کا ڈنکا ہو۔

صبح سے بڑی گھاگھی تھی۔ شام کو چار بجے برات آرہی ہے۔ عالیہ نے کر تین ہوا کے

ساتھ مل کر بیٹھا کھانا کرا دی تھی۔ دو لٹا کو بھانے کے لیے تخت کی چاندنی اور گادو تیکے

غلاف بدل دیا گیا تھا۔ باہر اسرار میاں انتظام کرتے پھر رہے تھے۔ آکول کے میدان کو ایک

دن کے لیے مانگ لیا گیا تھا۔ شامیانے لگ چکے تھے اور پلاؤ زردے کی دگنیں کھڑکی ہی تھیں

دو بجے کے قریب عالیہ تھک کر اماں کے پاس تخت پر ٹک گئی۔ میرا نہیں بڑے

زور سے گارہی تھیں۔ آبیاری بہرہ والا بنا۔۔۔ اماں اور بڑی چچی مہمان عورتوں کو
پان تمباکو کھلا رہی تھیں۔ ساجدہ آپا اپنے بچوں کو نیے کپڑے پہنا رہی تھیں۔ اور
کہہ مین بوا آج روٹی ہانڈی کی فکر سے آزاد ہو کر ادھر ادھر جہکتی پھر رہی تھیں۔ ۱۱ مالک
کے زمانے میں تو دس دس دن تک گھر کے باہر مجرا ہوتا تھا۔ سب سے اچھی رنڈیاں آتی
تھیں۔ گھر میں مہینہ مہینہ پہلے میرا شنیں ڈنھول لے کر بیٹھ جاتی تھیں اور جب گھر سے جاتی
تو ان کی جھولیاں روپوں سے بھری ہوتیں، وہ کیا زمانے تھے۔“

اسی گہا گہی کے باوجود عالیہ کو لوہے کی کرسی بڑی تنہا اور اڈس لگ رہی تھی۔ وہ آج
بھی پہلے کی طرح صحن میں پڑی تھی۔ ساجدہ آپا کے بچوں نے ننگے پاؤں رکھ رکھ کر اے
مٹی سے لیس دیا تھا۔ عالیہ جب تھمتی کے پاس جانے لگی تو جانے کس جذبے کے تحت کرسی
کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ساری کے پلو سے اس کی مٹی پونجھی اور چلی گئی۔

”ابا نہیں آئے بجیا۔“ تھمتی نے اُسے دیکھتے ہی سوال کیا اور مہندی سے رچا ہوا
ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”نہیں آئے تھمتی، وہ تو بیمار ہیں۔ کھانے وغیرہ کے لیے دوسرے پلے اور کھجوا دیے
ہیں۔“ عالیہ جھوٹ بول رہی تھی۔

”شاید وہ بے چارے موت کی بیماری میں مبتلا ہوں گے۔“ تھمتی نے نفرت سے
بہ طرنت دیکھا اور سر تھکا لیا۔

عالیہ خانوش رہی بھلا وہ کہتی بھی کیا۔ جھوٹ کے پاؤں کب ہوتے ہیں۔ ظفر چچا اگر آہی
جانے تو کیا بگڑ جاتا۔ مگر وہ کیوں آتے، اُن کے آرام میں نسل پڑ جاتا وہ اپنی حیدر آباد کی
جنت سے کیوں نکلتے۔

! بات آنے میں اب تھوڑی دیر رہ گئی تھی۔ اس نے تھمتی کو غور سے دیکھا۔ وہ

شرامی ہوئی بیٹھی تھی۔ تھمتی کے چہرے سے اسے کسی قسم کا خطرہ نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ اگہ کٹری ہوئی کیڑکے اُسے بھی تیار ہونا تھا۔

”کریمین بوا ذرا میری بات سُن لو۔ کریمین بوا۔“ اسرار میاں کی آواز آئے جا رہی تھی۔ مگر کریمین بوا تو بہری ہو گئی تھیں۔ در نہ کیا آج کے مبارک دن بھی وہ اسرار میاں کے کام کرتیں۔ عالیہ نے ہمت کر کے اسرار میاں کو جواب دے ہی دیا۔

”یہ کپڑے تھمتی بیا کے لیے خریدے ہیں۔ انھیں میری طرف سے دے دینا اور کچھ نہ کر سکا اسرار میاں کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور بڑھا ہوا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ کریمین بوا کی سماعت فوراً تیز ہو گئی۔ ”یہ آپ کا کام نہیں عالیہ بیا۔“ انھوں نے عالیہ کے ہاتھ سے بندل لے لیا۔

اماں اور بڑی چچی کپڑے دیکھ رہی تھیں۔ ”واہ کتنے اچھے کپڑے ہیں یہ اسرار میاں نے تھمتی کو دیے ہیں۔“ عالیہ نے فخر یہ کہا۔

”اسرار میاں نے؟ واہ خوب رہی، پرانے مال پر یا حسین کے کریمین بوا جلیلا اٹھیں۔ زمانے زمانے کی بات ہو، اسرار میاں اس گھر کی بیٹیوں کو جوڑے دیں۔ مالکن کو خدا جنت نصیب کرے اسرار میاں کی ماں کو اپنے پرانے کپڑے دے دیا کرتی تھیں۔“

”چلو اب تو کپڑے آہی گئے۔ یہ جوڑا بڑے بھیا کی طرف سے ہو جائے گا۔ آخر تو انھیں کی دوکان سے پیسے کاٹ کاٹ کر بنایا ہو گا۔“ اماں نے فوراً فیصلہ کر دیا۔

”ٹھیک ہی چھوٹی دو لہن۔“ کریمین بوا نے اطمینان کی سانس لی۔

عالیہ نے کپڑوں کو اس طرح اٹھالیا جیسے وہ کوئی بڑی ممبرک چیز تھی رہی ہو۔

اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ زور زور سے چیخے۔ سب کو بتا دے کہ یہ کپڑے اسرار میاں نے بھجوائے ہیں یہ ان کی محبت اور شرافت کا تحفہ ہی۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اُس نے

دھیرے سے کپڑے پلنگ پر رکھ دیئے اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

نہجہ بیٹھو بھی اپنے کمرے میں بیٹھی میک آپ کر رہی تھیں۔ اس وقت زردوزی سے
 لسی ہوئی ساری پہنے تھیں۔ اور سخت بے زار نظر آ رہی تھیں۔ اب تک انہوں نے کسی کام میں
 حصہ نہ لیا تھا۔ مگر آج چھٹی کو خصلت کرنے جیسے مجبور ہو گئی ہوں۔

ساری بدل کر عالیہ پھر نیچے آگئی۔ دھوپ پہلی ٹر کر دیواروں پر چڑھ گئی تھی۔ سب برتا
 کے منتظر تھے۔ وہ چھٹی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

برات آنے کا شور مچا تو چھٹی کا رنگ فق پڑ گیا۔

”سجیا!،“ جیسے کسی چیز سے ڈر کر اس نے پکارا۔

”کیا ہو چھٹی!“ اس نے چھٹی کو لپٹا لیا۔

”کچھ بھی نہیں۔ آپ میرے پاس سے پیٹے گا نہیں۔ جی گھبراتا ہو!“

”میں کہیں نہیں جا رہی ہوں چھٹی۔“ وہ کاہنتی ہوئی چھٹی کو لپٹائے بیٹھی تھی۔ مگر اُسے

کیا ہو رہا تھا۔ وہ تو خود بھی کانپ رہی تھی۔

اماں، بڑی چچی، ساجدہ آپا اور کریمین بوا۔ سب کمرے میں آگئے۔ کریمین بوا کے

ہاتھوں میں کھان تھا جس میں سسرال سے آیا ہوا نکاح کا جوڑا، زبور اور سہرا

سجا ہوا تھا۔

سب لوگ پردہ کر لو۔ نکاح کے لیے آرہی ہیں۔“ اسرار میاں کی آواز آئی۔ تو

کریمین بوانے چادر تان کر پردہ کر دیا۔ اور سب اس کے پیچھے تھپ تھپ کر بیٹھ گئے۔ وہ آج

کے دن تو بڑے میاں گھر پر رہتے۔ اپنی بھینجی کا نکاح تو پڑھواتے۔ خدا کی قدرت ہزار

میاں نکاح پڑھوانے آئیں۔ اللہ نصیب! تھے زرا سے، کریمین بوا مارے دکھ کے دور ہی تھیں

چھٹی نے اتنی آسانی سے ہوں کر دی کہ عالیہ حیران رہ گئی اُسے تو ایسا محسوس ہو رہا

کہا۔ کہ تیار مت تاک براتی یوں ہی بزرگازے پر پڑے رہیں گے۔ ہوں سُننے والے گواہوں
 پر سے صدایاں گزر جائیں گی۔ اور چادر کے اس پردے کو آندھیاں بھی نہ ہٹا سکیں گی۔
 گواہ وہاں چلے گئے، میرا نہیں مبارک بادیاں گارہی تھیں۔

ہو مبارک تری سُسرال سے آیا سہرا
 اور عالیہ کو الیا محسوس ہو رہا تھا کہ گانے کی آوازیں کہیں کو سوں دُور سے
 آرہی ہیں۔

ساجدہ اپنے تھمتی کو سُرخ جوڑا پہنا کر ذرا سی دیر میں دُھن بنا دیا۔ عالیہ الگ
 بیٹھی رہی، جیسے وہ مفلوج ہو گئی ہو۔

جب سب لوگ کمرے سے چلے گئے تو عالیہ نے تھمتی کی گھونگھٹ الٹ دی۔ کیا سچ مچ
 وہ اتنی ہی خوبصورت تھی۔! شادی ہونی تھی سو ہو گئی۔ کھیل ختم، بیسہ مضم ۷ تھمتی نے
 آنکھیں کھول کر دھیرے سے کہا۔ عالیہ کچھ نہ بولی۔ یہ بھی کیسی کیفیت ہوتی، کہ بعض وقت
 کہنے سُننے کے لیے کچھ رہ ہی نہیں جاتا۔

عالیہ خاموشی سے باہر چلی گئی گیس کی دودھیا روشنی میں تھمتی کی سُسرال والیاں
 چاندنی پر بڑے ٹھٹے سے بیٹھی تھیں۔ پان پر پان کھائے جا رہے تھے۔ بار بار تمباکو کھانسی
 جا رہی تھی اور ان کے بیچ میں سنجہ بھو بھی اپنے وقت کی ہیروئن بنی بیٹھی تھیں۔ "کتنا پڑھا
 ہو ددھا۔"؟ انہوں نے پوچھا۔

اٹھ درجے، اسے پڑھنے کی کیا ضرورت، بنیں سلگے زمین ہو، دو بھینسیں ہیں
 انڈر کا دیا سب کچھ ہو۔" تھمتی کی سانس نے غرور سے بتایا۔

"ٹھیک ہو۔ تھمتی کے لیے اور کیا چاہیے؟" سنجہ بھو بھی ان رہنمائی جاہل عورتوں
 کو بڑی حقارت سے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

ایک میراثن چھمی کو گود میں اٹھا کر باہر لے آئی تو سسرال والیوں میں ہڑ بونگ
 مچ گئی۔ سب چھمی پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ باہر سے دو لہا اپنے شہ بالے کے ساتھ
 آگیا اُسے ہوئے سہرے سے اس کا ٹھیٹ دہیاتی بچے رنگ کا چہرہ صاف نظر آ رہا
 تھا۔ عالیہ کا جی چاہا کہ اپنا منہ چھپا لے۔ یہ چھمی کا دو لہا ہے۔ چھمی جو پہلے جمیل بھیا
 کو چاہتی تھی اور منظور کو پسند کر کے مارے فخر کے بھولے نہ سماتی تھی۔ بدلے میں اسے
 بس ہی کچھ ملا ہے۔

میراثنیں آرسی مصحف کی رسم ادا کرنے لگیں تو چھمی نے اس طرح دو لہا کو دیکھا
 کہ میراثنیں دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ گئیں۔

کھانے کے بعد چھمی کی رخصتی کا سامان شروع ہو گیا۔ گلی میں کھڑے ہوئے
 تانگوں پر جہیز کا سامان لاداجا رہا تھا اور میراثنیں بڑی رنت سے گار رہی تھیں۔ "بھائیوں
 دنیا محل دو محلے، ہم کو دیا پردیس سے۔ لکھیا بابل مورے۔" بڑی سچی اور کرکمن بوا
 رو رہی تھیں۔ اماں سر جھکائے جانے کیا سوچ رہی تھیں اور سنجہ پھوپھی بڑی
 میراثنی سے جاہلوں کی محفل کے خاتمے کا انتظار کر رہی تھیں۔

"ہائے بھیا۔ بڑے چچا کو اتنا اچھا دو لہا کہاں سے مل گیا؟" چھمی نے عالیہ کی گود
 میں سر رکھ کر دھیرے دھیرے کہتے ہوئے کہا۔ عالیہ نے اُسے لپٹا کر کچھ کہنا چاہا مگر اُسے
 مہلت نہ ملی اور وہ اتنا اچھا دو لہا میراثنوں کے قوتوں کے بیچ میں چھمی کو اٹھا کر پردہ لگے
 تانگے پر بٹھا آیا۔ عالیہ نے اپنی چنچ گلی میں گھونٹ لی۔ رادن سیتا کو لے گیا۔ جمیل بھیا
 کاشش تم ہی رام بن سکتے۔

(۳۵)

چھمی کے جانے کے بعد گھر بالکل دیرا نہ بن گیا تھا۔ مسلم لہیا اور کانگریس پارٹیاں

اس گھر سے رخصت ہو گئی تھیں۔ کوئی کسی کو نہ چھیڑتا۔ سب ٹھہرے ہوئے تالاب کی طرح پرسکون تھے۔ بڑے چچا مزے سے گھر میں آتے اور چلے جاتے۔ اب بیٹھاگ کے دروازے بند کرنے کی کوئی ضرورت نہ پڑتی۔ کم سخت کانرکانگولیسوں کے خلاف کوئی نعرہ نہ گونجتا۔ بڑی چچی اسر شام ہی برآمدے کے پردے گرا کر تخت پر بیٹھ رہتیں۔ مٹی کی کٹڈالی میں کونسلے دیکھتے رہتے اماں اور بڑی چچی ہاتھ سینک سینک کر جانے کیا سوچا کرتیں۔ کوئی چھتھی کی باتیں نہ کرتا۔ کسی کو اس کے خط کا انتظار نہ تھا۔ چھتھی جیسے کبھی اس گھر میں رہا ہی نہ تھی۔

آج کل گھر کی حالت اچھی ہو رہی تھی۔ جمیل بھیا کی تنخواہ نے چوٹھے میں ذرا سی جان ڈال دی تھی اور کریمین بوا مارے مصروفیت کے گزرے ہوئے وقت کو کم ہا یا یاد کرتیں انھیں تو اب یہ دکھ کھا رہا تھا کہ بڑے چچا اپنی ہانڈی الگ بچواتے تھے۔ انھوں نے بڑی صفائی سے انکار کر دیا تھا کہ وہ جمیل بھیا کی کمائی کا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر خرچ نہ ہونے دینگے۔ جمیل بھیا نے یہ ملازمت کر کے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ "مجھے پتہ نہیں تھا کہ یہ جمیل، میری اولاد، میری دشمن ہوگی۔" بڑے چچا نے کئی بار عالیہ سے کہا تھا اور وہ چچا کی بیقرار روی دیکھ دیکھ کر حیران رہ گئی وہ گھنٹوں سوچتی رہتی کہ انسان کے مقاصد میں اتنی دھار کہاں سے آجاتی ہے کہ سارے رشتے ناؤں کو کاٹ کر پھینک دیتی ہے۔ بڑے چچا نے کسی کے باپ میں، نہ چچا، نہ شوہر۔ اسی لیے چھتھی رادن کے ساتھ لٹکا چلی گئی۔ ساجدہ آپا اپنے خاندان کی ساری بڑائی اور ستاویں ابارت کو گور میں ملا کر اُپے تھاپ رہی تھیں۔ شکیل بھاگ گیا اور جمیل بھیا ماٹھا کی آگ بھڑکا کوننا شرم کی آگ بجھانے چلے گئے۔

سخت سردی ہو رہی تھی یہ عالیہ چھت پر دھوپ میں پڑی یا تو بڑے چچا کی

لابری سے نکلی ہوئی کتابوں سے جی بھلائی یا پھر آوارہ روح کی طرح بھٹکتی پھرتی۔ اماں اپنے آپ میں گمن رہتیں ماموں کے لیے چوڑے محبت میں ڈوبے ہوئے خط آتے رہتے وہ ان خطوں کو حتی الامکان نہ پڑھتی۔ اس نے اماں سے اگلے سال علی گڑھ جانے کی بات بھی نہ کی تھی پھر بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ غنم درجائے گی۔

کبھی کبھار آبا کا خط بھی آجاتا۔ جسے پڑھ کر وہ نئی زندگی محسوس کرتی اور بڑی بیقراری سے ان کی رہائی کے دن گننے لگتی۔

خانی دقت کیسے کٹے۔ وہ کس سے بولے کس سے بات کرے، عالیہ کبھی کبھی تو اتنی اکھن محسوس کرتی کہ رو پڑتی۔ کاش سنجہ بھوپھی ہی اسے بات کرنے کے لائق سمجھ لیں مگر اس نے تو بی اسے میں ہی اُردو ہی ملی تھی۔ اس لیے وہ بالکل جاہل تھی۔ ان کی نظر میں۔ رات بھر ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہی اور بادل اتنے زور سے گرجتے رہے کہ دل دہل کر رہ جاتا۔ تھوڑی دیر تک اولے پڑتے رہی اور جب کھڑکی کے بند ٹیوں سے آکر ٹکراتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی ڈھیلے مار رہا ہو۔ بارش ہلکی پڑنے پر وہ سو گئی مگر بڑی اچاٹ سی نیند اس نے جمیل بھیا کو خواب میں دیکھا وہ ادولوں سے سر بچاتے جلنے کہاں بھاگے جا رہے تھے۔ عالیہ نے اپنے انھیں زور زور سے آواز دی تو رک گئے۔ وہ میں تم سے نہیں بولتا عالیہ " اور پھر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ بادل بڑے زور سے گرج رہے تھے۔ خدا کرے وہ خیریت سے وہیں آئیں۔ بڑی عجیبی کی نامتنا ٹھنڈی رہی۔ " عالیہ نے بلک کر دعا کی گارہ یہ سوچنے سے کتر رہی تھی کہ جمیل بھیا اس کے خوابوں میں کہاں سے آدھلے۔

صبح بے خد سرد تھی۔ رات کی بارش سے چھت کی منڈ بڑی حد تک اب تک گیلا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کے پھرنے ہوئے پٹ کھول دیئے کہیں دور سے بیوں کی آواز آرہی تھی۔ کون پر گیا۔ وہ بشر سے اٹھ پڑی ان دونوں تو محلے کے کسی آدمی جنگ پر مارے

گئے تھے مگر یہاں اتنی دور رونے کی آوازیں نہ آئی تھیں۔ بس یوں ہی خبریں سن رہی تھیں
مگر ادھر کچھ دنوں سے تو سارا محلہ اس گھر سے کٹ گیا تھا۔ چھٹی جب محلے میں گھوم پھر
کر آتی تو ساری خبریں سنا دیا کرتی۔ محاذ پر کون ختم ہو گیا، کس کی بیٹی کی شادی ہو رہی
ہے۔ کس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا، کون اپنی پارٹی کے پیچھے جیل چلا گیا اور کون سا بوڑھا
مردوں کی بیماری جھیل کر ختم ہو گیا۔

وہ جلدی سے نیچے چلی گئی۔ صحن میں پڑی ہوئی لوہے کی کرسی رات کی بارش
سے دھل کر چمک رہی تھی اور کھاری کے پودے ادلوں کی چوٹ سے دب کر زمین پر
جھک گئے تھے۔

وہ چپ چاپ تخت پر جا بیٹھی جہاں اماں اور بڑی چچی رونے کی آوازیں یرکان
لگائے خانوشی سے بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ کریمین بوا پر اٹھے پکاتے ہوئے اپنے
گھر کی سلامتی کی دعائیں کر رہی تھیں۔

”کون مر گیا۔ بڑی چچی نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔

صدر دروازہ زور سے کھلا اور کمر پر جھوٹا رکھے کھنگن صحن میں آگئی۔ وہ

تھانہ دار کے ہاں بڑا دے منظور میاں جنگ پر مارے گئے۔ ہائے کیسے کڑیل جوان

تھے ماں اپنی جان پیٹے لیتی ہے۔ صحن میں کھڑے کھڑے ہنسنے اطلاع دی اور پھر کام

میں جوت گئی

”مجھے لینا، میں چلا“ بڑی چچی نے سینے پر ہاتھ رکھ لیے اور آگے کو تھیک

گئیں۔ ”میرا تھیل۔“

وہ ٹھیک ہوں گے بڑی چچی، وہ بالکل خیریت ہوں گے، وہ محاذ پر

نہیں جائیں گے ان کا دوسرا کام ہی ک عالیہ نے بڑی چچی کو تھام لیا۔ پراٹھا

تو سے پر حبل رہا تھا اور کر تین بوا بڑی چچی کو بانی پیا رہی تھیں۔
 "ذرا ہمت سے کام لیجئے بڑی بھابی، اللہ نے چاہا تو حبل خیریت سے ہوگا
 کلکتہ یہاں کے کون سا دور ہے اسرار کو بھیج کر خیریت معلوم کرالیں۔" اماں بھی سمجھا رہی
 تھیں مگر بڑی چچی کی بیقراری کم نہ ہو رہی تھی۔

"کیا منظور مر گیا۔" بڑے چچا نے پوچھا وہ آج دیر سے سو کر اٹھے تھے ان
 کا منہ سرخ ہو رہا تھا یہ انگریز بہادر اپنے مفاد کے خاطر ہمارے خون سے ہوا کی کھیل رہا
 اماں کی تیوریوں پر بن پڑ گئے تھے۔ مگر اس وقت وہ کچھ نہ بولیں۔ بڑی چچی اب اپنے
 آپ کو سنبھال کر بیٹھ گئی تھیں۔ رونے کی آوازیں مدھم پڑتے پڑتے کھول گئی تھیں۔
 "اور سنا ہے کہ زنیب بیگم کالرٹ کا جرموں کی قید میں ہے۔" بھنگن نے جاتے
 جاتے دوسری اطلاع دی۔

بڑے چچا چوکی پر بیٹھے ہاتھ منہ دھو رہے تھے۔ عالیہ نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ
 کانپ رہے ہیں وہ گھبرا گئی۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے بڑے چچا۔" اس
 نے قریب جا کر پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ کھیانی ہنسی ہنسنے لگے۔

"اتنے دن سے حبل کا خط بھی تو نہیں آیا۔" بڑی چچی کی آواز میں خدشات
 لہر رہی تھی۔

سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی دھوپ دیواروں سے اتر کر صحن میں پھیل رہی تھی
 تجربہ بھو بھی کالج جانے کے لیے نیچے اتریں تو کر تین بوا نے خبر سنائی۔ "تجربہ بھو بھائی
 کے صاحبزادے بھی جنگ پر مارے گئے۔ اللہ حبل میاں کو خیریت سے رکھے۔
 "اس گھر کی کسی بھینسی ہے کہ اتنی تعلیم بھی نہ حاصل کر سکے جو آرام سے روزی

کہا لیتے۔ "تجہ بھوٹھا کے چہرے سے فارغتا ہر ہو رہی تھی۔

"جی ہاں اور آپ تو اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بڑے معرکے سر کر رہی ہیں۔" جانے کیسے عالمیہ نے انگریزی میں بات کرنے کی جرات کی تھی۔

"افوہ! تم۔ سے کس نے کہا ہے کہ غلط سلط انگریزی بولا کرو۔ گھروں میں بیٹھے بیٹھے بی اے

کر لیا تو سمجھا کہ بس تاہں ہو گئے۔" تجہ بھوٹھا نے بری طرح ڈپٹا۔ ان کے لہجے میں اتنی ہتک تھی کہ عالمیہ کا جی چاہا یہیں زمین بند دفن ہو جائے۔

"تجہ بی، زیادہ باتیں نہ بناؤ، کس کی دولت سے قابل بنی ہو۔ میرا اور بڑی

بھابی کا گلا کاٹ کاٹ کر یہ صلہ دے رہی ہو، میں مجبور نہیں ہوں جو تمہاری بات سنوں گی۔ میرا شوہر زندہ رہے، تم حبیبوں کو تو۔" اماں کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

"اٹ، اٹ، اٹ! میں آپ لوگوں کے منہ نہیں لگنا چاہتی، وہ فار کا دالے بھدی صاحب

بھی کہہ گئے ہیں کہ جاہلوں سے اس طرح بھاگو جیسے تیر کمان سے۔" اور وہ ناشتہ چھوڑ کر کاج جانے کے لیے باہر نکل گئیں۔

"کریمین بوا بڑی بھابی سے کہو کہ پریشان نہ ہوں میں تمہیل کی خیریت معلوم کر آؤں گا۔

اگر سب لوگ ناشتہ کر چکے ہوں تو۔" بیٹھک سے اسرار میاں کی کمر درسی آواز آئی

"تم سب کو پریشان ہونے دو اسرار میاں، تم اپنا ناشتہ کر لو۔" کریمین بوا چائے

کی پیالی اور گھی پٹری روٹی لے کر اس طرح جھپٹیں جیسے اسرار میاں کے منہ پر سے ماریں گی

کہہ دو نا کہ خیریت معلوم کر آئے اور کیا کام ہے اس نکتے کو۔" اماں نے کریمین بوا سے

کہا۔ مگر وہ بڑی خاموشی سے جھوٹے برتن سمیٹتی رہیں۔

منظور کے گھر سے بین کی آوازیں پھر بلند ہونے لگیں تھیں۔ بڑی چچی گھٹی گھٹی سی

بیٹھی تھیں۔ گلی میں کوئی فقیر صدائے گانا گزرا تو انھوں نے پاندان کی کٹھیا سے ایک پیسہ نکال

کر کر مین بو کی طرف بڑھا دیا۔

دو پہر کو تمہیل بھیا کا خط اور منی آرڈر آ گیا۔ بڑی چچی خوشی سے کانپ رہی تھیں اور تھم تھم کر آنے والی بین کی آواز میں بھی اب اتنی درد بھری نہ معلوم ہو رہی تھیں سبھی چچی برابر تمہیل بھیا کی باتیں کیے جا رہی تھیں اور کر مین بو ا مزار پر چڑھانے کے لیے ملید بنا رہی تھیں۔ خدا نے ان کی منت پوری کی تھی۔ تمہیل بھیا کا خط آ گیا تھا۔

(۳۶)

فردری کے خوشگوار دن بہار دے رہے تھے مگر بڑے چچا کا چہرہ کیوں سیلا ہو رہا تھا ان کے ہاتھ پاؤں بھوکھتے جا رہے تھے اور پیٹ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ گاندھی جی نے جیل میں کیس دن کا برت رکھا تھا۔ آزادی کے لیے انھوں نے جان کی بازی لگا دی تھی اور ادھر بڑے چچا نے آرام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جانے کہاں مارے مارے پھرا کرتے یا پھر بیٹھیاک میں دوستوں کا ہجوم ہوتا۔ منت نئی آسک میں تیار ہوتی رہتیں۔ عالیہ بڑے چچا کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی۔ اللہ یہ بڑے چچا کس مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔ کبھی تمہیل بھیا کی خیریت نہیں پوچھی۔ شکیں مڑتا ہوا یا جیتا ہوا انھیں کوئی خبر نہیں۔ بڑی چچی غموں کی آگ میں سُلگ رہی ہیں مگر وہ پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ گاندھی کے مرجانے کا خون ستا رہا ہے عالیہ کوئی دن سے سوچ رہی تھی کہ بڑے چچا کو سمجھائے گی، انھیں ان کی صحت کی خرابی کی اطلاع دے گی۔

رات کو جب سب لوگ بیٹھاک کو خالی کر گئے تو ذرا بڑے چچا کے پاس جا بیٹھی وہ جیسے تھک کر لیٹے تھے لاشین کی پیلی پیلی روشنی میں ان کا چہرہ اور بھی کمزور لگتا ہوا تھا۔ تم کو پتہ ہے نا۔ گاندھی جی نے جیل میں برت رکھا ہوا ہے، مجھے معلوم ہے کہ وہ

کبھی نہیں مرے گی، مگر۔۔۔“

”ہاں بڑے چچا معلوم ہے، اخبار میں پڑھا تھا مگر۔۔۔“ وہ گھگھکیا گئی۔

”اگر خدا نخواستہ انھیں کچھ ہو گیا تو انگریز بہادر اپنی ساری مکاری بھول جائیں

گے، ایک اتنا بڑا طوفان آئے گا جو انگریز کو جنگ سے بھی زیادہ ہنسا پڑے گا۔“ بڑے

چچا مارے جوش کے بیٹھ گئے۔

”ٹھیک ہو بڑے چچا۔ اس نے کمزوری آواز میں کہا۔ اب وہ انھیں کیسے سمجھائے

ان سے کیا کہے، وہ ہولے ہولے ان کا سر سہلانے لگی۔ آپ اپنی صحت کی فکر نہیں

کرتے بڑے چچا ہم سب آپ ہی پر ہیں۔“

”وہ میں نے اسرار میاں سے کہہ دیا ہے کہ میرے لیے حکیم محمود صاحب سے کچھ معجونیں

بنوالائیں، بس دو دن میں طاقت آجائے گی۔ بڑے پائے کے حکیم ہیں اور ملک کی آزادی

حاصل کرنے کے لیے سب سے آگے رہتے ہیں مجھے بھی کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ ان دنوں کمزور

ہو رہا ہوں، ذرا لائین کی بتی ادبھی کر دو بس جیسے ہی آزادی ملی بجلی کا کنکشن بحال کرا لوں گا

یہ لائین کی روشنی رات کو پڑھنے نہیں دیتی۔“

عالیہ نے اٹھ کر لائین کی بتی ادبھی کر دی۔ کون جانے آزادی کے بعد کیا ہوگا۔ پھر

ملک کی خدمت شروع ہو جائے گی۔ بجلی کا کنکشن بحال کرانے کی کسے فرصت ہوگی۔ یہ گھر تو

اندھیرے ہی میں ڈوبا رہے گا۔ عالیہ نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر بڑے چچا کے سر ہانے

آ بیٹھی۔ اس وقت ان کے چہرے پر کتنی مسرت تھی۔ شاید آزادی کا تصور بچپن رہا تھا۔

پھر تو سب کچھ ہو جائے گا بڑے چچا۔ عالیہ نے جیسے ہار کر کہا۔

تم میری کتاب میں پڑھتی ہو ناہ؟“ انھوں نے پوچھا۔

”ہاں پڑھتی ہوں بڑے چچا۔“

ناخجہ کیسی ہے۔ بہت دنوں سے دیکھا نہیں ہے۔

وہ وہ جاہلوں میں نہیں سمجھتیں۔ اچھی ہیں۔

اما پڑھنے کے بعد بھی وہ لڑکی گنبد کی آواز ہے۔ انگریزوں کی تعلیم کا مقصد ہی یہی تھا!

بڑے، چچا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ عالیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بڑے چچا تو آنکھیں بند کر کے

شاید سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ ذرا ہی دیر میں وہ ستر اٹے لینے لگے تو عالیہ بے قدموں

کمرے سے چلی گئی۔

باہر ٹھنڈی ہوا سانس سانس کر رہی تھی اور بادلوں کے چند کڑے ادھر ادھر ڈرتے

پھر رہے تھے۔ آہاں اور بڑی چچی شاید اپنے کمروں میں سو رہی تھیں مگر کریمین بوا اب تک چولھے

کے پاس بیٹھی اپنی بوڑھی ہڈیاں سینک رہی تھیں۔ وہ چپ سیڑھیوں پر ہولی۔

خجہ بیو بھی اب تک پڑھ رہی تھیں۔ عالیہ نے ان کی طرف کھلنے والے دروازے بند

کر لیے اور اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ہامی اسکول کی طرف سے آئے کے بولنے کی آواز آرہی

تھی۔ مگھلی میں کچھ آوارہ کتے لڑ رہے تھے۔ اسے رات بڑی ڈراؤنی معلوم ہوئی اور کریمین بوا

کی بات یاد آگئی۔ جب کتے روتے ہیں تو کوئی آفت آتی ہے۔ اب اور کون سی آفت آئے

کو رہ گئی ہے؟ آجیل میں دن کس طرح گزارتے ہوں گے۔

رات جانے کس طرح گزری۔ گزری نہیں رات نے اسے گزار دیا۔ کیسی بے چینی

کیسی بے کلی۔ جاگتے جاگتے آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ اشد۔ اشد۔ وہ بار بار جیہے

کراہتی اور گھلی میں کتے روئے چلے جاتے تھے۔

رات کے پچھلے پہر جب بیوسپی کی روشنی بجھ گئی تو کمرے میں گھورا اندھیرا چھا گیا۔

مرغوں کی اذانوں کی آوازیں آنے لگیں تو وہ بڑے سکون سے سو گئی۔ صبح کے تقورنے

اس کے دماغ سے ساری بلاؤں کو مال دیا تھا۔

کسی نے زور سے زنجیر کھڑکائی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ سنجہ بوجھ کی لرزتی ہوئی آواز اس کے کانوں کو چھید گئی۔ "ہائے منظر بھیا جیل میں مر گئے" اماں کی جنھیں بلند ہو رہی تھیں۔ بڑی چچی اونچی آواز سے رو رہی تھیں اور کریمین بوا کے سینے پٹینے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ کھپر بھی وہ اپنے بستر پر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ وہ آنکھیں کھپاڑ کھپاڑ کر ہر طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ صبح صبح رات کیسے ہو گئی۔ سورج کدھر غائب ہو گیا کیا بیچ بیچ آبا مر گئے۔

وہ رونا چاہتی تھی۔ چیخنا چاہتی تھی۔ اسے اپنا دل ٹھنکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ اور کریمین بوا سینہ پٹیتی اس کے پاس آ گئیں اسے اپنی چھاتی سے لٹپٹائے لٹپٹائے نیچے لے گئیں۔ اور وہ ان کے ساتھ اس طرح چلتی رہی جیسے گھٹ رہی ہو۔ اس کے پیروں میں جان کہاں تھی۔

بڑے چچا صحن میں کھڑے تھے۔ کیا یہ بڑے چچا ہیں؟ کیا یہ زندہ ہیں؟ انھیں کیا ہو گیا ہے؟ بڑے چچا نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں وہ ان کے برابر کھڑی رہی۔ اماں بے توجہ رو رو کر ٹرپ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں کیسی بے بسی تھی۔ کتنی حسرت تھی ان کے چہرے پر بے چارگی کی دُھول اُڑ رہی تھی۔

عالمیہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اماں کی طرف بڑھی اور لیٹ گئی اور پھر اُسے محسوس ہوا کہ وہ بھی رو سکتی ہے۔

"اُسے انگریزوں نے مار دیا ہوگا! وہ خود نہیں مرا، وہ مر ہی نہیں سکتا۔ وہ میرا بھائی بڑے چچا لو ہے کی کرسی کو تھام کر بیٹھ گئے۔ میں اسے لینے جا رہا ہوں۔" بڑے چچا اپنے گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر جیسے بڑی شکل سے کھڑے ہو گئے۔

"جلدی سے چلیے بڑے بھیا" بیٹھک سے اسرار میاں کی آنسوؤں سے بھیگی

ہوئی آواز آئی۔ لیکن اس وقت تو کریمین بوا ان کی آواز سن ہی نہ رہی تھیں۔
 سب روتے روتے تنک گئے۔ برآمدے میں کھپی ہوئی درمی پر اب سوگوار
 بیٹھے تھے دُھوپ صحن سے سرک کر دیواروں پر چڑھ گئی تھی اور کونے ایک ساں
 کائیں کائیں کیے جا رہے تھے۔ بھلا اب یہ کس کی آمد کی اطلاع دے رہی ہیں۔ کہا تو
 میں کوئی جان نہیں ہوتی، عالیہ کا جی جاہ رہا تھا کہ دیوار پر بیٹھے ہوئے کودوں کو مار مار
 کراڑا دے۔

سب کی نظریں صدر دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ مغرب کا وقت ہو رہا تھا اور
 بڑے چچا آبا کو لے کر اب تک نہیں آئے تھے۔ گلی میں کسی کے بھی قدموں کی چاپ ہوتی
 تو سب چونک پڑتے۔ کوئی فقیر صدا لگتا مگر رتا تو ایسا جان پڑتا کہ میں کر رہا ہوں۔
 کریمین بوائے صحن میں چوٹھا بنا کر بڑے پیلے میں پانی چڑھا دیا تھا اور سہلی ہوئی
 لکڑیوں کو بھونک بھونک کر گود میں رکھے ہوئے قرآن شریف پڑھتی جا رہی تھیں۔
 صحن میں ہوا کتنی سرد ہو رہی تھی۔

گلی میں بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر سزار میاں کی آواز
 آئی۔ ”سب پردہ کر لیں۔ منظر بقیہ آگئے“

کھمے ہوئے طوفان نے پھر سے زور پکڑ لیا برآمدے میں کچھ ہوئے پلنگ
 پر آبا کی لاش رکھ کر جب سب لوگ بیٹھک میں چلے گئے تو عالیہ دوڑ کر پلنگ
 کے پاس آگئی اماں پلنگ کی پٹی سے سر کھپوڑ کھپوڑ کر رو رہی تھیں۔ سنجہ کھپو کھپو
 اپنے تھیا راجہ کو پکار رہی تھیں۔ بڑی حچی اماں کو لپٹائے بیٹھی تھیں اور
 کریمین بوا سر جھکائے قرآن شریف پڑھ رہے جا رہے تھیں۔

عالیہ نے آبا کے منہ پر سے چادر سرکا دی۔ کیا سچ مچ یہ آبا ہیں۔ اس نے پہچان

چاہا۔ جیل نے کچھ بھی تو نہ چھوڑا تھا۔ بڑے چچا "عالیہ نے بڑے چچا کا ہاتھ تھام لیا تھا وہ اپنے
 کھائی کے سرانے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ "میرے کھائی کو انہوں نے مار ڈالا
 اس نے تو انگریز حکمران کو مار کر ڈرا اب بھی نہیں کمایا تھا اور انہوں نے اتنی بڑی سزا دے دی
 میں سب کو بناؤں گا۔ میں اس سزا کے کو جلاوس کی صورت میں لے جاؤں گا۔ بڑے چچا جوش
 کے مارے پتخ رہتے۔

"کون نکالے گا جلاوس؟" اماں تن کر کھڑی ہو گئیں۔ "جب یہ زندہ تھے تو آپ کے
 تھے، آپ کا سا یہ تھے اب یہ میرے ہیں ان کی لاش کی کوئی بے حرمتی نہیں کر سکتا۔"
 بڑے چچا کا سراپا دم ٹھک گیا۔

پھر آبا چلے گئے۔ ایک ہنگامہ ہوا اور ٹھہر گیا۔ آخری دیدار میں کتنی ہوس ہوتی ہے۔
 وہ حیران تھی کہ آبا کی تصویر اس کی تیلیوں میں کیوں نہیں کھینچ گئی۔

رات گیارہ بجے کے قریب ہسپتال اور بڑے چچا قبرستان سے واپس آ گئے اس
 وقت آنسو کھم چکے تھے۔ اور صبر کی سل سینوں پر سرک آئی تھی۔

"کریم بوا، چھوٹی دُھن سے کہو اگر ان کے بدلے میں مجھے موت آجاتی تو میں ضرور
 مرجاتا، پر بندہ بڑا بے بس ہے۔" اسرار میاں کی آواز سناتے کو چیر گئی۔

"تم نہیں مر سکتے اسرار میاں، تم زندہ رہو گے، تم نہیں مر سکتے۔" کریم بوائے
 قرآن شریف پڑھتے پڑھتے اسرار میاں کی زندگی پر لعنت بھیج دی۔

تیسرے دن شام کو حیدر آباد دکن سے ظفر چچا اور ماموں دونوں ہی آ گئے آبا اپنے
 کھائی سے مل کر بہت بیقرار ہو رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی بھیک اور انجانھی
 مگرموں نظریں چرا رہے تھے، وہ کچھ نہیں دیکھنا چاہتے تھے کیا ان کی انگریز بیوی بناندانی
 زندگی کا پھندا گلے میں ڈال کر خود کشی کر لیتی ہے؟

ظفر چچا صدمے سے نڈھال تھے اور بار بار کہہ رہے تھے کہ اگر میرا بھائی حیدر آباد
میں رہتا تو آج یہ حشر نہ ہوتا۔ پھر شام کو وہ اپنی محفوظ حکومت کی سر زمین کی طرف روانہ
ہو گئے۔ انھوں نے اہل کی ہر طرح مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

کئی دن بعد چھٹی کا خط آیا تھا شاید اس نے رو رو کر لکھا تھا آنسوؤں نے ریشنائی
پھیلا دی تھی۔ آخر میں اس نے لکھا تھا کہ اب وہ اس گھر میں نہیں آنا چاہتی۔ چھوٹے گاؤں
سے کیا ناتہ۔ اس نے اپنے متعلق اب بھی کچھ نہ لکھا تھا جمیل بھیا کا بھی خط آیا تھا۔ انھوں
نے لکھا تھا کہ منظر چچا کبھی نہیں مر سکتے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انھوں نے دو دن کی
چھٹی پر آنے کو لکھا تھا۔

(۳۷)

اس دفعہ بہار کتنی جلدی گزر گئی۔ کیا رمی میں ڈھیروں گل عباس اور سورج مکھی
کے پھول کھلے مگر ان میں کوئی دلکشی نظر نہ آئی آم۔ کہ درختوں میں بور آتے ہی کوئل نے چنچیا شروع
کر دیا تھا۔ مگر کسی نامعلوم سی ٹرپ نے عالیہ کے پیچے کو نہ مسلا۔ آبا کی موت کے بعد وہ
کتنی دل شکستہ ہو گئی تھی۔

اماں اب ہر وقت سر نوڑھائے جانے کیا سوچا کرتی اور بڑی چچی ادھر ادھر کی باتیں
کر کے انہیں بہلانے کی کوشش کرتی رہتی، پھر بھی اماں کی فکر دوسری نہ ہوتی۔ جانے
وہ کیا سوچتی۔ ہتی تھیں۔ عالیہ ان کے پاس بہروں بیٹھی رہتی مگر وہ دل کی بات نہ کہتی۔
بڑے زور کی گرمی پڑنے لگی تھی۔ سر شام آسمان پیلا ہونے لگتا تو محلے کے بچے
شور مچاتے۔ پیلی آندھی آئی۔ شاید یہی کوئی دن گزرتا جو آندھی نہ آتی ہو۔ سارا
دن کو جلتی رہتی۔ گلی میں ببولے لوٹتے پھرتے اور عالیہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں پڑے

پڑے اپنے مستقبل کے لیے سوچتی رہتی۔ یہ دن تو کاٹے نہ کٹ رہے تھے۔ وہ اب یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی اس گھر کی ایک ایک چیز اسے کاٹنے کو دوڑتی۔ دادی کے کمرے میں جاتی تو ان کی تیز تیز سانسیں سنائی دینے لگتیں، صحن میں بچھے ہوئے ہر پانگ پر ابا کی لاش پڑی نظر آتی اور جب لوہے کی کرسی دکھتی تو جانے کیوں وحشت ہونے لگتی اور پھر بھاگ جانے کی خواہش اور بھی جڑیں پکڑنے لگتی۔ جسم بھیا اُسے تسلی دینے بھی نہ آسکے۔ اس کے باپ کی موت کتنی معمولی بات تھی اور دھرتی اُسے جسم بھیا سے نفرت ہو کر رہ گئی تھی۔

دھوپ حدت کی منڈیروں پر چڑھتے چڑھتے غائب ہو گئی تھی تو عالیہ اپنے کمرے سے نکل کر کھیت پر آگئی۔ نجمہ بھوپھی اب تک اپنے کمرے میں پڑی اذگھ رہی تھیں اور کچھ دنوں سے وہ بھی بدلی بدلی نظر آتیں۔ کتاب ان کے سینے پر کھلی پڑی رہتی اور جانے کیا سوچتی رہتی۔ عالیہ کو کئی بار خیال آیا کہ اس طرح نجمہ بھوپھی کی انگریزی کمزور ہو جائے گی۔

قریب تریب کی چھتوں سے لڑکے الیل پیلینگیں اڑا رہے تھے۔ "وہ کاٹا کی آوازیں آرہی تھیں اور گلی میں گلاب کی گندیریاں بیچے دالا تو جیسے اسی گلی کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے دل چسپی سے پینگوں کو دیکھنا اور گنا چاہا مگر ذرا ہی دیر میں جی اچاٹ ہو گیا۔ آج وہ بے حد افس اور پریشان تھی۔ سارے دن کا دھوپ میں تپے ہوئے پانگ پر ٹھنڈ لپیٹ کر پڑ رہی۔

۔ عالیہ"

"اماں" عالیہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اماں کے آنے پر اُسے حیرت ہو رہی تھی۔ مدتیں گزر گئیں انھوں نے زینے پر قدم بھی نہ رکھا تھا۔ کبھی تنہائی میں بیٹھ کر اس سے بات بھی نہ کی تھی۔ پھر ادھر ابا کے مرنے کے بعد تو وہ جیسے سدھ بدھ کھو چکی تھیں۔

"علا گڑھ جاؤ گی بیٹی کرنے؟" انھوں نے عالیہ کے پاس بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”منزور جاؤں گی، آپ ماموں کو لکھ دیجئے کہ وہ زیادہ روپیہ بھیجے لگیں۔“
 اماں نے اُسے غور سے دیکھا۔ اور کھیر کسی خیال میں گم ہو گئیں۔ بسیرا لینے والے پرند
 نظار سے اُڑے جا رہے تھے۔ عالیہ نے انہیں بے دلی سے دیکھا اور کھیر اماں کا منہ کھلنے لگی
 اگر تمھاری جگہ کوئی لڑکا ہوتا تو مجھے اتنی باپوسا نہ ہوتی۔ خیر اب تو تم ہی سب کچھ ہو۔ تمہی کو سب کچھ
 کرنا ہے۔ اماں کی آنکھوں میں چمک تھی۔

بس ایک سال کی دیر ہی اماں، پھر میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤں گی۔“
 ”میں کہتی ہوں کہ اب تم علی گڑھ جاؤ۔ خیال تھوڑا ہی دو۔ خدا جمیل کو خیریت سے
 واپس لے آئے، میں تمھارے ماموں سے سب روپے لے کر اُسے دے دوں گی تمھارے چچا کی
 یہی دوکانیں کچھ دن بعد تپ نکلیں گی۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اس نے میرا ہمیشہ ادب کیا ہے۔
 خدا اسے خوش رکھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں نے کہا تو جنگ سے آنے کے بعد تمھارے ماموں
 اُسے ضرور کوئی بڑا عہدہ بھی ضرور دلا دیں گے۔ رہو تمھارے بڑے چچا اور آسرا۔ تو میں نہیں
 جلد ہی اس گھر سے چلتا کر دوں گی۔ بنا بنایا گھر ہے، سوینی سے کچھ کم تو نہیں۔ سب تمھارے
 نام لکھوا لوں گی، شکستیل تو سمجھو مر ہی گیا ورنہ کوئی خط و ط لکھتا ماں کو؛ سب کہہ چکنے کے بعد اہا
 اس کا منہ دیکھ رہی تھیں۔

عالیہ سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ اس نے آنکھیں بھاڑ کر اماں کو دیکھا۔ بچپن میں سنی ہوئی
 کہانیوں کی چڑیاں اماں کا منہ چھپا کر اس کے سامنے تھرتی معلوم ہو رہی تھی۔ میں علی گڑھ جاؤں
 گی یہ گھر بڑے چچا کو مبارک۔ ہی آپ اس قسم کی باتیں نہ سوچیں تو بہتر تھا۔ عالیہ نے سختی سے
 کہا اور اس طرح منہ پھیر لیا۔ جیسے اب کچھ نہ سنا چاہتی ہو۔

”وہی باپ والی نظرت ہی مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے خوش نہیں دیکھ سکتیں۔ تم چاہتی ہو
 کہ میں ہمیشہ بے گھر رہوں۔ میرا کھوایا ہوا راج پاٹ اب کبھی نہ ملے گا۔ اماں نے منہ پڑھنے کا

تو رکھ لیا اور سبکدوشی کرنے لگیں۔

عالیہ اجنبیوں کی طرح خاموش بیٹھی انہیں روتے دیکھتی رہی۔ اُسے اپنی ماں کی تباہ زندگی سے ہمدردی ہے۔ وہ انہیں سکھ دینا چاہتی ہے۔ مگر وہ کچھ نہیں جانتیں اور کتنی خطرناک اسکیم لے کر اس کے تباہ ہونے کا سامان کر رہی ہیں۔ وہ ماں ہو کر اسے دھوکا دے رہی ہیں۔ جنہیں نے کبھی ایک لمحے کو بھی زندگی کی خوشیاں سمیٹنے کی کوشش نہیں کی اور اب پیسہ کمانے بھی گئے ہیں تو مقصد فاش نرم کو ختم کرنا ہے وہ کبھی چچی کی طرح سب ترناک زندگی نہیں گزارے گی۔ اور ماں نے خود کسی زندگی گزار رہی ہے۔ اب ایک منٹ کو بھی گھر کے نہ چھوڑ کر کیا اماں یہ سب کچھ نہیں سوچ سکتیں۔ کیا یہ سچ سچ اس کی ماں ہیں۔ اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اماں کو دیکھا جو اب آنسو پونچھ کر اس سے منہ موڑے اٹھ رہی تھیں۔

تم علی گڑھ جاؤ میں اپنے بھائی کو لکھ دوں گی۔ میں تمہارے کسی قسم کی قوت نہیں رکھتی۔ جو جی چاہے کرو۔“

عالیہ اماں کو جاتا ہوا دیکھتی رہی اپنے بھائی پر کتنا غرور تھا ان کو؟ عالیہ کا جی چاہا کہ خوب زور سے ہنسنے لگے مگر وہ اماں کے جاتے ہی بھوٹ بھوٹ کر رونے لگی اس وقت اپنی بے بسی میں وہ خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی۔

رُو سچکنے کے بعد وہ جیسے ہلکی پھلکی ہو کر کھڑے۔ پٹنگ پر لیٹ گئی۔ سیرا اپنے والے پر نہ کیسی نظار سے اڑے جا رہے تھے

”کریم بوا کیا سب لوگ چائے پی چکے؟“ اسرار میاں کی کمزور سی آواز اس کے دیکھے ہوئے دل کو اور بھی دکھائی گئی۔ اسرار میاں تم اب تک چائے کے انتظار میں بیٹھے ہو۔ آج کریم بوا لے کوئی جواب نہیں دیا۔ آج تم کو قیامت تک چائے نہیں ملے گی۔ عالیہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ کالج کھلنے میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں ہو وہ دل ہی دل میں حساب لگانے لگی۔

(۳۸)

وہ پورے دنش بیٹے بعد علی گڑھ سے لوٹی تھی۔ بڑے دن کی چھٹیاں گزارنے بھی گھرنہ آئی تھی۔ اماں نے بھی اُسے نہ بنایا تھا۔ بڑی چچی کے کئی خط آئے تھے کہ وہ دسرور آئے اور کبھی سب حال احوال لکھنے والی دی تھیں اماں تو اتنے دنوں سے ناراض تھیں۔ اتنی مدت میں اماں نے ایک بھی خط نہ لکھا تھا۔ انہیں خبر بھی نہ تھی کہ وہ جس سے ناراض ہیں وہ راتوں کو تنہائیوں میں ان کے دکھوں کو یاد کر کے ٹرتی رہی۔ وہ اماں کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ذہن سے اتار نہ سکی تھی۔ بس کے بعد اگر کوئی شدت سے یاد آتا تو وہ بڑے چچا تھے گر مگر خبریں اور غیر معمولی حالات ان کی یاد میں اضافہ کرتے رہتے۔ اس نے بڑے چچا کو کئی خط لکھے مگر جواب کا انتظار ہی رہا۔

مانگے سے اتر کر وہ سب سے پہلے بڑی چچی سے ملنی اور اسے بے پناہ مسرت کو اپنے سینے پر سموئے اماں کے لیٹ گئی اور رورہ کر اماں کا سینہ تر کر دیا۔

گھر کا نقشہ کیا بگڑا بگڑا لگا رہا تھا۔ آندھیوں اور بارشوں نے دیوار کا رنگ چاٹ لیا تھا۔ کمروں کی سفیدی پھلی اور مرنی معلوم ہو رہی تھی نالان کے پردے کئی جاگ سے پھٹ کر ٹٹک گئے تھے۔ کریمین بوانہی کی یادوں کے بوجھ سے مگر جھکا کر چلنے لگی تھیں اور اماں کی پیشانی کے سامنے بہت سے سفید بال جھانکنے لگے تھے۔ بڑی چچی تو جیہا جگتا تعزیر تھیں اور صحن میں پڑی ہوئی لوہے کی کرسی کے پاؤں میں زنگ لگ چکا تھا۔

رہتی کے لڑکی ہوئی ہی، ساجدہ کا خط آیا تھا بڑی چچی نے اطلاع دی۔

اورہ! پیاری تھمتی اماں بھی بن گئی وہ خوشی سے اٹھل پڑھی۔ یہ اس کی سچی کا کرتہ ٹوپی لے کر کون جانے والا ہے، اب تو اس گھر میں ساری رسمیں مچکی ہیں وہ رنجی ہو گئی

شکیل کی کوئی خبر ملی۔ بڑی چچی، "عالیہ نے پوچھا۔
 "تمہارے جمیل بھیا نے لکھا تھا کہ وہ بڑے مزے میں ہے، ڈھیروں کھاتا ہے
 اور اڑاتا ہے کسی کو یاد نہیں کرتا، اس کے لیے سب مر گئے ہیں، تمہارے جمیل بھیا
 بمبئی گئے تھے نا۔" شکیل کے نام پر بڑی چچی کی کچھ ایسی حالت ہو گئی جیسے چلچلاتی دھوپ
 میں ننگے پاؤں چل رہی ہوں۔ "دیکھو جس نے پیہرا کیا اسی کو بھول گیا۔ اکیلے عیش کرتا ہے
 انہوں نے لمبی آنکھیں کھینچی

۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا جب سارے چھوٹے صبح اٹھ کر اپنے بڑوں کو سلام کرتے تھے۔ جو
 کچھ تھا سب ماں باپ کے ہاتھ میں تھا۔ کریم بوا بڑ بڑا میں۔
 ہے۔ بڑی چچی کتنی معصوم ہیں۔ عالیہ سوچ رہی تھی۔ بھلا جمیل بھیا بمبئی میں کیوں
 تلاش کرتے پھر رہے۔ پتہ نہیں شکیل کہاں ہوگا پھر بھی شکر ہے کہ جمیل بھیا اپنی ماں کا
 دل رکھ رہے ہیں۔ ہائے کس پھر کا بنا تھا شکیل۔

اد پر کے کرے کی کھڑکی کھلی اور تہہ بھوپہ پیا کا۔ سر بھٹا سکا۔ کیسی ڈھل گئی تھیں تہہ بھوپہ
 بھی۔ اس کا جی چاہا کہ انہیں بھی سلام کرے مگر انہوں نے لفٹ ہی نہ دی۔ اس کی طرف
 دیکھا بھی نہیں۔ تہہ بھوپہ کو سلام کرنے کے لیے اب اگر نیری میں ایما۔ کے کرنا ہو گا۔
 کریم بوا نے بڑے چاؤ۔ سے اس کے لیے چائے تیار کیا تھی۔ اتنی مدت بعد ان کے
 ہاتھ کے سوکھے پر اٹھے کھانے میں بڑا فرا آ رہا تھا

۔ بڑے سچا کہاں، میں؟ " چائے پینے کے بعد اس نے پوچھا۔

"دہی کہیں آزادی کا جھنڈا گاڑ رہے ہوں گے۔" اماں نے تیوروں پر بل ڈال
 کر کہا اور بڑی چچی گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

"کہیں باہر تو نہیں گئے ہیں؟" اس نے پھر پوچھا۔ وہ ان سے ملنے کے لیے سخت بیابان تھی

”نہیں عالیہ، یہیں ہیں“ بڑی چچی نے جواب دیا
 ”بس اب تم جلدی سے ملازمت کی درخواستیں دینے لگو، میں بھرپائی ان
 مصیبتوں سے، اس جڑے گھر میں جانے کس طرح دن گزارے ہیں۔ کبھی سیٹ گھر
 کھانا نہ ملا۔ اماں نے بڑی بے باکی سے کہا۔ اس وقت وہ بڑی مغرور نظر آرہی تھیں
 ”ارے چھوٹی دلہن۔ میں نے تو اپنی جان سے زیادہ تمہارا خیال کیا ہے، اور
 بڑی چچی سے کچھ کہتے نہ بن پڑ رہی تھی۔“

بس جناب آپ کے خیال کا شکریہ، آپ لوگ میری جان بخش دیں اور جان
 نہ جائیں مجھے پتہ تھا کہ ایک دن یہی سنا ہوگا۔“

”اماں!“ عالیہ نے حیران ہو کر اماں کو پکارا اور بڑی چچی کی طرف دیکھ کر چھبکا لیا
 ابھی تو امتحان کا نتیجہ بھی نہیں نکلا، کیا یہی سب کچھ سننے کے لیے اس نے اپنے پیروں پر کھڑا
 ہونا چاہا تھا، اس کا جی چاہا کہ اپنے نیل ہونے کی دعائیں مانگنے لگے۔

بڑی چچی مُنہ پھیر کر ڈوٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ ”اتنی مارتہ
 بدعالیہ آئی ہے۔ اس سے باتیں کرو دھن۔“ وہ جیسے رنگیتی ہوئی اٹھیں۔ ”صبح سے
 سارا کام پڑا ہوا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں کیا۔“

خدا جب دینے پر آمنا ہو تو اتنا بڑا کلیجہ دے دیتا ہے۔ وہ چپ چاپ بڑی چچی کو جاتا
 دیکھتی رہی۔

”عالیہ بیٹا خدا آپ کو پاس کر دے، آپ کے دن پھیرے، پرانا زمانہ یاد کرتی پو
 تو کاجبہ مُنہ کو آتا ہے۔ کرکین بوا اپنی کہے جا رہی تھیں۔ اُکھوں نے شاید اماں کی باتیں سنیں
 نہیں تھیں۔ نل کی موٹی دھار کچے فرش پر تڑتڑ گرے جا رہی تھی اور کپڑی میں پانی
 ریٹک رہا تھا۔ بہار کے کھلے ہوئے سُرخ، پیلے اور اودے پھول اب مرجھا چکے تھے

ہائے اب مجھے کتنا سکون ملا ہے۔ اب ہمارے دن پلٹ جا میں گے۔ اماں بڑے
ذوق و شوق سے عالیہ کو رکھے جا رہی تھیں۔

کیا آج اس کمرے میں بڑی چچی زندگی بھر کا کام نمٹالیں گی۔ عالیہ کا وہ بیان بڑی
چچی میں لگا ہوا تھا۔ وہ اماں کی کوئی بات دہسن رہی تھی۔

بڑے چچا آگے۔ اماں نے ناگواری سے دوسری طرف مٹنہ پھیر لیا۔ اور عالیہ ان کی
اس حرکت کو نظر انداز کر کے ان کی طرف لپکی۔ "بہت دن بعد دیکھا ہے آپ کو بڑے چچا
وہ ان کے لپٹ گئی۔"

"استان کیسا رہا؟" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

"بہت اچھا رہا۔ کامیابی کی پوری امید ہے۔"

"پھر اب تم ان بے کار دنوں میں خوب بڑھو، وہ میری لائبریری کی چابی اپنے
پاس رکھ لو۔" وہ اپنی شیردانی کی جیب ٹٹولنے لگے۔ "ابھی گاندھی جی کی سوانح حیات
منگائی ہے۔ ضرور پڑھو۔"

"اب آپ اسے بھی تباہ کر دیجئے بڑے بھیا۔ مجھے یوہ کر کے آپ کو صبر نہیں آیا۔
میرے پاس کچھ بھی نہ رہنے دیجئے۔" اماں آج سب سے مقابلہ کرنے پر تل گئی تھیں۔
ان کی حالت تو کچھ ایسی ہو رہی تھی۔ جیسے کینے کے ہاتھ پیہ آ گیا ہو۔

وہ۔ وہ، میں نے کہا، جمیل کی اماں کہاں ہیں؟ دو آدمیوں کا کھانا پیئے گا۔
نورما انتظام کر ادینا بڑے چچا بوکھلا کر بیٹھک میں چلے گئے۔

"ضرور پڑھیں گی بڑے چچا، ہائے کتنی اچھی کتاب ہوگی۔" عالیہ نے اماں
کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا اور نعل کے تعلقے قدم اٹھاتی اور جانے والے زینوں پر ہونی۔
"کریمین بوا، عالیہ بیبا کو دعا کہو اور کہو کہ اللہ انہیں کامیاب کر دے۔"

بڑے بھیاکتے تھے کہ پرچے بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ " اسرار میاں کی آواز گھر میں داخل ہوئی تو کرہن بوا کا چٹا بڑے زور سے کھڑکا۔ " اسرار میاں کبھی تو تم چپ بھی رہا کرو۔ کوئی بھی مبارک موقع ہو تو ضرور داخل دو گے۔ "

عالمیہ ایک لمحے کو جیسے زینوں پر جم کر رہ گئی اور پھر تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کرہن بوا، پیٹ کی ایسی مار پڑی کہ اب تم ذائقہ دار چیزوں کا مزہ تاک بھول گئیں اور تمہیں صرف اپنے بڑے سرکار مرحوم کی حرام کاری کے اس پھل کی کڑواہٹ یاد رہ گئی۔ بھکاری زندگی کی ناکامی اور غلامی دشمن بن کر اسرار میاں کے پیچھے پڑ گئی، یہی۔ اللہ یہ اسرار میاں کے حصے کی موت کس کتے بنی کو آگئی ہو۔ اتنی دیر سے پلاؤں میں اٹکے ہوئے آئیوڈین ٹھاکر کر بستر میں جذب ہو گئے۔

(۳۹)

بہت دن بعد تمہلی بھیا کا خط آیا تھا۔ بڑی عجیبی ننھی سی چڑیا کی طرح ہر طرف پھرتی پھر رہی تھیں اور آماں بڑے اشتیاق سے عالمیہ کی طرف دیکھے جا رہی تھیں مگر عالمیہ کو اس وقت تمام ضروری کام یاد آ رہے تھے آماں کے اشتیاق میں جو خوف ناک ارادہ سہانا نک رہا تھا اس سے وہ اچھی طرح واقف تھی آماں داوی کی حویلی کی مالکن نہ بن سکیں۔ جاگیر دارنی نہ کھلا سکیں اب وہ بھاگتے بھرت کی لنگوٹی پر کتفا کر رہی تھیں۔ اور پھر تمہلی بھیا تو سچ بچ اٹھیں اچھے لگتے تھے۔ کیا مزے سے اپنے باپ کا منہ چڑا کر انگریزوں کو شکست سے بچانے کے لیے دوڑ پڑے تھے۔

عالمیہ بیٹی ذرا ایک بار پھر سے خط پڑھ دو، اپنی سنکھیں تو اب کام نہیں دیتیں، آنا پانی آنا کر سنے دھند چھاجاتی ہو بڑی عجیبی نے پانمان سے خط نکال کر عالمیہ کی طرف بڑھا دیا۔

”میری پیاری اماں - انتہائی مصروفیت کی وجہ سے آپ کو خط نہ لکھ سکا مگر اس کا
 یہ مطلب تو نہیں کہ آپ کو بھول گیا۔ اماں آپ تو ہر وقت یاد آتی ہیں۔ عالیہ بی بی تو اب اس
 آپ جی ہوں گی۔ خدا کرے وہ کامیاب ہو جائیں۔ انہیں گھنٹے میں دینے کے لیے میرے پاس آیا
 بچا ہی اور۔۔۔“

عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ باقی خط وہ نہیں پڑھ سکتی گی۔ اس کے گٹے میں کلمے چھوڑ کر
 تھے باقی خط ہزاروں حرابیوں سے پڑھا گیا۔

”اس گھر کو چھوڑ کر پھر ہم ہمیشہ کے لیے گھر سے محروم ہو جائیں گے۔ عالیہ جان۔“ بڑی
 سچی کے اٹھتے ہی اماں نے آہستہ سے کہا۔

اماں پھر میں کہیں چلی جاؤں گی، آپ مجھے جہنم میں کیوں جھونکنا چاہتی ہیں؟ عالیہ
 نے خود مختار لڑکیوں کے طور سے اماں کو دیکھا اور پھر ہر جھبکا لیا۔ خواہ۔ اس گھر کی دیواروں
 تک سے لونا ٹپک رہا ہے کتنے برس اور یہ گھر اماں کی جاگیر بنا رہے گا۔

اماں ناراض ہوئے بغیر خاموشی سے اس کو دیکھا کہیں۔ ان کی آنکھوں میں ناکامیوں کا
 احساس۔ سکتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ حویلی اور جاگیر سے محروم ہونے کے لیے اب وہ حقیر سے
 مکان کو بھی اپنا نہ کہہ سکتی تھیں۔

”یہ آٹا کھانے کے لائق ہے؟ بوریاں لگی ہیں۔ انٹریڈن بھی دکھانا تھا۔ کبھی اپنی زمینیں
 سونا اگلتی تھیں۔ کریمینا بوا آٹا سچھاتے ہوئے سوت جیسے باریک باریک کپڑے جن کر پینڈک
 رہے تھیں۔ لمبی جنگ نے صدمان سُتھرے گہوں کے ایک ایک دانہ کو ترسا دیا تھا۔ کریمینا بوا آٹے
 دن سچھپش کی شکار رہتیں۔“

”اپنی حکومت حیت جا۔“ تو کریمینا بوا سب کچھ کھانے کو بننے لگے گا، سب ہار گئے
 ہیں بس ایک جاپان ملک ہی تو رہ گیا ہے، انہی جانے یہ کس پتھر کے بنے ہیں۔ اماں نے کریمینا بوا کو لگا دیا

”بتیا ہوا زمانہ پھر نہیں آتا۔ چھوٹی دھن کے کریمین بوانے اپنے حساب بہت بڑی بات کہہ کر سب کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھری کر گندھے ہوئے آٹے کی لگان ڈھانکادی جانے چھی بیایا کیسی ہوں گی اور شکل میاں۔“

”چیب بھی رہ کریمین بوا، شکل کا ذکر نہ کیا کرو۔ بڑی چھی سنتی تو رونے بیٹھ جاتی ہیں عالیہ نے انھیں ٹوک دیا۔“

دھوبن کی پڑوں کا گٹھا اٹھائے اندر آگئی تو بڑی چھی میلے کپڑے سبوں کے جمع کرنے لگیں اور دھوبن پھولی ہوئی سانسوں کو ٹھیک کرتی تخت کے پاس زمین پر پھینکا پٹا مار کر بیٹھ گئی۔ ”اے چھوٹی دھن کلجگ، سو۔“ دھوبن نے ہاتھ پھیلا دیا۔ اک ذرا سی تمباکو تو کھلا دیکھے بیٹھ سو کھ رہا سو۔“

”کیا کلجگ؟“ اماں نے پان کا ٹکڑا اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”وہ جو حاجی صاحب کا لڑکا جنگ پر مارا گیا تھا نا، اس کی بیوی کسی کے ساتھ بھاگ گئی، تین سال ہوئے حاجی صاحب کے لونڈے کو مرے۔ ایسی شرافت سے گھر بڑی بنایا کرتی کہ سب واہ کر کے رہ جاتے، کسی کو کیا پتہ تھا کہ یہ گن بھرے ہیں۔“

”غضب خدا کا، کہیں مل جائے تو کھو کر دفن ادیا حرام زادی کو۔“ اماں نے بُرا سا منہ بنایا۔ ”جو دھوبن صدی ہی ایک زمانہ تھا کہ بارہ تیرہ سال کی لڑکی بیوہ ہو کر یوں ہی بیٹھی رہتی۔ تیر کے سو کسی دوسرے کا منہ نہ دیکھتی، پر اب تو سب ختم ہوا جابر باہر بچہ کہا ہے، بزرگوں نے کہ جو دھوبن صدی میں گائے گو کھائے گی۔ اور کنواری برمانگے گی۔ کریمین بوا بھی چیب نہ رہ سکیں۔“

”کریمین بوا یہ گائے ماما کی بات نہ کیا کرو۔ کسی ہندو نے من لیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اب وہ بھائی چارہ نہیں رہا۔ جہاں دیکھو پاکستان کے خلاف ہی۔ عورتیں تاک۔“

کنے سُننے سے نہیں چوکتیں ہم تو جیکے سے کپڑوں کا گٹھا اٹھا کر چلے آتے ہیں۔ اللہ بچائے
اس قوم سے، کان پور میں کیسے کیسے فساد نہیں ہوتے رہتے " دھوم مٹانے، پانسہ تمام لیا
اپنے کسی عزیز کا نوپر کے فساد میں مر چکے ہیں۔

یہ سب کھنیک ہی، زمانے بدل گئے، اگر یمن بوا جیسے اتنی بہت سی باتوں سے
ادب کر بھوٹے برتن سٹینے لگیں۔

(۴۰)

ساری رات بارش ہوتی رہی۔ چھابوں پانی برس گیا۔ صبح بھی آسمان صاف
نہ تھا۔ ابر کے سیاہ ٹکڑے اور دھندلے دھندلے بھر رہے تھے۔

عالیہ نے کھڑکی کے ٹھہرے ہوئے پٹ کھول دیے۔ سامنے ہائی اسکول کے
احاطہ کے درخت رات کی بارش سے نہا کر خوب نکھر گئے تھے اور کسی درخت میں چھپی
ہوئی کونل برابر چیخے جا رہی تھی۔ گلی میں بڑی ہوئی آموں کی گٹھلیوں اور مھلکوں کی بو
ہوا میں رچی ہوئی تھی اور اخبار والا بڑی تیزی سے گلی سے چلتا گزر رہا تھا۔ "خون ناک
ہم۔ جاپان کی کمر ٹوٹ گئی۔ ہیروشیما تباہ ہو گیا۔ اتھاد یوں کی فتح قریب ہی۔ آگیا۔ آگیا
آج کا اخبار، ہیروشیما۔"

اچھا تو ایک پورٹرا کیا۔ ہم سے ختم ہو گیا۔ پھر اس کے بعد کیا ہوگا، جمیل داس آج ہیں
گے، انگریزوں کے حق میں پروٹیسٹڈا کرنے کے سارے ہتھیار ختم کر کے خالی خولی داس آج ہیں
گے۔ مگر وہ بے چارے جو جنگ کا آگ میں جل مرے اب ان کے انتظار کرنے والوں پر
کیا گزرے گی؟ "اس سوال کا جواب نہ پا کر عالیہ بستر سے اٹھ پڑی۔ آج اسے اخبار پڑھنے
کی سچی طلب تھی۔

بڑے چچا بیٹھک میں جا چکے تھے اور اخبار کے صفحے اٹھالیے۔ ہیرہ شیا میں آگ کے شعلوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

اخبار رکھ کر وہ گم سم سی بیٹھ گئی۔ اشد یہ حکومتیں شہروں کو کیوں نشانہ بناتی ہیں ان کا کیا قصور، انہیں کیوں موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ مگر یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ تاریخ کبھی سُکرائے گی بھی کہ نہیں، ایک ایک لفظ خون کی بوند معلوم ہوتا ہے۔ ہیرہ شیا کی آگ میں کیا کچھ نہ جل گیا ہوگا۔ پتہ نہیں لوگ اس وقت کس عالم میں ہوں گے۔ وہ اس وقت زندگی کے کتنے بہت سے کام انجام دینے کی سوچ رہے ہوں گے وہ کیا کچھ کرنے کو گھروں سے نکلے ہوں گے اور کیا پتہ اس وقت بھی بچے جا پانی گڑیاں خریدنے کسی دوکان پر کھڑے ہوں گے اور اس وقت اچانکے خوف ناک بم کا دھماکہ ہوا ہوگا اور "جلدی جلدی چائے پی لو عالیہ بیٹا، اسکول کا ٹانگہ آنے والا ہوگا۔ یوں ہی بیٹھی کیا سوچ رہی ہو" کر مین بوانے ٹوکا تو وہ جلدی سے چائے پینے بیٹھ گئی۔ ابھی تو اسے تیار بھی ہونا تھا۔

"جاپان بھی ہارنے والا ہے۔ ان کا ایک پورا پورا شہر تو تباہ ہو گیا۔ غل خانہ سے نکل کر آماں نے بڑے اطمینان اور سکون سے خبر سنائی۔"

"جی ہاں" چائے پی کر وہ صحن میں آگئی۔ بڑی چچی نل کے پاس بیٹھی ہاتھ منہ دھور ہی تھیں۔ کیاری میں سارے پودے بارش کے بوجھ سے دب کر زمین پر ٹھبک گئے تھے۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ بال ٹھیک کر رہی تھی کہ باہر سے آواز آئی۔ "استانی جی، ٹانگہ آ گیا ہے۔"

برق ہاتھ پڑا لے جب وہ زینے سطر کرنے لگی تو آگے آگے نخبہ پھوپھی بہت

اونچی اڑیوں کی سینڈل پر چھوٹی اتر رہی تھیں۔ "اُستانی جی ہانگہ آگیا ہے" "نخبہ بھو بھی نے گردن گھما کر کہا۔ ان کے ہونٹوں پر کیسی مضحکہ خیز مسکراہٹ تھی۔

"ہم دونوں ایک ہی کام کرتے ہیں، مگر آپ لکچرار کی جاتی ہیں اور میں اُستانی۔ یہ فرق اگر نہ بھی مٹے تو کیا قیامت آجائے گی" عالیہ نے تلخی سے جواب دیا۔

"واہ یہ فرق مٹ بھی کیسے سکتا ہے۔ کیا تم نے انگلش میں ایم اے کیا ہے؟ گڈھے اور گھوڑے میں کوئی فرق تو ضرور ہوتا ہے" "نخبہ بھو بھی چائے پینے کے لیے بیٹھ گئیں۔ اُستانی جی، کالج سے ہانگہ آگیا ہے" باہر سے صدا آئی۔

"ہانگے دالوں کے لیے ہم اور آپ دونوں برابر ہیں" عالیہ زور سے ہنسی۔ "آپ انہیں سمجھاتی کیوں نہیں؟" وہ ہانگہ پر جا بیٹھی۔ "نخبہ بھو بھی کیا کہہ رہی تھیں اس نے سنا نہیں۔

اسکول سے واپسی پر عالیہ نے دیکھا کہ کوئی صحن میں کھڑا ہے۔ وہ پشت سے پہچان نہ سکی مگر جیسے ہی دو قدم آگے بڑھی تو چھٹی پدٹ کر اس سے لپٹ گئی۔ "ارے چھٹی تم آگئیں؟" عالیہ اسے زور زور سے بھینچ رہی تھی۔ "اور وہ برادری میں کون لیا ہے؟ کھٹولے پر؟"

"پتہ نہیں سبیا" چھٹی تھینپ گئی۔

"چھٹی کی بیبا ہے اور کون ہے؟" بڑی چچی نے نہال ہو کر بتایا۔

"اوہ!" عالیہ برقع اتارنا بھی بھول گئی اور سچی کی طرف بھاگی۔ "ہے کتنی پیاری ہے! بالکل چھٹی کی طرح" عالیہ کا جی چاہا کہ اسے سوتے سے اٹھا کر خوب پیار کرے۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اگر تھینپہ آ پا زندہ ہوتی تو شاید ان کے بھی ایک دو بچے ہوتے۔

بچی کے منہ پر سے دو پٹہ سرک گیا تھا اور کال پر لکھی آبیٹھی تھی۔ عالیہ نے کبھی اڑا کر
منہ ڈھانک دیا، کھل میں اسکول سے آتے ہوئے اس کے لیے ایک چھوٹی سی کھچر دانی خرید لادوں
گی، پھر مکھڑوں سے محفوظ ہو جائے گی۔ عالیہ نے کہا۔

”لو بھلا مکھڑوں سے کون بچاتا ہے یہ تو سب ہمارے یہاں مٹی تیلیاں میں بچا، چھٹی منہس
دی“ اگر ہمارے گاؤں میں کوئی ایسی بات کرے تو سب مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ کھلا مکھڑوں
سے بھی کوئی بچ سکتا ہے۔ وہ پھر مٹنے لگی، کیسا دکھ تھا۔ اس کی منہس میں۔ وہ دہلی ہو گئی تھی۔
اس لیے کچھ زیادہ ہی خوب صورت لگ رہی تھی۔ جمیل کھبیا نے چھٹی کو کھو کر غلطی ضرور کی ہے
عالیہ کو خیال آیا اور وہ برقع اتارنے لگی۔ ”بڑے چچا سے ملیں؟“ اس نے برقع لٹکتے
ہوئے پوچھا۔

”کہاں؟ وہ گھر میں آئے ہی نہیں۔ چھٹی نے کہا اور پھر بڑی چچی کی طرف مڑ گئی۔“
اچھے تو میں بڑے چچا، اس نے بڑی بوڑھیوں کی طرح پوچھا۔

بس اچھے ہی میں کمزور ہو گئے، میں۔ بڑی چچی نے جواب دیا۔

”تم کھانا کھا چکی ہو چھٹی؟“ عالیہ نے پوچھا۔

نہیں میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی بچیا۔“

چھٹی کی بیا جاگ کر رونے لگی تو بڑی چچی نے اسے اٹھا کر کنارے سے لگا لیا۔ اور
بڑی محبت سے کھینچنے لگیں۔ اماں تخت پر مٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک بار
بھی چھٹی یا بچی کی طرف نہیں دیکھا۔ جب سے عالیہ اسکول میں ملازم ہوئی تھی، اماں کی نظر
میں سب کے لیے کتنی حقارت پیدا ہو گئی تھی پھر چھٹی سے تو وہ ہمیشہ کا بیر رکھتیں۔

”تمہارے میاں نہیں آئے چھٹی؟“

”نہیں بچیا وہ کیسے آتے، ان کی منہس بیمار تھی۔ انہوں نے مجھے زانے ڈوبے

میں بٹھا دیا تھا اور ایک بوڑھی عورت سے کہہ دیا تھا کہ مجھے دیکھے رہو " وہ سننے لگی۔
تم بہت یاد آتی محفیں تھمتی " عالیہ نے اسے پیار سے دیکھا۔ چھٹی اپنا حوالے نے نظمن
نہیں یہ صبح سوچ کر اسے دکھ ہو رہا تھا۔

" میں بھی آپ ہی سے تو ملنے آئی ہوں۔ "

" ہوں! تمہارے جانے کے بعد گھر میں سکون ہو گیا تھا۔ اس لیے محفیں یاد کر کے
ٹڑتی تھی " اماں نے جلی کٹی نظروں سے چھٹی کو دیکھا۔
" اچھا! چھٹی ان کے طنز کو سہہ کر سنس پڑی۔

اسے کیا چھٹی اتنی ٹھنڈی پڑ چکی ہو۔ عالیہ کو یقین نہ آ رہا تھا کیسی سنجیدہ اور بھاری
بھرم سی لگ رہی تھی۔

" چھٹی اس کو تو مجھے دے دے، اسے پال کر زندگی کے دن کٹ جائیں گے، بڑی
چچی چھٹی کی بیٹا کو جوم جوم کر کہہ رہی تھیں۔

لے لیجے۔ بڑی چچی " چھٹی نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ شاید چھٹی
کو اپنی پردیش کا زمانہ یاد آ گیا تھا۔ اسے بھی تو یہاں پننے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔

چھٹی کی بیٹا بھوک سے باہلا کر زور زور سے رونے لگی تو چھٹی نے کھانا چھوڑ دیا
اور ہاتھ دھو کر اسے گود میں لے لیا۔ بڑی چچی کمرے میں چلی گئیں اماں پہلے ہی چھٹی کے
کمرے میں پاندان لے کر جا چکی تھیں شاید انھیں خطرہ ہو گا کہ چھٹی اپنے کمرے میں
ڈیرہ نہ ڈال دے۔

کتنی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے سخت جلن ہو رہا تھا اور پہر
کالے نہ کتیں۔

کریمین بوا صاحبزادی کے لیے یہ کھلونے لے جاؤ۔ اور چھٹی بیٹا کو میری دعا کو

اور اگر سب لوگ کھانا کھا چکے ہوں تو — "سرار میاں ہٹھک کے کواڑوں کی آڑ میں
کھڑے کہہ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آگے سے بچا ہوا سالن ایک پیالے میں جمع کر کے سرار
میاں کے بیضہ مار کرنے کا سامان کر رہی تھیں۔

عالیہ نے ہاتھ بڑھا کر کھلونے لے لیے تو کریمین بوا جیسے بلبل اٹھیں۔ وہ خدا کی شان ہی
زمانے زمانے کی بات ہی۔ سرار میاں بھی بیباکی اور لاد کے لیے کھلونے لائیں "کریمین بوانے
سالن کا پیالہ اور روٹیاں ان کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ پر بیچ دیں۔

"یہ کھلونے سرار میاں نے دیئے ہیں اور دعا کی ہی؟ عالیہ نے بچوں کی طرح
جھنجھٹا بجا یا۔

"اس طرح تو ادنیٰ ہونے سے رہی سرار میاں، یوں ہی کھیل پھلاتے پھرتے ہو۔
اپنی اذیت بھی نہیں پہچانتے۔ کریمین بوا برآمدے میں اب تک بڑبڑا رہی تھیں۔

کریمین بوا، اللہ کرے تم گونگی ہو جاؤ یا سرار میاں مر جاؤ " عالیہ نے دل ہی دل
میں دعا کی اور پھر بڑی جچی کے پاس بیٹھ گئیں وہ کپڑوں کی گھٹریوں اور تلے دانوں کو کھولے
ریشمی ٹکڑے چھتی کی بیباکی لے کر تہ ٹوپی سی رہی تھیں۔ اور بڑا بڑا سیکے جا رہی تھیں۔
چھٹی تمھاری ساس کیسی ہے؟ لڑتی تو نہیں؟ تمھارا میاں تو تم سے بہت محبت کرتا ہوگا۔"

چھٹی ہنس ہنس کر ہر بات کا جواب ہاں میں دے رہی تھی مگر عالیہ دیکھ رہی تھی کہ
چھٹی سب سے نظریا بجا رہی ہے۔ "مجھے یہ اتنی پیاری کیوں ہے بھیا؟" تمام باتوں سے بچنے
کے لیے چھٹی نے دوسری بات شروع کر دی۔

"تمھاری بیٹی جو ہے۔"

"جب سے یہ سامنے آئی ہے ساری دنیا بیچ ہو گئی ہے۔" چھٹی نے ٹنڈی سانس بھری
اور اپنی بیباکی سے لگا کر لپٹ گئی۔ "اس کے باپ اور دادی کو اس سے کوئی محبت

نہیں بیٹھا چاہیے تھا۔
ذرا ہی دیر میں چھٹی سو گئی اور سوتے میں لمبی لمبی آہیں بھرنے لگی مگر عالیہ بڑی چچی کے
کے ساتھ ساری دوپہر کرتے ٹوپی سلانی رہی۔

شام کو سب لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ بڑے چچا آگئے۔ چھٹی نے ان کی طرف دیکھا
اور منہ پھیر لیا۔

”بڑے چچا کھڑے ہیں، میں تو پہچانی نہیں، وہ بڑے طنز سے ہنسی تسلیم بڑے چچا،
سُنائیے آپ کی بانگوں میں باڑی کا کیا حال ہے، ماشا اللہ گاندھی میاں کی نگر تو لمبی ہوتی جا رہی ہے۔“
اسے یہ تو دہی چھٹی ہے۔ بس اتنا فرق ہے تاکہ اب گود میں بچہ ہے۔ عالیہ اسے حیران
نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”تمہارے گھر میں سب خیریت ہے۔“ بڑے چچا بوجھلا کر بیٹھک کی طرف پلٹے۔ ”کریمین بوا
چلے باہر کھجوادو۔“

”عمر لمبی نہ ہو تو کیا ہو اے چارہ ہندوستان پر حکومت کے خواب دیکھ رہا ہے، لو بھلا
لنگوٹی باندھ کر حکومت کرے گا۔“ اماں خوش ہو کر چھٹی سے بول پڑیں اے معاملات میں تو وہ
سو فی صدی چھٹی کے ساتھ رہیں۔ پھر ادھر تو وہ انگریز حکومت پر دل و جان سے قربان ہونے
کو تیار تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ جب سے عالیہ ملازم ہوئی تھی (ماں کی انگریز بھابھی بہت محبت
سے خط لکھنے لگی تھیں۔ ان خطوں میں وہ بڑے مزے مزے کی باتیں لکھتی تھیں، مثلاً یہی کہ اگر
ہندوستان میں ہر عورت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے تو پھر یہ ملک بھی انگلینڈ کی بھاری
کر کے گا۔

”چھٹی اب تو تم اتنی بڑی ہو گئی ہو، اماں بن چکی ہو، کچھ تو لحاظ کرتیں بڑے چچا کا“
عالیہ نے ضبط کرنے کے باوجود چھٹی کو ٹوک دیا۔

”بس جانے کیا ہو گیا تھا۔ میں اُن سے معافی مانگ لوں گی بجیا۔“ وہ سر تھکا کر
 کچھ سوچنے لگی۔ ”میں صبح چلی جاؤں گی۔“ وہ کریمین بو کی طرف مڑ گئی۔ ”کریمین بو اہل
 میاں سے کہہ دیا کہ صبح تا ننگہ لے آئیں اور مجھے گاڑی پر بٹھال دیں۔“

”ارے تو کیا تم اتنی جلدی چلی جاؤ گی۔ چھٹی، ناراض ہو؟“ عالیہ اس کے پاس سرک

کر کھڑی ہو گئی۔

بھئی حد کرتی ہیں آپ بھی، میں آپ سے ناراض ہو سکتی ہوں۔ آپ کو کیا پتہ کتنی مشکل

سے ایک دن کی اجازت ملی ہے، آپ نہیں جانتیں عالیہ بجیا، آپ نہیں جانتیں۔“ اس کی

آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ ”جی تو یہی چاہتا ہے کہ یہیں پڑھی رہوں پر اب یہ میری

ٹیٹیا جو ہے، ارے اس کا کوئی اچھا سا نام تو بتا دیں۔ بجیا، اس کی دادی نے تو اس کا نام

تیزن رکھا ہے، چھٹی نام بتا کر ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔

تم رک کیوں نہیں سکتیں اس کھدس دن تک مت جاؤ۔ گھر کتنا اچھا لگ رہا ہے

لگتا ہے بہار آگئی۔ عالیہ جذباتی ہو رہی تھی۔ ”تمہارے جانے کے بعد کیا سنا اچھا یا

ہو، چھٹی، جی ادبھ جاتا ہے اس خاموشی سے۔“

”بھیرا بنگی بجیا۔“ چھٹی بڑے انہماک سے اپنی بیٹیا کو تھپکے ہی تھی۔

گلی میں تا ننگہ رکا اور تجربہ کھو بھی ساری کا پوسٹو آرتی گھر میں داخل ہوئیں۔ ارے

واہ چھٹی آئی ہے۔ کیا حال چال ہے۔ اور یہ تمہاری بیٹی ہے؟ بڑی پیاری ہے، باپ پر بالکل

نہیں پڑی۔“ انہوں نے پیار سے بیٹا کے گال تھپ تھپائے۔ اسے خوب پڑھا نا چھٹی

درخیز بھی جاہل رہ جائے گی۔ سب کی طرح۔“

”آپ کے پاس بھیج دوں گی، پڑھا دیکھے گا نا؟“ چھٹی کا چھوڑا تیر تجربہ کھو بھی

کی پیشانی کو بگاڑ گیا۔ ”اچھا بھیرا باتیں ہوں گی۔ ابھی تو میں تھکی ہوئی ہوں۔“ وہ

کھٹ کھٹ کرتی زینے چڑھنے لگیں۔

”کچھ شکیل کی بھی خبر لگی؟“ تھمتی نے سرگوشی کی۔

”نہیں تھمتی عالیہ نے چپکے سے جواب دیا۔

”اور ہمارے اتانے بھی کبھی خط لکھا؟“

عالیہ نے کوئی جواب نہ دیا بچے کے گال سملاتی رہی۔ تھمتی جواب نہ پا کر ادھر ادھر

دیکھنے لگی۔

سب کو بوجھا مگر جمیل بیٹیا کو بھول گئی، اس محبت میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی

عالیہ کو عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

رات آسمان اس قدر صاف تھا کہ چاندنی دو دو بیڑوں میں نہائی ہوئی معلوم ہو رہی

تھی۔ آنگن میں ہمارے سے کچھ ہوئے پلنگوں میں آج ایک ننھے سے کھٹولے کا اٹنا نہ

ہو گیا تھا اور اس کھٹولے پر پڑی ہوئی ایک ننھی سی بچی کی غوں غاں رات کو اور بھی

خوبصورت بنا رہی تھی۔ کل کی موسلا دھارا بارش نے آج کی رات کو ہلکا سا سرد کر دیا تھا

آج تو عالیہ نے بھی تھمتی پر سونے کے بجائے آنگن میں تھمتی کے برابر اپنا بستر لگالیا تھا۔

عجیب سی رونق کا احساس ہو رہا تھا۔ سب ایک جگہ جمع تھے، باتیں ہو رہی تھیں اور تھمتی کی

ٹہیا پر غوں غاں کیے جا رہی تھی۔ بس ایک سنجہ بھولی تھیں۔ جو آج بھی الگ تھلگ جاہلوں

کی صحبت سے دور تھمتی پر کھلی پڑی تھیں۔ ہاں بڑے سچانے بھی تھمتی سے ملنے کے بعد پھر گھر

میں قدم نہ رکھا تھا۔ بیٹھک میں کھانا کھایا۔ اور باہر بیوٹرے پر بستر لگو کر لیٹے جانے کے

باتیں کر رہے تھے۔

کر مین بوا ایک اچھی سی کہانی سنا دو۔ تھمتی نے فرمائش کی۔ وہ اس وقت ذرا

ہی سچی لگ رہی تھی۔

اب تو یاد بھی نہیں آتی، چھٹی بیا۔ اگر کمین بوا سوچنے لگیں۔

”کوئی سی کہانی سنا ڈالو کمین بوا کہ ہائے کتنے فرے کی ہوتی ہیں یہ کہانیاں بھی۔“
عالمیہ بھی ضد کرنے لگی۔ کتابوں کی دنیا سے وہ تھک چکی تھی۔ اس وقت تو اس کا دل چاہ رہا
تھا کہ کوئی مضموم سی کہانی سنے۔

”ارے وہی کہانی سنا دو کمین بوا کہ ایک بادشاہ تھا اس کی سات بیٹیاں تھیں
ایک دن بادشاہ نے اپنی ساتوں بیٹیوں کو بلا کر پوچھا کہ تم کس کی قسمت کا کھاتی ہو تو سب
نے کہا: آپ کی قسمت کا مگر سب سے چھٹی بیٹی نے کہا کہ میں اپنی قسمت کا کھاتی ہوں
اور بادشاہ نے اُسے جنگل میں ڈال دیا کہ اپنی قسمت کا کھاؤ اور پھر وہ لڑکی جنگل میں
تہنا بیٹھی رہ رہی تھی تو ایک دیو آیا۔ اور اس نے لڑکی کے لیے محل بنایا۔ اور بس۔
وہی سی کہانی سنا دو کمین بوا، اتنی بہت سی تو میں نے یاد دلا دی۔ چھٹی اٹھ کر بیٹھ گئی۔
”اچھا تو پھر سناؤ۔ ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، ہاں تو اس بادشاہ
کی سات لڑکیاں تھیں، ایک دن بادشاہ نے ان ساتوں کو بلا کر پوچھا۔“

کمین بوا کہانی کے جا رہی تھیں مگر عالمیہ نے ایک لفظ نہ سنا وہ تو سوچنے لگی تھی
کہ آخر چھٹی کو یہی کہانی کیوں یاد آئی۔ کیا چھٹی کو اپنی قسمت سے کوئی سی تھی وہ تو کتنی مدت
سے اپنی نصیبی کے جنگل میں بٹک رہی تھی مگر اب تک کوئی دیو نہیں آیا۔ ارے چھٹی یہ جو
لوگ کچھ نہ پاسنے کی حسرت میں مضموم کہانیوں سے سجا رہا تے ہیں۔ ان میں کوئی حقیقت
نہیں ہوتی۔

کہانی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ چھٹی کو منید کی پری لے اڑی۔ جانے کس محل میں لے
گئی ہوگی۔ جانے کس شہزادے کے پو پو میں بٹھا آئی ہوگی۔

”سچ چھٹی چلی گئی مگر اسکول جاتے ہوئے عالمیہ کو محسوس ہوا تھا کہ وہ رنجیدہ ہے، آج

۲۲۸
وہ اسکول میں جی سے نہ پڑھا سکے گی۔ کچھ دن کے لیے چھٹی رُک ہی جاتی تو کیا تھا۔

(۴۱)

ناگاساکی پر بم گرتے ہی جنگ ختم ہو گئی تھی۔ جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے تھے، دلی سے جیل بھیا کا خط آیا تھا کہ اب وہ جلد آ جائیں گے، اب ان کا کام ختم ہو گیا اور آج جب جا رہے وہ سو کر اٹھی تو اس نے دیکھا کہ سچ جیل بھیا آ گئے ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ فوراً نیچے چلی جائے یا یہیں بیٹھی رہے مگر اس طرح تو شاید بڑی چچی برا محسوس کریں۔ اور آخر وہ یہاں بیٹھی ہی کیوں رہے۔

وہ نیچے اتر گئی۔ اماں اور بڑی چچی جیل کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ کرکین بوا چائے کا سامان تیار کر رہی تھیں کتنی مدت بعد بڑی چچی کا چہرا کھلا ہوا نظر آ رہا تھا۔
مگر آپ لوگ ڈرتی کیوں تھیں؟ میں تو دلتی میں بیٹھ کر اپنے قلم سے جنگ لڑ رہا تھا۔ میرا محاذ پر کیا کام تھا؟ جیل بھیا سنس سنس کر رہے تھے۔

بس میں ڈرتی تھی کہ کبھی تم بھی لڑنے کو نہ بھیج دیے جاؤ۔ جب کوئی بات ہوتی تو میں تڑپ جاتی، تم خط بھی تو نہ لکھتے جلدی۔ جب دیر ہوتی میں سمجھتی کہ تم بھی جنگ پر لڑنے بھیج دیا جائے گا۔ بڑی چچی اپنی بے وقوفی پر شرم رہی تھیں۔ "بھیر تم کبھی آئے بھی تو نہیں اسے دلی اتنی دور تو نہ تھی۔"

"اور ہمارے آبانے بھی کبھی نہ سمجھایا کہ سیرا کام کیا ہے؟ میں کہاں کہاں جا سکتا ہوں۔ خواہ مخواہ آپ پریشان رہیں۔" جیل بھیا بڑی چچی کے لپٹے جاتے۔ "اتنے دن نہ آیا تو کیا ہوا اب تو آ گیا۔" انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ "ادہ عالیہ بی بی۔"

"اچھی تو ہو، اب تو تم بڑی آدمی ہوئی ہو، ہم تو لیل ہی جا رہ گئے۔"

مجھے پڑھاؤ گی کہ نہیں ہے۔

”یہ چھوٹے بڑے کا کیا ذکر لے بیٹھے آپ، سنائیے کیسے رہو ہے“ عالیہ نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی کوشش کی مگر جلد ہی نظریں جھک گئیں۔ نوجوی دردی میں جمیل بھتیجا خالصہ خوبصورت لگ رہے تھے۔

”جی ہاں۔ یہ دردی، لگتا ہوں نابے وقوف، یا پھر خوبصورت ہے“ جمیل بھتیجا شاید اسے چھیڑ رہے تھے۔

”جنگ کی کوئی بھی نشانی خوبصورت ہو سکتی ہے“ اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ارے بھئی اماں جلدی کیجئے میں اپنی دردی اتاروں تاکہ کچھ تو خوبصورت لگوں میرے کبس کہاں ہیں، آپ کپڑے نکال دیجئے۔“ جمیل بھتیجا زور سے ہنسنے لگا۔ ”میں گھر آکر تمنا خوش ہوں کتنی دُرت بعد سب کو دیکھا ہے۔“ انھوں نے بڑی گہری نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھا۔ ”دور رہ کر انسان کتنا صابر ہو جاتا ہے۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”بھئی تم نے بھی مجھے یاد کیا تھا؟“ انھوں نے عالیہ سے پوچھا۔

”ہاں! جب بڑی چچی آپ کو یاد کر کے روتی تھیں تو آپ یاد آجاتے تھے۔“ اس نے بڑی بے تعلقی سے جواب دیا۔

”تم بالکل نہیں بدلیں، بالکل ویسی ہی ہو۔“

”آپ اپنے سلسلے میں کچھ بتائیے؟“ اس نے بات ٹالی۔

”اپنے بچے کیا بتاؤں، ملازمت سے چھٹی لے کر آیا ہوں، اب پھر وہی بے کاری

ہوگی۔ اور ہم“ انھوں نے کبھی سی آواز میں کہا۔

”تو آپ نوکری چھوڑ کیوں آئے، جمیل بھتیجا، اب ظاہر ہے کہ بے کاری کا مسخہ کھینا

ہی پڑے گا۔ پہلے آپ نے اس ملازمت کو کیسے قبول کر لیا تھا، بڑے چچا کی صند میں؟“

”ادہ! میں ان سے کیا ضد کروں گا۔ ان کے لہجے میں سختی تھی۔“ میرا مقصد پورا ہو گیا۔ تو ملازمت بھی گئی۔ کوئی ضروری تھا کہ جو کیا ہو اس پر قائم رہوں؟ اب تو آزاد ہونے کے بعد ہی ملازمت کروں گا۔“

”دیکھو جمیل میاں، یہ باتیں مت کرو، اب تو تم نے دیکھ ہی لیا کہ انگریزوں سے لڑ کر بڑے بڑے ملکوں کو بھی کیا بھگتنا پڑا، اس لئے آزادی کے خواب دیکھنا چھوڑ دو۔“ اماں نے جمیل بھیا کو سمجھایا۔

ٹھیک کہتی ہیں آپ، میں تو اب سب کچھ چھوڑ چکا ہوں۔“ وہ بڑی سعادت مندی سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

”تم شکیل سے ملے تھے؟“ بڑی چچی نے جمیل بھیا کو کپڑے دیتے ہوئے سوال کیا۔
 ”ملا تھا اماں مگر اس نے تو منہ پھیر لیا۔ وہ بڑا آدمی ہو گیا ہے، وہ ہم لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا۔ آپ اس نالائق کو مت پوچھا کیجئے۔“
 ”جاؤ نہ! لو۔“ بڑی چچی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”اماں ہمارے ابا کہاں ہیں۔؟“

”صبح سے کہیں گئے ہیں، بس آتے ہی ہوں گے۔“ بڑی چچی نے بتایا۔

”کبھی بڑے چچا بھی آپ کو یاد آتے تھے؟“ عالیہ نے ہنس کر پوچھا۔

”ابا کبھی مجھے یاد کرتے تھے؟“ وہ بھی ہنسنے اور پھر اس کی طرف مڑ گئے۔ ”اور

تم تو مجھے یاد کرتی ہی نہیں تھیں۔“ انھوں نے بڑی اُسید سے اس کی طرف دیکھا۔

”ان یادوں وغیرہ سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔“ اس نے نظریں جھکالیں۔

وہ چپ ہو گئے۔ چند منٹ تک کچھ سوچتے رہے اور پھر کریمین بوا کے لیٹ کر کھڑے

ہو گئے۔ ”میری کریمین بوا تم تو مجھے یاد کرتی تھیں نا، تم آج میرے لئے کیا پکار رہی ہو؟“

”میں نے تو تڑپ کر دن گزارے ہیں، آپ کی سٹک خوار ہوں تمہیں میاں ؟
 کرہن بوانے ان کی بناؤں لے لینے۔ وہ اپنے تمہیں میاں کے لیے پلاؤ پکا رہی ہوں
 تمہیں بھیانے کٹھپوں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے مسخہ پھیر لیا۔ کاش آج اس
 کی چٹی نہ ہوتی، آج بھی وہ اسکول میں لڑکیوں سے سر کھپا رہی ہوتی۔

”مارے ہاں وہ ہماری نجمہ کھو بھی کہاں ہیں اماں؟“ تمہیں بھیانے پوچھا۔

”وہ تو اب اس گھر سے سخت بیزار رہتی ہیں۔ اس لیے اپنی ایک سہیلی کے گھر جا بھتی

ہیں، وہ بھی ان کے کالج میں پڑھاتی ہیں۔“ بڑی چچی نے جواب دیا۔

”کھیر تو یقیناً وہ انگلش میں ایم۔ اے ہوں گی، ویسے دوستی کیسے ہوتی ہے؟“ تمہیں بھیا

نے ایک تہتہ لگا با اندر کپڑے اٹھا کر غسل خانے چلے گئے۔

بڑی چچی سخت مصروف تھیں، تمہیں بھیا کے کس ٹھیک ہو رہے تھے، اماں تخت پر

دستر خوان بچھا رہی تھیں اور عالیہ سر نوڑھائے سوچے جا رہی تھی کلاب اس گھر میں کیسے گزارہ

ہوگا، یہ ہزرت کی ذہنی اذیت کیسے برداشت ہوگی، تمہیں بھیا تو جنگ ختم کر آئے مگر اس

کے ذہن میں جو جنگ ہوگی اسے کون سا اٹیم بہنہ تم کرے گا۔

”تمہیں آگیا ہے تو گھر کیا اچھا لگ رہا ہے؟“ بڑی چچی نے اماں کی طرف دیکھا۔

”گھر کا مالک جو ہے۔ اسی کے دم سے رونق ہے۔ بڑی بھابی“ اماں نے نہال ہو کر کہا۔

”اس کے مالک بڑے چچا ہیں۔“ عالیہ خواہ مخواہ بیچ میں کود پڑی۔

اماں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ جب سے وہ کمانے کمانے کے لائق ہوئی تھی اماں

اس کی ساری باتوں کو پی جا یا کرتی۔

عالیہ بڑے چچا کے لیے ہٹنے لگی۔ جانے صبح سے کہاں مارے مارے پھر رہی ہیں، نہ

وقت پر کھانا نہ آرام، کتنے کمزور ہو گئے ہیں۔ اور اب تو تمہیں بھیا آگے ہیں، ہزرت

کا مقابلہ ہوگا۔ اتنے دن سے کھپڑے ہوئے یہ باپ بیٹے جانے کس طرح نہیں گئے۔
 جمیل بھیا نہا کر نکل آئے اماں انھیں اپنی جائگیر کی طرح سمیٹ کر ہاپو میں بٹھانے کی
 کوشش کر رہی تھیں۔ عالیہ کی جان سلگ اٹھی وہ اپنی اماں کی اس محبت کی ذمے دار
 نہیں وہ انھیں تہیل بھیا جلیا شاندار داماد دینے سے قطعی مجبور ہے۔

جمیل بھیا اماں کے پاس دو چار منٹ بیٹھنے کے بعد اٹھ کر ٹہلنے لگے اور جب ٹہلتے
 ہوئے اس کے پاس سے گزرے تو اس نے اطلال سے دی۔ "تھمھی آئی تھی۔"

"اٹھا!" جمیل بھیا مسخڑ لٹکائے آگے بڑھ گئے اور جب دوسرے چکر میں
 اس کے پاس سے گزرے تو وہ پھر بھی حُپ نہ رہ سکی۔ "اُس نے آپ کو ذرا
 بھی یاد نہ کیا۔ اس کی ایک پیاری سی بیٹھی ہے۔"

"بہت خوب! مگر میں نے کب کہا ہے کہ تم ساری کتھا سناؤ اور میں نے
 کب چاہا تھا کہ وہ مجھے یاد کرے۔ وہ بھن بھناتے ہوئے اماں کے پاس جا بیٹھے۔
 جمیل بھیا کو سستا کر اُسے بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ان کے
 ٹہلنا اور اسے چھو کر نکل جانے کا سارا مزہ اکر کر دیا تھا۔"

"کرکین بوا جلدی سے کھانا تیار کر لو، کھاپی کو باہر نکلوں، کچھ دیکھوں
 بھاؤں" جمیل بھیا سخت بد مزہ ہو رہی تھے۔

لو اتنی جلدی پڑ گئی باہر نکلنے کی؟ "بڑی چچی نے پیار بھرے غصے سے ان کی
 طرف دیکھا۔"

کارہ بار جو دیکھنا ہوا بڑی چچی۔ عالیہ نے طنز کیا مگر سب اس قدر نوڈ میں تھے
 کہ کچھ سمجھے ہی نہیں اور سننا شروع کر دیا۔ جمیل بھیا اسے اندھیری اندھیری آنکھوں
 میں تک رہے۔

کھانے کے بعد جمیل بھیا باہر چلے گئے اور عالیہ اور پیکرے میں آگئی۔ رات بدل گئی تھی۔ اب دن میں بس جمیل ہی گرمی ہوئی پھر بھی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ آج بڑے زور سے گرمی پڑ رہی ہے، اس کا سارا جسم جل رہا ہے وہ آرام نہیں کر سکتی ساری دوپہر بستر پر کوزے میں بدل کر گزر گئی وہ اپنے متعلق سوچ سوچ کر تھک چکی تھی۔

شام کو جب عالیہ چائے پینے کے لیے نیچے اترتی تو جمیل بھیا اپنی لوبہ کی کرسی پر بیٹھے شاید چائے کا انتظار کر رہے تھے، عالیہ پی بی۔ انہوں نے دھیرے سے پکارا۔
"جی! وہ آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی۔"

"یہاں آ کر عجیب سا احساس ہو رہا ہے، دوری بھی کتنی اچھی حسیر ہوتی ہے، فاصلے بہت کچھ مٹا دیتے ہیں، انہوں نے لمبی سانس لی۔"

"ٹھیک ہی جمیل بھیا، اس نے نظریں جھپکائے ہوئے جواب دیا اور جاہلی سے براہ کسر میں چلی گئی۔"

اماں ابھی تک کمرے سے نہ نکلی تھیں اور بڑی چچی جانے کن انتظارت میں جہی ہوئی تھیں۔

کمرین بوانے چائے دم کر کے تپائی پر رکھ دی تو اس وقت بڑے چچا شیردانی کا بٹن کھولتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے

عالیہ پیالیوں میں چائے بنا رہی تھی کہ سب پھوڑ پھوڑا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"اسلام علیکم" جمیل بھیا نے کھڑے ہو کر کہا۔

بڑے چچا نے جیسے چونک کر جمیل بھیا کو دیکھا۔ "علیکم سلام" وہ منہ ہانقد

دھونے کے لئے چوکی پر بیٹھ گئے۔ "سب خیریت ہے؟"

"سب خیریت ہے، جمیل بھیا چائے کی پیالی اٹھا کر پھر کرسی پر جا بیٹھے۔"

عالیہ چائے بنانے لگی۔ یا اللہ یہ باپ بیٹے ہیں! اتنی مدت کے بعد یہ وہی طرح مل سکتے تھے؟ نظریے کی کھائی دونوں کے بیچ میں حائل ہو، دونوں میں سے کوئی بھی اسے پھیلانگنے پر تیار نہیں تھا۔ یہی شکل تھی کہ تھمبی کی طرح جمیل قبیلے نے منہ نہیں پھیرا۔ منہ ہاتھ دھو کر بڑے چچا بیٹھک میں چلے گئے اور کرکٹین بوانے وہیں چائے پہنچا دی۔ زندگی کٹھن بھی ہو اور ہاسان بھی۔ یہ سب کچھ ہنسان کے اپنے ہاتھ میں ہو کر وہ اپنی زندگی سے کس طرح کا سلوک کرنا چاہتا ہو، کیا خیال ہو، تمہارا ہے، انہوں نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ "ایک پیالی اور بنا دو عالیہ بی بی۔" جمیل بھی اس وقت بہت رنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

"میرا بھی یہی خیال ہو، اگر آپ چاہیں تو اپنی زندگی کو آسان بنا سکتے ہیں۔" عالیہ نے ان کی طرف پیالی بڑھائی۔ "لیجئے لیجئے" وہ پیالی پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اس نازک بحث سے بچنے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ اماں اور بڑی چچی چائے پینے کے لیے آ رہی تھیں۔

شام کو اسی ہر طرف رچی ہوئی تھی۔ سورج پیل کے گھنے درختوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چھت پر ٹہلنے لگی۔ قریب کے گھروں سے دھواں اٹھا اٹھ کر فضا کو بھیل بنا رہا تھا، مصاحوں اور بگھار کی خوشبو ہوا میں بسی ہوئی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک کر وہ کمرے کی چوکھٹ پر بیٹھ گئی۔ سورج ڈوبتے ہی ہوا سرد ہو گئی تھی۔ اسے اپنے ہاتھوں میں ٹھنڈک دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ جمیل بھیانے آئے، ہی اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس کا سکون درہم درہم ہو رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ جمیل بھیانے جب دنیا میں کسی رشتے بناتے تو نہیں مانتے تو محبت پر کس طرح ایمان لے آئے۔ یہ حضرت امان بھی خوب چیز ہوتے ہیں۔ نہیں مانتے تو خدا کو بھی حرف غلط سمجھنے لگتے ہیں

اور جب مانتے پر آتے ہیں تو پیروں کی چوکھٹ پر اُس کا جلوہ دیکھنے لگتے ہیں۔ جمیل بھیا
تم نے مجھے کس مصیبت میں مبتلا کر دیا، وہ سوچتے سوچتے بڑبڑانے لگی۔

زنیوں پر کھڑی ہوئی اور تخبہ بھو بھو بھی آ کر آرام کر سی پر دراز ہو گئیں۔ سارا دن اپنی
دوست کو بھگت کر آئی تھیں اس لیے خاصی تھکی تھکی نظر آرہی تھیں۔ عالیہ اُن کے کمرے
کی چوکھٹ سے اُٹنے ہی والی تھی کہ تخبہ بھو بھو نے کھڑکار کر اُسے آواز دی۔ ادھر اُو عالیہ
اس نے چونک کر تخبہ بھو بھو کی طرف دیکھا، مارے حیرت کے اس سے اٹھانے جا رہا
تھا۔ تخبہ بھو بھو پہلی بار اُسے اپنے پاس بلا رہی تھیں۔

”کہئے“ وہ مسہری پر ان کے پاس ٹمک گئی۔

”اس گھر میں کوئی اس لائق نہیں جس سے بات کی جائے۔ گھر میں کم سہی پھر بھی تم
نے کھوڑا بہت پڑھا تو ہو۔ شاید تم مجھے مشورہ دے سکو۔“ تخبہ بھو بھو نے غور سے
اس کی طرف دیکھا۔

”مشورہ دینے کی صلاحیت تو نہیں پھر بھی شاید کچھ سوچ سکوں“ اس نے
اپنے غصتہ کو قابو میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”شادی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہو؟ میرے ساتھ کی ساری لکچر اشادیاں
کر رہی ہیں۔“

”آپ بھی کر لیجئے، میرا خیال ہے کہ شادی اچھی چیز ہے، خصوصیت سے آپ کے
لیے“ اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”یعنی صرف میرے لیے؟ کتنی فضول بات کر رہی ہو، کیا تم شادی نہیں کرو گی؟“
وہ ذرا سا بھیر گئیں۔ ”نیر تمہاری شادی تو گھر ہی میں جمیل میاں کے ساتھ ہو سکتی
ہے، تم کو اس سے زیادہ کیا مل سکتا ہے، مگر میرے لیے میرے برابر کا آدمی ملنا مشکل ہے“

عالیہ کا جی چاہا کہ سنجہ بھوپتی کے منہ پر تھوک دے مگر وہ ضبط سے کام لے گئی۔ تھوکنے کے بعد تو بات ختم ہو جاتی تھی۔ اور اس کا جی چاہا کہ بات ختم نہ ہو، وہ خوب کھری کھری سنا لے۔ "دیکھئے سنجہ بھوپتی جہاں تک جمیل بھیا کی قابلیت کا سوال ہے تو اس گھر میں کوئی ان کی برابری نہیں کر سکتا، ویسے میں ان کو بہ حیثیت انسان پسند نہیں کرتی۔ وہ میرے چچا زاد بھائی ہیں اور بس۔ اس لیے آپ دوسرے رشتے مت سوچئے، اپنی بات کیجئے۔ میرا خیال ہے کہ اس اتنے بڑے ملک میں کسی نہ کسی شخص نے انگریزی میں ایم اے ضرور کیا ہوگا۔ اور وہ آپ کا شوہر بن سکے گا۔ اس کام کے لیے آپ ڈھنڈورا بٹوادیجئے۔"

"یہ سب کیا بکواس کر رہی ہو، اس گھر میں سب جاہل ہیں، میں کس سے بات کروں

خدا یا۔"

"آپ اتنی عظیم ڈگری رکھنے کے بعد بھی کسی سے مشورہ کی ضرورت سمجھتی ہیں؟"

عالیہ اٹھ کر چھت پر آگئی۔ سنجہ بھوپتی کیا کہتی رہ گئیں، اُس نے کچھ بھی نہ سنا۔

"سب لوگ کھانا کھا لو۔" نیچے صحن میں کھڑی ہوئی کرکین بوا پکار رہی تھیں۔

(۲۲)

اس گھر میں وقت کٹھن ہی۔ زندگی پل صراط پر گزرنے کا نام ہی۔ کتنا اچھا ہوتا کہ وہ یہاں سے بھاگ سکتی۔ جمیل بھیا سے پیچھا چھڑا سکتی مگر یہ سب کچھ کتنا ناممکن تھا۔ اگر وہ چلی جائے تو بڑے چچا کیا کہیں گے، یہی ناکہ جو اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی۔ تو نہ نکھیں پھیر لیں۔ اب تو گھر کی حالت بھی پہلی جیسی ہو گئی تھی۔ جمیل بھیا ملازمت سے سبکدوش ہو کر جو بیٹھے تو آج تک بیکار تھے۔ بڑی چچی نے جو تھوڑی بہت رقم جمع کی تھی۔ وہ اس بے کاری کے زمانے میں ختم ہو چکی تھی۔ عالیہ نے کتنا چاہا کہ بڑی چچی کو

کو اماں سے چھپا کر کچھ دے دیا کرے۔ لیکن انہوں نے بڑے پیار سے انکار کر دیا شاید وہ اماں سے ڈرتی تھیں۔ جب سے وہ ملازم ہوئی تھی اماں کے طعنے کتنے خونخاک ہو گئے تھے۔ انہیں اس گھر سے کتنی سخت نفرت ہو گئی تھی۔

ایک ایک دن بیمار کی رات کی طرح گزر رہا تھا۔ دسمبر کی سخت سردی اپور عروج پر تھی۔ صبح نو دس بجے تک گھر کی وجہ سے اندھیرا چھایا تھا۔ برآمدے کے پردے آندھیوں، بارشوں اور دھوپ میں پہلے ہی اپنی ساری حقیقت کھوپچے اب کی سردی میں تو ہوا ان پردوں سے یوں گزر جاتی جیسے میدان میں فرار۔ بھر رہی ہو۔ کریمین بوا کی کمزور ہنڈیاں سردیوں میں کڑکڑاتی رہتی اور وہ چوٹ کی کوکھ میں گھس کر بیٹے ہوئے زمانے کی یاد میں ملکنے لگتیں۔ — ”ہائے وہ بھی کیا زمانہ تھا جب دالانوں کے پردے بہر دوسرے سال بدل دیے جاتے، پر اب وہ زمانہ کہاں آئے گا۔“

غالیہ نے کریمین بوا کو اپنا ایک پرانا سوٹر دے دیا تھا۔ جسے اتنی سردی میں پہننے کے بجائے انہوں نے سنیت کر رکھا تھا۔ ”اگر یہ سوٹر دے دیا تھا تو انکلی سردی میں کیا پہنوں گی؟“ کریمین بوا نے اپنے حساب بڑی سمجھ داری کا ثبوت دیا تھا۔

بڑے چچا کئی دن سے ہلی گئے ہوئے تھے اور سترار میاں کو دو تین دن سے بخار آ رہا تھا پتہ نہیں بٹھیک میں وہ کس عالم میں پڑے رہتے ہوں گے ان کا علاج مناسب کون کرتا۔ جمیل بھیا کو سب سے فرصت نہ ملتی۔ گھر آنے تو نظام عشق میں آگ لگی ہوتی۔ اب وہ اس آگ کو بجھانے یا سترار میاں کے پھنکتے ہوئے جسم پر دو اولوں کے چھیننے مارنے ہی بچو جاتے۔

غالیہ نے بڑے برا حال تھا۔ وہ بہر وقت سوچتی رہتی کہ پتہ نہیں ان کی طبیعت

کیسی ہوگی جو نہ چائے مانگنے کی حد آتی ہو اور نہ کھانا لینے کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں
 کہ زمین بوا آپ سے بڑ بڑا بھتیس اور بچک میں جا کر کھانا پانی ڈال آتیں۔ وہ
 خیریت پوچھتیں تو سخت ناگواری سے بتاتیں کہ سب ٹھیک ہو۔ بخار ہو گیا ہے کوئی بڑی
 بیماری تو نہیں۔“

خدا نہ کرے ان کو بڑی بیماری ہو۔ عالیہ اپنا کٹیو موس کر رہ جاتی۔ کیسا جی بچا ہما کہ
 اسرار میاں کے سر ہانے جا بیٹھے، ان کا سر دبا ہے انھیں اپنے ہاتھوں و داپلائے
 مگر اماں کی کڑی نظروں کے سامنے وہ ان کی اتنی پرانی مودایتوں کو کیسے توڑ دیتی۔
 اس خاندان میں کوئی بھی تو ان حرامی اولادوں کے سامنے نہ آتا تھا۔ سچہ بھو بھی
 بے پردہ تھیں۔ اس کے باوجود کبھی اسرار میاں کا سامنا نہ کیا۔ کالج سے تا لگا آتا
 تو وہ خود ہی ہٹ جاتے، راہ چلتے دیکھتے تو نہ پھیر لیتے۔ ایک بار عالیہ مہیاک میں گئی
 تو اسرار میاں بیٹھے تھے وہ ان کی صورت بھی نہ دیکھ سکی تھی کہ اٹھ بھاگے۔ پردہ
 ہو بیٹا۔ اور وہ ہتکا بجا کھڑی رہ گئی، اب ایسی حالت میں وہ اسرار میاں کی تیمارداری
 کرتی بھی تو کیسے۔ کیا پتہ وہ اس حالت میں بھی۔ پردہ ہو بیٹا، کہتے باہر بھاگ جائیں۔
 اور پھر اس کی اس حرکت سے اماں کے دل پر کیا گزرسے گی۔ وہ کیا کہیں گی اب تو اماں نے
 صرف اس کی خاطر اس مکان اور تہل بھیا دونوں سے ہاتھ اٹھالیا تھا۔ انھوں نے بڑی
 بے بسی کے ساتھ اس کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ سب کچھ کھو کر صرف اس کو اپنا سہارا بنا لیا
 تھا۔ پھر کیا نائدہ تھا کہ ان کا جی دکھایا جائے۔ ان کی اتنی پرانی روایات کو ٹھوکر میں ماری
 جائیں۔ آخر کہیں تو اسے بھی جھلنا ہوگا۔

رات جب تہل بھیا کھانا کھانے گھر آئے تو گھرے ہوئے بادل اتنے زور سے

گرج رہے تھے کہ جی دہلا جاتا۔

”شاید اگلے ٹرپ میں گے کرکمن بوا بار بار کہہ رہی تھیں۔
 کس نے سر منڈوا یا ہے کرکمن بوا جو اگلے ضرور ٹرپ میں گے“ جمیل کھیا نے ہنس
 کر پوچھا۔

آج بہت دنوں بعد منسنے بولنے کے موڈ میں نظر آ رہی تھے ورنہ ادبھرتو
 کچھ دنوں سے اس قدر خاموش رہنے لگے تھے جیسے منہ میں زبان نہ رہی ہو۔
 ”ارے میاں سر کے منڈانا ہو، میرا ہی چونڈا منڈا رہا ہے، ذرا اسرار میاں
 کی خبر لو، بخار آ رہا ہے۔ کھانا پانی سب بیٹھا ہیں پنچا ناٹ پڑتا ہے“ کرکمن بوا
 سخت بیزار نظر آنے لگیں۔

”کیا ہو گیا اسرار میاں کو؟ جمیل کھیا چونک پڑے۔

”کہا جوتھا کہ بخار آ رہا ہے، بڑے میاں دلی گئے ہیں ورنہ آپ ہی دوا
 دارد کر لیتے۔ ہمیں کیا پڑی تھی۔ جو بیچ میں دخل دیتے اب اگر اسرار میاں کو
 کچھ ہو گیا تو وہ آکر ناراض ہوں گے۔“

”میں انھیں دیکھ لوں گا کرکمن بوا، ویسے کتنی سخت نفرت ہے مجھے اس
 آدمی سے!“

”اس لیے کہ وہ بے چارے ہم میں سے ایک نہیں ہیں؟“ عالیہ نے تڑپ کر

سوال کیا۔

”یہ بات نہیں عالیہ بی بی، مجھے ان سے صرف اس لیے نفرت ہے کہ وہ
 آبا کے ساتھ رہ کر انھیں جلیے بن گئے ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آبا کے ساتھ
 بیٹھ کر مجھ پر نکتہ چینی بھی کرتے ہیں۔ بس اب تو اتنی کسر رہ گئی کہ یہ دونوں حضرات
 اپنے ماتھے پر تلک لگالیں۔ وہ سخت نفرت انگیز نہیں ہیں۔“ ویسے تم طہنیان

رکھو عالیہ بی بی کہ مجھے ان کے ناجائز ہونے کا ذرا بھی خیال نہیں،
 "خیر ذہ تمہارے اپنے چچا کے برابر ہی مگر اب اس بے کار بحث سے کیا
 فائدہ" اماں نے سبزار ہو کر کہا۔

"خدا نہ کرے، نصیب دشمنان، بھلا ہزار میاں چچا کے برابر ہو سکتے ہیں۔
 کریمین بوا اماں کے طنز کو نہ سمجھتے ہوئے ایک دم سمجھ گئی۔ زمانے زمانے کی بات ہے
 کہ آج محلوں کی رانیاں اُسے چچا بنا ڈالیں، کریمین بوا زندگی میں پہلی بار
 گستاخی کر رہی تھیں۔

اماں، بڑی چچی، اور جمیل بھیا ان کی سمجھ پر ہنسنے لگے تو کریمین بوا بوکھلایا کر روٹی
 بیٹنے لگیں۔ جمیل بھیا اٹھ کر بیٹھاک میں چلے گئے۔

بادل بڑے زور سے گرجے اور اس طرح بجتی ٹپنی کہ سب نے سہم کر کانوں میں
 انگلیاں دے لیں۔ "جل تو جمال تو، آئی بلا کو مال تو" کریمین بوا زور زور سے
 پڑھنے لگیں۔

"کہیں بجلی گری ہو" بڑی چچی نے سہمی ہوئی آواز سے کہا۔
 تیز ہوا سے پردے اڑے جا رہے تھے۔ جمیل بھیا بیٹھاک سے نکل کر ابھی
 بیچ آنگن میں تھے کہ ایک بار کپڑے زور سے بجتی ٹپنی اور عالیہ جیسے چیخ پڑی۔ چلابی
 سے اندر بھاگ آئے جمیل بھیا۔

جمیل بھیا ہنستے ہوئے اندر آگئے۔ اولے پڑ رہی ہیں۔ مگر تم کیوں ڈر گئیں
 عالیہ بی بی۔

ڈر ہی تو نہیں تھی۔ میں تو آپ کو بتا رہی تھی کہ بجلی کڑک رہی ہے۔ عالیہ
 نے بے وقوفوں کی طرح بات بنائی۔ وہ شرمندہ ہو رہی تھی کہ بھلا چچی ہی کیوں

تھی۔ کون سی بکلی گر رہی تھی جمیل بھتیا پر۔

”یہ حضرت انسان کو سمجھنا بھی کتنا مشکل کام ہے۔ جب یہ روشن ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو تاریک ثابت کر دیتے ہیں اور جب تاریک، تو روشن نظر آنے کی سعی فرماتے ہیں۔“ جمیل بھتیانے عائیہ کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا کہ اس وقت وہ کتنے خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔

ٹھیک ہی جمیل بھتیا۔ جس طرح انسان کو سمجھنا مشکل ہے اسی طرح یہ بھی سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ بعض وقت انسان کا فعل اس کے خیال سے جدا کیوں ہوتا ہے چونکہ ہی بے مقصد جانے کیا کچھ گزرتا ہے اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا اُسے یہ تھا کہ اس کی چیخ کے ساتھ جمیل بھتیاس کے دل کے کھاگے ہوئے چور کو پکڑ کر سامنے لانا چاہتے ہیں۔

”یہ بھی ٹھیک ہی عالیہ بی بی،“ وہ ایک دم سچے سے گئے اور پھر ذرا اوپر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

بڑے چچا اس وقت کہاں ہوں گے اور کیا کر رہے ہوں گے۔ وہ بیان بھسکانے کے لیے عالیہ نے سوچنا شروع کر دیا۔

کھانا ختم ہوا تو سب لوگ مسوی کے ڈور سے اپنے اپنے بستروں کی طرف لپکے مگر عالیہ اپنی جگہ سے نہ اٹھی اسے اوپر اپنے کمرے میں جانا تھا اور بارش کھینے کے باوجود اب تک بکلی چمک رہی تھی اس حالت میں وہ آنگن کیسے پار کرتی۔ گرج چمک اُسے ہمیشہ سے ڈراتی رہی تھی۔

پردہ سرکا کر اس نے باہر دیکھا اندھیرے اور سیاہ بادلوں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا، وہ ہنستے کر کے آنگن میں آگئی۔

”جاپو میں تم کو ادھر تک چھوڑاؤں۔ تمہیں بھیا اس کے پیچھے نکل آئے۔ تم
بجلی سے ڈرتی ہو؟“ زینے طے کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

”وہ خانوشی سے زینے طے کرتی رہی۔ شاعروں سے بجلی کی بات چھڑنا سخت

خطرناک بات ہوتی ہے۔ تجربہ کھوبی لحاف میں منہ چھپائے سو رہی تھیں وہ دہے
قدوں اپنے کمرے میں آگئی۔ تمہیں بھیا دروازے کے بیچ میں کھڑے رہے۔

”اچھا شب بخیر، آپ بھی جا کر سو رہے وہ دھیرے سے بولی۔

”میں تھوڑی دیر تمہارے پاس بیٹھ جاؤں؟ کیا پتہ پھر بجلی کتنے لگے
اکیلے میں تم ضرور ڈر جاؤ گی؟“ وہ آگے بڑھا آئے۔

”میں قطعی نہیں ڈرتی، آپ جا کر سو رہیے۔“ اس نے بے رخی سے کہا اور

اپنے لحاف میں دبک گئی۔

جسٹ بھیانے کوئی جواب نہ دیا۔ وہی طرح کھڑے جانے کیا سوچتے رہے اور وہ

لحاف کے اندر کا نتیجہ رہی۔ جانے اب کیا کہیں گے۔

پندرہ بیس منٹ بیس صدیوں کی طرح گزر گئے پھر وہ ایک دم چلے گئے انہوں

نے کچھ نہ کہا۔

صدیوں کو گزار کر جب اس نے اطمینان کی سانس لی تو پھر خیال آیا کہ اگر تمہیں بھیا

تھوڑی دیر ہیاں اور بیٹھ لیتے، کچھ باتیں کر لیتے تو کیا مضائقہ تھا، اس سر پھرے خیال سے

سے بچنے کے لیے عالمیہ کو ہسٹارمیاں یاد آ گئے۔ جانے اب ان کی کیا حالت ہو گی۔ کیا بیماری

میں انہیں کسی کی ضرورت نہ محسوس ہوتی ہو گی۔ سجا رہے سر کھپٹ رہا ہو گا۔ اور ان

کا کیا سچی چاہتا ہو گا کہ کوئی ان کے پاس بیٹھے۔ کوئی انہیں پوچھے، اس وقت تو کوئی

محبت سے دیکھے۔ پر ان کا کوئی نہیں وہ تو تنہا آسمان سے ٹپک پڑے۔ آج

اس بیماری اور تنہائی میں وہ جانے اپنے لیے کیا سوچ رہی ہوں گے۔ اسرار میاں کے لیے
آپیں بھرتے بھرتے وہ گہری نیند سو گئی۔

صبح آسمان بالکل صاف تھا۔ سورج بڑا چمکیلا ہو رہا تھا اور جب وہ اسکول جانے
کی تیاری کر رہی تھی تو تین دن بعد اُسے اسرار میاں کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی گئی کہ کریمن بوا
اگر سب لوگ چائے پی چکے ہوں تو مجھے بھی دے دو۔ کمزوری لگ رہی ہے۔

(۲۳)

صبح ہوتی ہی۔ شام ہوتی ہی اور بہار نے دنوں کو پھلانا لگا کر پھول کھلا دیئے
ہیں۔ ایک ڈیڑھ مہینے پہلے کریمن بوانے کیاری کا کورا صاف کر کے اسے گھٹنے تک گورا
تھا اور پھر بیج بو کر طینیاں کی سانس لی تھی۔ اب کھلے ہوئے وہ پھول دیکھ کر وہ
خوش ہو رہی تھی۔ مگر بڑی چچی سے تو یہ بھی نہ ہوتا تھا وہ پھول توڑ کر اس گرد سے بھر سے
گھلان کر صاف کر کے سجا دیتے۔ ان کے دل میں بہار کا گزرنہ تھا۔ پھولوں میں کوئی دلکشی
نہ تھی۔ شکیل ان کے دل میں سد اخزاں کا بیج بو گیا تھا۔ جمیل بھی اس بیج کو بیچ رہے
تھے۔ ابر بڑے چچا۔ بڑے چچا کے لیے اُسے کوئی بڑی بات نہ سوچنا چاہیے وہ اپنے
آپ کو ملا مت کرتی۔

گھر کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ جمیل بھیانک ملازمت کی کوشش ہی نہ کی سارا
دن مُسلم لیگ کے دفتر میں کام کرتے اور تھوڑا سا معاوضہ مل جاتا۔ بڑی چچی کو یہ معاوضہ دے
کر وہ سارے مہینے کے لیے بے خبر ہو جاتے اور سارا مہینہ بڑی چچی سے انتقام لے لے کر گزار جاتا
ان دنوں بڑے چچا کے پیروں میں سٹیپر ہو گیا تھا۔ آج میاں، کل وہاں۔ انگلستان کی
لیبر ڈارٹمنٹ نے ہندوستان کو آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور آماں نے یہ خبر اس طرح سُنی تھی

جیسے چند دنوں کے اندر ہی گئی ہو۔

ادھر آزادی کے فیصلے کے ساتھ باپ بیٹے ایک دوسرے کی صورتیں بن جائیں گے تھے
پاکستان بنے گا۔ پاکستان نہیں بنے گا۔ اور اس کشمکش کے عالم میں اسے چھٹی بڑی طرح یاد
آنے لگتی۔ اگر آج کو وہ بھی اس گھر میں مٹھی رہتی تو کیا ہوتا۔ آزادی ملنے سے پہلے ہی
سب اپنا اپنا سر کھپوڑ کر خد کو پیارے ہو چکے تھے۔

آج پندرہ بیس دن بڑے چچا گھر میں داخل ہوئے تھے اور برآمدے میں کچھ
ہوئے پانگ پر سکون سے لیٹے اپنا سر سہلا رہے تھے اتنے دن بعد انہیں گھر میں لیٹے
دیکھ کر عالیہ چائے کی پیالی لے کر ان کے پاس جا بیٹھی۔ بڑے چچا اٹھ کر چائے پینے لگے۔
"انگریز کہتے ہیں کہ اب ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔" بڑی چچی بھی ہنستی
ہوئی آگئیں۔

"ہاں انہیں آزاد کرنا ہی ہو گا۔ بس تھوڑے دن اور گڑ بڑ کریں گے بے ایمان
قوم ہی۔ بڑے چچا پوش میں آگئے۔

"پھر جب آزادی مل جائے گی تو تم اپنی دوکانوں پر بیٹھو گے؟ بڑی چچی نے پوچھا،
ان کی آنکھوں سے احتیاق ٹپک رہا تھا۔

"بیٹھوں گا کیوں نہیں، تم دیکھنا کہ اس کے بعد وہ کانیں کیسی چلتی ہیں، اپنی حکومت
سے تو دوکانوں کو چلانے کے لیے امداد بھی مل جائے گی۔"

"اچھا اپنی حکومت امداد بھی کر دے گی؟ ہائے کتنا اچھا ہو گا۔" بڑی چچی کی آنکھیں
چمک رہی تھیں۔

"بڑے چچا آج آپ گھر میں لیٹے کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔ جب آپ ہوتے
ہیں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہی کہ جیسے۔" عالیہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی

اور میں تمہارا باپ نہیں تو پھر کیا ہوں بھئی۔" بڑے چچا نے اس کا سر اپنے
 سینے سے لگا لیا۔ اور جب آزادی مل جائے گی۔ تو میں اپنی بیٹی کو دلہن بناؤں گا
 اور بہت شاندار پڑھا لکھا دو لہا لڑاؤں گا۔ اس ناچے، انھوں نے بڑی چچی کی نظر
 دیکھا وہ دونوں منہ لگے مگر عالیہ بڑے چچا کے سینے میں محبت کی گرمی محسوس کر کے دھیرے
 دھیرے رو رہی تھی وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ اللہ اس ملک کو جلد ہی سے آزاد
 کر دے، بڑے چچا اپنے گھر واپس آجائیں اور پھر شام کو اسی گھر میں لیٹ کر بڑی
 چچی سے باتیں کریں۔ چھٹی کی خیریت پوچھیں، صاحبہ آپا کو میٹھے آنے کے لیے
 خط لکھیں جیل بھیا کے لیے دو لہن تلاش کریں اور سکیں کو ڈھونڈ کر گھر لے آئیں
 "اری بھئی رو رہی ہو" بڑے چچا نے اپنے کھدر کے کرتے کے پار آنسوؤں کی
 نئی محسوس کر لی تھی۔ "مت رو میری بیٹی۔"

"کریم بوا بڑے بھیا سے کہو کہ حکیم صاحب اور ہر دیال باپو آئے ہیں۔ ہسٹار
 میان کا آواز آئی تو بڑے چچا ایک دم اٹھ پڑے۔ وہ اسے چپ کرانا بھی بھول گئے۔
 عالیہ نے اپنے ہی آپا آنسو پونچھ ڈالے کیسا جی اٹھ رہا تھا۔ ابھی تو وہ رونا چاہتی تھی۔
 رات جب سب لوگ کھانا کھا رہے تھے تو جیل بھیا بڑے جوش و خروش سے
 بولنے لگے جارہے تھے۔ مطالبہ پاکستان ایک ایسی حقیقت ہے جیسے ہم آپ بیٹھے ہیں کانگریسی
 لاکھ لاکھ لاکھ لاکھ نہیں کر سکتے دستوں کو در مسلمانوں کے اس مطالبہ کو کون روک
 سکتا ہے۔"

"تو کیا سارے مسلمان پاکستان جا کر رہیں گے۔ بڑی چچی نے پوچھا۔
 "واہ کس کی کیا ضرورت پڑے گی۔ جو جہاں ہو وہاں رہے گا۔
 "مگر ہندو ہیں رہنے کیوں دیں گے۔ وہ نہیں کہیں گے کہ اپنے ملک جاؤ۔"

ان کے ہندو جو پاکستان میں ہوں گے اہم ان سے کب کہیں گے کہ جاؤ۔
 جمیل بھیا کی دلیں بڑی چچی کئی سمجھ میں آگئی تو انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔
 ہاں جمیل یہ جانے والے کی بات بڑی سہمی میں بھی یہ گھر نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر زمین بوا
 بھی آخر بول ہی پڑیں۔

اور میں کب چھوڑ رہا ہوں اپنا گھر میں تو بس اسرار میاں کو بھی یاد دل گیا پاکستان۔
 جمیل بھیا فرسے میں آکر بیٹھے اور کریمین بوائے کھیا کر برتن اٹھانے شروع کر دیے۔
 پھر تم اپنی ایک دوکان تو سنبھال ہی لینا، تمہارے آبا اب تھک چلے ہیں
 اور پھر تم ان کا ادب بھی کر دے گا۔ ۶

میں سب کچھ کہوں گا اماں، جو کچھ آپ کہیں گی وہی ہوگا، بس پاکستان بن
 جانے دیجئے۔ جمیل بھیا باتیں کرتے ہوئے بار بار عالیہ کی طرف دیکھے جا رہے تھے اور
 وہ بے تعلق سی بیٹھی کھانا کھائے جا رہی تھی۔ جانے آج کل اتنی بھوک کیوں لگتی ہے۔
 ”حد ہے، ہر وقت یہی باتیں، کھانا پینا حرام ہو گیا ہے۔“ اماں باتیں سن سن
 کر ایک دم جھٹک اٹھیں۔ ”بس اب تو عقل مند تمہارے ملک کے لوگ رہ
 گئے ہیں۔ انگریز تو بے چارے نرے بے وقوف ہیں کہ آزادی بانٹی اور چپکے سے
 اپنے ملک لوٹ گئے۔ ارے ابھی تو برسوں جھبک مارو۔ جب بھی آزادی نہیں
 ملتی۔“

”انہیں کون کا فر بے وقوف سمجھتا ہے مگر اب وقت انہیں بے وقوف بننے پر مجبور
 کر رہا ہے۔ اگر نہ گئے تو نکال دیے جائیں گے۔ جمیل بھیا جوش میں آگئے۔
 ”خدا کی شان ہے کیا بڑے بڑے کر باتیں مار رہے ہو۔“ اماں بگڑ کر اٹھ گئیں
 کریمین بوا میرا کھانا کمرے میں پہنچا دو۔“ اماں جانے لگیں تو جمیل بھیا نے کپڑا لیا

چلے چھوڑے چھوٹی چچی، اب اگر آزادی کا نام بھی لوں تو جو چور کی سزا وہ میری
 بات مذاق میں مل گئی مگر اماں کا موڈ ٹھیک نہ ہوا کھانا کھاتے ہی اپنے
 کمرے میں چلی گئیں۔

سردی کا زور گھٹتے ہی سب برآمدے میں سونے لگے تھے۔ پچھے ہوئے
 پردے لپیٹ کر کب کے باندھ دیے گئے تھے۔ اس وقت چاندنی برآمدے میں
 داخل ہو کر بستروں پر لوٹ رہی تھی۔

جمیل بھیا اتنی بہت سی باتیں کرنے کے بعد اب صحن میں ٹہل رہی تھی اور
 عالیہ بڑی چچی کے پاس بیٹھی بھیا لہیہ کاٹ رہی تھی "اماں سب سے روٹھ کر اپنے
 کمرے میں نہ جانے کیا کر رہی تھیں۔"

"بڑے بھیا کہاں ہیں؟" نجمہ بھوپھی اوپر سے آکر بڑی چچی کے پاس ٹاک گئیں۔
 وہ کچھ فکر منہ سے نظر آ رہی تھیں۔

بیٹھک میں ہوں گے، بنو الو۔ بڑی چچی نے جواب دیا۔

"دیکھو کرین بوا اگر کوئی نہ ہو تو بالالاد نجمہ بھوپھی نے اکتا کر کہا۔

بڑے چچا کے آتے ہی جمیل بھیا اپنے کمرے میں چلے گئے، عالیہ کی سمجھ میں نہ آ رہا

تھا کہ آج نجمہ بھوپھی کیا بات کرنا چاہتی ہیں۔ جو اس قدر نکرند ہو رہی ہیں۔

"بڑے بھیا، وہ بات یہ ہو کہ میں نے اپنے لیے زندگی کا ساقھی تلاش کر لیا ہے

بس آپ کو اطلاع دینا تھی۔ انھوں نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

سب حیران ہو کر ان کا منہ تنکنے لگے۔ بڑے چچا آنکھیں جھکائے خاموش بیٹھے

تھے۔ کیا انگلش میں ایم اے کر کے انسان اپنی تہذیب پر لات مار دیتا ہے۔ نجمہ بھوپھی

یہی کچھ بڑی چچی کے ذریعے بھی کہلا سکتی تھیں۔ عالیہ نے نفرت سے بڑی چچی کی طرف دیکھا

تو پھر ضرور کر دشاڑی، ہم سے کہو، فوراً انتظام کر دینگے۔ بڑی چچی
کھسیا کر نٹنٹے لگیں۔

کیا انتظام کریں گی آپ! کیا میں تھمپی ہوں جس کی شادی پیرا تینیں
بڈائی جائے گی، ڈھول پٹی جائے گی اور میرا جینر سٹے گا۔ میں خود جینر ہوں
سجہ بھوپھی سخت مغرور ہو رہی تھیں۔

”تم جب کہو گی میں شریک ہو جاؤں گا۔“ بڑے چچا اٹھ کر باہر چلے گئے
”بس گریوں کی تھمپی میں نکاح ہو جائے گا۔ پھر ہم لوگ شلے چلے جائیں
گے۔“ سجہ بھوپھی نے بڑی چچی کو اطلاع دی اور خود بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”وہ ہیں کون صاحب؟“ بڑی چچی سے بغیر پوچھے نہ رہا گیا۔
”ہمارا نکاح کے لکچرار کے بھائی ہیں۔ انھوں نے بھی انگلش میں ایم اے
کیا ہے۔ بہت زبردست تاجر ہیں۔ وہ کھٹ پٹ کرتی زینہ پر ہوئیں۔“

ذرا دیر تک سب چپ رہی کوئی کسی سے نہ بولا مگر جیسے ہی تمہیں بھیا پھر
سے آکر ٹہلنے لگے تو بڑی چچی نے دھیرے سے اطلاع کر دی۔ ”تمہاری سب
چھو پھی شادی کر رہی ہیں۔“

”اتھا تو اس وقت وہ یہی کچھ بتانے آئی تھیں۔؟“

”ہوں! بڑی چچی مسرہکھا کر پان بنانے لگیں۔“

”ڈھول نہ باجے، دھن نہ بنیں یہ بھی کوئی شادی ہوئی، زمانے

بیل گئے۔ سوا سوا مہینے تک لڑکی کو ما کھے بٹھاتے تھے باپ بھائیوں کا

سایہ تک نہ دیکھتی تھی لڑکی۔ قاضی سے کہنا کہ نکاح بھی انگریزی میں پڑھائے

جیل تھی زور سے ہنسنے۔ واقعی اس خاندان کی بد نصیبی تھی کہ لڑکیوں کو تعلیم

نہ دلائی گئی۔ اب ہماری نجمہ بھوپھی خاندان کی پہلی لڑکی تھی جنہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ظاہر ہے کہ انہیں مارتے غرور کے یہی کچھ بننا تھا اور دوسری تعلیم یافتہ خاتون، ہماری عالیہ بی بی ہیں، کچھ فتور تو ان میں بھی ہے۔ انہوں نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔

عالیہ سمجھ گئی کہ یہ کس فتور کی طرف اشارہ ہو رہا ہے، اس کی جان جل کر گئی جی ہاں عورت اگر کٹھ پتلی سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے گی تو ظاہر ہے کہ باغی فتور سمجھا جائے گا، مرد عورت کو بے وقوف دیکھ کر، ہی سچی خوشی محسوس کرتا ہے۔ نجمہ بھوپھی کا طریقہ غلط ہے۔ مگر انہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی شادی کریں؟

کون کر رہا ہے شادی؟ " اماں نے کمرے سے نکل کر پوچھا۔

"نجمہ بھوپھی" عالیہ نے جواب دیا۔

"کہاں انتظام کر دیا بڑے بھیانے؟"

"بڑے بھیانے نہیں۔ انہوں نے خود انتظام کیا ہے۔ بڑی چچی نے بتایا۔"

"سارے بھئی" ان کی بڑی بہن عداوہ نے بھی تو خرد اپنی مرضی سے شادی کی تھی

اور آج ان کا شاندار بیٹا صفدر دنیا کی چھپاتی پردہ نانا بھرتا ہے، اماں کا عقدہ پورے جوش پر تھا۔

سب چپ رہی، کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ عالیہ کو افسوس ہو رہا تھا کہ اماں

اتنی تلخ باتیں کیوں کرتی ہیں۔

اماں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جسیں بھیا اٹھ کر ٹہلنے اور گنگنانے لگے۔

بہلا نہ دل نہ تیرگی شام غم گئی

یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

ٹھیک ہو۔ اسی لیے میرے دماغ کے فتور کا روزنا روپا جا رہا تھا، وہ ان کا
 دل نہ بہلا سکی وہ ان کی مشاموں کو رنگین نہ بنا سکی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا فتور ہو گا۔
 میں ذرا باہر جا رہا ہوں اماں، ضروری کام سے، دیر سے آؤں گا، دروازہ
 بند کر لیجئے۔ جمیل بھیا نے کہا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ بہلا نہ دل
 نہ تیرگی شام غم گئی۔ دروازے سے نکلنے ہوئے بھی وہ دھیمے دھیمے گارہے تھے۔
 وہ دم دھام سے چھٹکی ہوئی چاندنی میں اسرار میاں کی اندھیری آواز ابھری
 کر تین براگر سب لوگ کھانا کھا چکے ہوں تو۔
 عاکیہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے زینوں پر بولی۔

(۲۲۲)

سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ نجمہ کھوپھی اپنے تاجر میاں کے ساتھ شملے
 جا چکی تھیں۔ ان کی شادی پر نہ تو ڈھول بجی، نہ میراٹنوں نے گانے گائے
 کر تین بوا کا مارے دکھ کے کلیجہ پھٹ گیا تھا۔ یہ زمانے کم سخت نے ان کو
 کیا کیا دکھایا۔ اماں کو ان کی شادی کے بعد سے سلمہ کھوپھی ہر وقت یاد
 آنے لگی تھیں اور معذرت بھائی کے لیے موت کی دعا میں دل سے نکلنے
 لگی تھیں اور ہر ملک میں ہر لونگ مچی تھی کینیٹ مشن بلکہ مچا کر وہیں ہو گیا
 تھا بڑے چچا کالس چلتا تو جمیل بھیا کی صورت نہ دیکھتے وہ انھیں اسٹین میں
 پلاہ اسانہ سمجھنے لگے تھے۔ اگر کسی وقت سامنا ہوتا تو ایک دوسرے پر
 چھپنے کہنے لگتے۔ سارے مسلم لگی انگریزوں کے پٹھوں میں، بڑے چچا بھیر کر
 کہتے۔

”اس میں کیا شک ہے، مگر یہ حضرت نبرد اور ماؤنٹ بسٹن کی زندگی کب سے چلی ہے اور یہ ان کی لیدی صاحبہ سے اتنا خلوص کیوں برتتے ہیں؟“ جمیل بھیا کب چوکتے۔

”مختاری جہالت ایسے ہی سوال کرے گی۔“

”اے جمیل بھیا کیا آپ باہر بحث کرنے نہیں تھکتے۔“ عالیہ بیچ میں کود پڑتی تو جمیل بھیا اپنے باپ کے مقابلے میں بے بس ہو کر رہ جاتے۔

”افوہ ایک ایک مسلمان جو فساد میں مارا جاتا ہو اس کا خون مسلم لیڈوں کی گردن پر ہے۔“ بڑے چچا ٹنڈی سانس بھرتے۔

جمیل بھیا عالیہ کی طرف دیکھ کر خاموش رہتے۔ جواب دینے کے لیے ان کا جی توگھٹتا ہو گا مگر کچھ نہ کہہ پاتے۔

”بڑی چچی کو شکیں کی پڑی تھی۔“ اللہ جانے کہاں ہو گا، ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔“ ان دونوں تو بڑی چچی کو شکیں کی یادداشت سے ستا رہی تھی۔

مشر شام زور سے آندھی آئی کر تین بوالالٹین جلا رہی تھیں۔ ساری کی ساری ایک ہی مھونکے سے بچھ گئیں۔ ”ناس جائے ان آندھیوں کا۔“ لالٹین کو سمیٹ کر وہ بڑ بڑاتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔

ہارموتیے چنبیلی کے ”گلی میں ہار بیچنے والا صدانگاتا بھاگا جا رہا تھا ذرا دیر میں آندھی رک گئی بارش کے دو چھنٹے پڑ کر زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو اڑا گئے تھے اور محلوں کی چھتوں سے گراموفون ریکارڈ بچنے کی آواز آرہی تھی۔“ باہل مورا نیر چھوٹو ہی جائے۔“

سب لوگ کھانا کھا لو، پتہ نہیں پھر بارش ہونے لگے، بادل گھرے
 کھڑے ہیں۔ "کرمین بوانے کہا اور پھر برتنوں سے آندھی کی دھول صاف
 کرنے لگی۔" "جائے یہ ناس ٹپری آندھیاں کیوں آنے لگی ہیں" انہوں نے
 جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔

پہلے زمانے میں تو اتنی آندھیاں آتی نہ ہونگی کرمین بوا، جمیل بھیانے
 ہنس کر پوچھا۔

یہ آندھیاں تو ہمیشہ سے آتی تھیں جمیل میاں؛ جانے کیا کچھ اڑالے
 گئیں۔ کرمین بوا ان کا مذاق نہ سمجھتے ہوئے سنجیدگی سے بولیں۔ "وہ ایک بار
 تو میرا جارحٹ کا نیا دوپٹہ اڑالے گئیں۔" دھوکہ لگنی پر پھیلا یا تھا، "کرمین بوا
 اپنے لئے جیسے ڈوٹے کو سر پر پھیک سے اور ٹھننے لگیں۔ ناس رہائے ان آندھیوں کا
 وہ پیٹیں اٹھا کر والان میں چلی گئیں۔"

"شاید رات بھی بارش ہو۔ جمیل بھیانے عالیہ کی طرف دیکھا۔

"اللہ کرے ہو، مگر می سے نجات ملے۔"

کھانے کے بعد اماں اور بڑی چچی نے پاندان کھول لیا۔ کرمین بوا، مسرار میاں
 کے لیے پلیٹوں سے بچا ہوا سالن ایک پیالے میں جمع کر رہی تھیں۔ جمیل بھیا اب پھر
 اپنی کرسی پر جا بیٹھے تھے۔

بڑے چچا کہاں ہیں، یہ ٹھنڈا کھانا ان کی صحت کو اور بھی تباہ کر دے گا۔ کم سے
 کم رات تو جلدی سے گھر آ جایا کریں۔ عالیہ اوپر جاتے ہیے سوئچ رہی تھی۔

رات روئی ہوئی آنکھوں کی طرح بھیگی ہوئی تھی۔ چھت پر اپنا بستر گانے کے
 بعد وہ دھیرے دھیرے ٹھلنے لگی۔ "وقت نہیں گزرتا اللہ! وہ بڑا بڑا ہی تھی۔"

گر اموفون ریکارڈ برابر بجے جا رہے تھے۔

مفت ہوئے بدنام سنو ریائی تیرے لئے

”اوپر تو بڑے مزے کی ہوا چل رہی ہے۔ جمیل بھیجا بھی آکر اس کے ساتھ ٹہلنے

لگے۔

وہ چپ رہی۔ رات، تنہائی، اٹڈے ہوئے بادل اور پھر جمیل بھیجا۔ وہ ایک
طرفان میں گھر کر رہ گئی اس کا جی بیٹھنے لگا۔ کیسی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ بس
یہی جی چاہتا کہ جمیل بھیجا کو اٹھا کر نیچے گلی میں پھینک دے۔

وہ منڈیر سے جھک کر نیچے گلی میں جھانکنے لگی جہاں گنڈیر یوں دالادو لووں والا
چراغ تھا۔ سجاے بسدا لگا تا چلا جا رہا تھا۔

”عالیہ۔ جمیل بھیجا نے بھاری آواز سے پکارا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ بھپھر کر بیٹھی۔

”بہت سی باتیں ہیں مگر تم تو میرے لئے بھری بن گئی ہو۔“

”اوند کیا رہ گیا ہے کہنے کو، آپ سب کچھ تو کہہ چکے ہیں اور میں سن چکی ہوں، آپ تنگ
کیوں نہیں کہہ کہہ کر۔“

جمیل بھیجا اس کے پاس کھڑے ہو گئے اور اندھیرے میں جھک کر اسے دیکھنے
لگے۔ وہ اتنے قریب تھے کہ اسے ان کی سانسیں اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں۔
اور اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جون کی ٹو سے اس کا چہرہ پھنکا جا رہا ہے۔

وہ بڑے کر اپنے بستر پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ رگڑنے لگا۔

”تم میرے سلسلے میں اتنی بے درد کیوں ہو؟ وہ بھی قریب آگے۔ کون سا
کوسوں کا فاصلہ تھا جو طے نہ ہو سکتا تھا۔ وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانک رہے

تھے۔ عالیہ نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں تو بالوں سے زیادہ اندھیرا چھایا ہوا تھا
مگر ان بالوں کے باوجود لوچل رہی تھی۔ عالیہ کا دل جیسے گھٹنے لگا۔
”بیٹھ جائیے“ وہ ایک طرف سرک گئی۔

”تمہارے بستر پر بیٹھ جاؤں؟ تمہارے بستر پر تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوگا جیسے۔“
عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ بہت سی بھڑکیں اس کے جسم سے لپٹ گئی ہیں۔ جمیل
صاحب آپ میرے معاملے میں صرف ضدیا گئے ہیں، آپ خواہ مخواہ یہ ثابت کرنا چاہتے
ہیں کہ اگر میں نہ ملی تو آپ مرجائیں گے تباہ ہو جائیں گے۔ اب مجھ سے زیادہ شاندار
لڑکی اس زمانے میں کہیں نہیں ملے گی، مگر میں جانتی ہوں کہ اگر آج میں آپ کی نظروں
سے دور ہو جائوں تو آپ کو کوئی اور مل جائے گا۔ کبھی آپ نے چھی کے لئے کبھی یہی کچھ
محسوس کیا ہوگا اور۔۔۔ اس کی آواز بھرائی اور وہ گھٹنوں میں سر چھپا کر رونے
لگی اس وقت وہ سوت کمزوری محسوس کر رہی تھی۔

”ارے، تو کیا تم مجھ سے اتنی بے زار ہو، متارو عالیہ“ جمیل جیہانے گجرا کہ
اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔۔۔ تم اطمینان رکھو اب میں کچھ نہ کہوں گا
میں زندگی بھر منہ بنا چاہتا ہوں رانا نہیں چاہتا۔۔۔ انہوں نے شانوں پر سے
ہاتھ ہٹائے۔۔۔ ”اب میں تم سے کوئی مطالبہ نہ کروں گا بھئی حق ہی کیا ہے۔ میں
وعدہ کرتا ہوں کہ اب تم میری وجہ سے پریشان نہ ہوگی، اب تم خوش ہونا؟“
وہ بھلا کہتی کیا، یونہی گھٹ گھٹ کر روتی رہی۔

”متارو عالیہ بی بی“ وہ مجرموں کی طرح دوڑ کھڑے رہے۔ تم میری زندگی
کی ساتھی نہیں بننا چاہتیں تو نہ سہی۔ یوں بھی زندگی گزار رہی جائے گی کتنے لوگ ہیں
جو خوشیوں سے پھر پور زندگی گزارتے ہیں، خیر، تم کو اب تم پر ہونا۔ میں اب

تم سے کچھ نہ کہوں گا۔ ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

چند منٹ تک وہ خاموش کھڑے رہے اور پھر تیزی سے نیچے چلے گئے۔
 مگر میں بوا، بڑے بھیا رات بارہ بجے تک آئیں گے، اگر سب لوگ کھانا کھا چکے
 ہوں تو مجھے بھی دیدو۔ اسرار میاں کی صدا سنائے گو چیر گئی۔

عالیہ آنسو پوچھ کر بے سدھ سی لیٹ گئی۔ بہت اندھیرا ہے، بادل کس
 بڑی طرح گھرے ہیں، کیا آج اتنی بارش ہوگی کہ طوفانِ نوح آجائے گا؟ آج وہ فرد
 ڈوب جائے گی۔ اس نے تو اپنی حفاظت کے لئے کوئی کشتی بھی نہیں بنائی! اس نے
 آنکھیں موند لیں۔

(۲۷۵)

پاکستان بن گیا۔ یگی راہ تما کر اچی دار حکومت جا چکے تھے۔ پنجاب میں
 خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ بڑے چچا اس صدمے سے جیسے نڈھال ہو گئے
 بیٹھک میں بیماروں کی طرح وہ ہر ایک سے پوچھتے رہتے۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا
 ہو گیا؟ یہ ہندو مسلمان ایک دم ایک دوسرے کے ایسے جانی دشمن کیسے ہو گئے؟
 راکھیں کس نے سکھایا ہے؟ ان کے دل سے کس نے محبت چھین لی؟"

جب وہ یہ سب کچھ عالیہ سے پوچھتے تو وہ ان کا سر سہلانے لگتی: "بڑے چچا۔
 آپ آرام کیجئے، آپ تھک گئے ہیں بڑے چچا اس طرح آنکھیں بند کر لیتے جیسے
 خون کی ندی ان کی آنکھوں کے سامنے بہ رہی ہو۔"

"زمانے زمانے کی بات ہے، وہ بھی زمانہ تھا جب ہندو اپنے گھاؤں کے
 مسلمانوں پر آنچ آتے دیکھتے تو سر دھڑکی بازی لگا دیتے اور مسلمان ہندو کی عزت

بچانے کے لئے اپنی جان نچھاور کر دیتا۔ ایسا بھائی چارہ تھا کہ لگتا ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔“ پر اب کیا رہ گیا۔ دونوں کے ہاتھوں میں خنجر اگیا ہے۔ کرمین بو افساد کی خبریں سن سن کر ٹھنڈی آ رہی ہیں بھرا کر تیں۔ اپنے شہر میں فساد تو ہوا تھا مگر سب کی جانوں پر بنی رہتی۔ پتہ نہیں کب کیا ہو جائے۔

”کہاں ہوگا میرا ٹھکانا؟“ بمبئی میں فساد کی خبر سن کر بڑی مچھی بلکنے لگیں۔ تمہارا پاکستان بن گیا جمیل، تمہارے ابا کا ملک بھی آزاد ہو گیا، پر میرے مشکیل کو اب کون لائے گا۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا اماں، وہ خیریت سے ہوگا۔ یہ فساد و ساد تو چار دن میں ختم ہو جائینگے جمیل بھیا ان کو سمجھاتے مگر ان کا چہرہ فقرا رہتا۔

شام سب لوگ خاموش بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ماموں کا خط آگیا۔ انہوں نے اماں کو لکھا تھا کہ۔۔۔ انہوں نے اپنی خدمات پاکستان کے لئے وقف کر دی ہیں اور وہ جلد ہی جا رہے ہیں۔“ اگر آپ لوگوں کو چلنا ہو تو فوراً چوڑا دیکھو اور تیار رہئے۔

”بس ابھی تار دیدو جمیل میاں، ہماری تیاری میں کیا گئے گا ہم تو بس تیار بیٹھے ہیں۔ ہے! اپنا بھائی ہے کھلا ہمیں اکیلا چھوڑ کر جا سکتا ہے؟ مارے خوشی کے اماں کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

جمیل بھیا نے اس طرح گہرا کر سب کی طرف دیکھا جیسے فساد ہی ان کے دروازے پر پہنچ گئے ہوں۔ مگر آپ کیوں جائیں چھوٹی مچھی؟ آپ یہاں محفوظ ہیں ہیں آپ کے لئے اپنی جان دیدوں گا انہوں نے آج بڑی مدت بعد عالیہ کی طرف دیکھا کیسی سفارشی نظر میں تھیں مگر عالیہ نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

”میں نہ جاؤں تو کیا ہندوؤں کے نگر میں رہوں، پاکستان میں اپنوں کی
تو حکومت ہوگی پھر میں اپنے بھائی کو چھوڑ کر ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتی
واہ“ مارے خوشی کے اماں سے سچلا نہ بیجا جا رہا تھا۔

”عالیہ جانے پر راضی نہیں ہوگی چھوٹی چچی، وہ نہیں جائے گی“ وہ جا ہی
نہیں سکتی۔“ جمیل بھیا نے جیسے نیم دیوانگی کے عالم میں کہا۔

”تم اچھے حق دار آگے، کون نہیں جائے گا، اماں ایک دم بپھر اٹھیں۔“ تم
ہوتے کون ہو روکنے والے؟“

”ضرور جائے چھوٹی چچی۔“ جمیل بھیا نے سر جھکا دیا اور عالیہ کو ایسا محسوس
ہوا کہ وہ نہیں جا سکتی۔ صدیاں گزر جائیں گی مگر وہ یہاں سے ہل بھی نہ سکے گی۔
”میں ابھی تار دیے دیتا ہوں کہ سب تیار ہیں۔“ جمیل اٹھ کر باہر چلے گئے۔

عالیہ کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر اعلان کرے کہ وہ نہیں جائے گی، وہ نہیں
جا سکتی، اسے کوئی نہیں لے جا سکتا، مگر اس کے گننے میں تو سینکڑوں کانٹے
پھج رہے تھے وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی، اس نے ہر طرف دیکھا اور پھر نظریں
جھکا لیں مگر وہ کیوں رکے، کس کے لئے، اس نے سوچا اور پھر جیسے بڑے سکون
سے چپالیہ کاٹنے لگی۔ عالیہ بیگم اگر تم رہ گئیں۔۔۔۔۔۔ تو ہمیشہ کے لئے والد
میں پھنس جاؤ گی۔

”کریم بوا اگر سب لوگ چائے پی چکے ہوں۔۔۔۔۔۔ اسرار میاں نے
بھیٹک سے آواز گھائی اور کریم بوا آج تو ڈائمنوں کی طرح چھینے لگیں۔۔۔۔۔۔
”ارے کوئی تو اسرار میاں کو بھی پاکستان بھج دو۔ سب چلے گئے۔ سب چلے جائیں
لیکن مگر یہ کہیں نہیں جاتا۔“

بیٹھک میں اسرار میاں کے کھانسنے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔
 کیا تم سچ مچ چلی جاؤ گی چھوٹی دلہن؟ بڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد
 بڑے چچا نے پوچھا۔

ظاہر ہے کہ چلی جاؤں گی۔ اماں نے رکھائی سے جواب دیا۔
 ”یہ گھر تمہارا ہے چھوٹی دلہن، مجھے اکیلے نہ چھوڑو بڑی چچا نے ڈبڈبائی
 ہوئی آنکھیں بند کر لیں شاید وہ تنہائی کے بھوت سے ڈر رہی تھیں۔

عالیہ جیسے پناہ ڈھونڈنے کے لئے اوپر جاگ گئی۔ دھوپ پہلی پڑ کر سامنے
 کے مکان کی اونچی دیوار پر چڑھ گئی تھی۔ ہائی اسکول کے احاطے میں بسیرا لینے والے
 پرند مسلسل شور مچا رہے تھے۔

کھلی فضا میں آکر اس نے اطمینان کی سانس لی اور مسافروں کی طرح
 ٹہل ٹہل کر سوچنے لگی کہ اب آگے کیا ہوگا، شاید اچھا ہی ہو، وہ یہاں سے
 جا کر ضرور خوش رہے گی۔

جب وہ نیچے اتری تو سب اپنے اپنے خیالوں میں مگن بیٹھے تھے۔ صرف کریم
 بوا جانے کس بات پر بڑبڑا رہے تھیں اور پھرتی سے ڈیٹیاں پکاتی جا رہی تھیں۔
 جمیل بھی کہاں گئے، اب تک کیوں نہیں آئے۔ عالیہ نے سوئی کریم کی طرف
 دیکھا۔ جانے یہ سر پھر آدمی لے آیا دکرے گا یا بھول جائے گا۔ اس نے اپنے آپ
 سے پوچھا۔

لالین کی بتی خراب تھی اس لئے اس میں سے دو لوہے اٹھ رہے تھیں اور
 ایک طرف سے چینی سیاہ ہو گئی تھی۔ مدغم روشنی میں اماں، بڑی چچا اور کریم
 بوا کے چہرے بگڑے بگڑے لگ رہے تھے۔

جیل بھیا گھر میں داخل ہوئے اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں تار کو آ یا پھونکی
چچی! انھوں نے دھیرے سے کہا۔

”تم اتنی دیر تک باہر نہ رہا کرو، شام سے گھر آ جا با کرو۔ جانے کب یہاں
بھی گھر بڑھو جائے“ بڑی چچی نے کہا

”رہنا تو پڑتا ہے، مسلمان ڈرے ہوئے ہیں، انھیں سمجھانا ہے کہ وہ یہاں
ڈٹ کر رہیں اور یہاں کی فضا کو پر امن رکھیں، گھر میں بیٹھ کر تو کام نہ چلے گا،
”آبر اب ملک آزاد ہو گیا تو یہ کام شروع ہو گئے، خیر مجھے کیا تم نے تار
پر پتہ ٹھیک لکھا تھا نا؟“ اماں نے پوچھا۔

”آپ، طینان رکھیں پتہ ٹھیک تھا“

”خیر سے ہم تو پاکستان جا رہے ہیں، گھر اب تم اپنے گھر کی فکر کرو جیل میاں
کیا یر کی حالت ہو چکی ہے، اپنی ماں کی طرف بھی دیکھو۔“ اماں نے ہمدردی سے بڑی
چچی کی طرف دیکھا۔

”کون جا رہا ہے پاکستان؟“ بڑی سے چچا نے صحن میں قدم رکھتے ہی بول کھلا کر
پوچھا۔ انھوں نے اماں کی بائیں سن لی تھیں۔

”جس اور عالیہ جائیں گے، اور کسے جانا ہے؟“ اماں نے تڑا رخ سے جواب دیا
”کوئی نہیں جا سکتا، میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں نکال سکتا۔
کس لئے جاؤ گے پاکستان؟ یہ ہمارا ملک ہے، ہم نے قربانیاں دی ہیں، اور اب
ہم اسے چھوڑ کر چلے جائیں؟ اب تو ہمارے عیش کرنے کا وقت آ رہا ہے۔“ بڑی
چچا سخت جوش میں تھے۔

”انشاء اللہ، آپ بڑے حق دان بن کر آ گئے، نہ کھلانے سے نہ پلانے کے“

کون سا کھ تھا جو یہاں آکر نہیں جھیلا، میرے شوہر کو بھی آپ ہی نے چھین لیا۔ آپ ہی نے انھیں مار ڈالا، میری نظر کی کو تھیم کر دیا اور اب حق جتنا رہے ہیں۔ مارے غصے کے اماں کی آواز کانپ رہی تھی۔

”مگر میں بوا میرا کھانا بیٹھک میں بھجوا دو۔“ بڑے چچا سر جھکا کر بیٹھک میں چلے گئے۔

”کیا آپ چھیننے سے پہلے بڑے چچا کو یہی بدلہ دینا چاہتی ہیں؟ بڑے چچا نے کسی کو تباہ نہیں کیا، بڑے چچا نے کسی کو دعوت نہیں دی تھی کہ آؤ میرا ساتھ رو۔ آپ آج اچھی طرح سن لیں کہ مجھے بڑے چچا سے اتنی ہی محبت ہے جتنی ابا سے تھی“ عالیہ نے کھانا چھوڑ دیا اور ہاتھ دھو کر بیٹھک میں چلی گئی۔ اماں کیا کہتی رہ گئیں اس نے ذرا بھی نہ سنا۔

”کیا تم سچ سچ جا رہی ہو بیٹی؟“

ہاں بڑے چچا ان جو تباہ ہیں اس نے بے بسی سے جواب دیا۔
 ”یہ انگوٹز جاتے جاتے بھی چال چل گیا، لوگوں کو گھر سے بے گھر کر گیا، پھر بھی تم مت جاؤ بیٹی اپنی اماں کو سمجھا لو، اب تمہارے سکھ کا زمانہ آ گیا ہے۔“
 ”بڑے چچا میں تو اماں کا واحد سہارا ہوں، میں انھیں کس طرح چھوڑ دوں وہ ضرور جائیں گی مگر آپ کو نہیں معلوم کہ یہ گھر چھوڑ کر میں کس طرح تر لوں گی۔ آپ۔ آپ۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔
 ”چھوٹی دلہن کو مجھ سے سخت نفرت ہے، ٹھیک ہے میں نے تم لوگوں کے لئے کچھ نہ کیا، مگر اب وقت آیا تھا کہ اس گھر میں اپنی سی شادمانی لوٹ آتی ہے بڑی اچھی ملازمت وہی جا رہی ہے پھر دکانوں کو چلانے کے لئے وہ سہ پندرہ ہزار

کی امداد بھی ملنے کی توقع ہے، میں چھوٹی دہن کی شکایتیں رفع کر دوں گا۔
 انہوں نے عالیہ کو پیار سے تھپکا۔ کیا گھر میں تیل ختم ہو گیا ہے؟ لالہ بیٹن
 کی لودھم ہوتی جا رہی ہے، اب انشاء اللہ تھوڑے دنوں میں بجلی کا کنکشن بحال
 کرا لوں گا اور اب تم ایم۔ اے میں داخلہ کیوں نہ لے لو۔ میرا خیال ہے کہ تم کو
 اگلے سال ضرور داخل کرا دوں گا۔

عالیہ کا کیجہ کٹ رہا تھا۔ آنسو پوچھ کر وہ خاموش رہی۔ جی ہی جی میں
 گھٹ رہی تھی مگر ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ خدا آپ کو سکھ دے بڑے چچا، خدا
 آپ کے سارے سہانے غم اب پورے کرے۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگا
 رہی تھی۔ وہ بڑے چچا سے کس طرح کہتی کہ وہ تو یہاں سے خود بھاگ جانا چاہتی
 ہے۔

اسرار میاں بھیچک میں داخل ہونے کے لئے پٹ کھول رہے تھے۔ عالیہ
 اٹھ کر صحن میں آگئی۔

اماں اور بڑی چچا جانے کیا باتیں کہ رہی تھیں، جمیل بیٹا اب تک کرسی پر
 بیٹھے انگلیاں مڑوڑ رہے تھے۔ وہ ایک لمحے تک آنکھن میں کھری رہی اور پھر اوپر
 چل گئی۔

شبنم سے بھیگی ہوئی رات بڑی روشن ہو رہی تھی۔ چاند چھپے وسط آسمان
 پر چمک رہا تھا اور روز کی طرح آج بھی قریبہ کی کس چھت پر گرامو فون ریکارڈ
 نک رہے تھے۔ گھڑی میں گاہر مسافر جاگ ذرا

وہ آہستہ آہستہ ٹیلنے لگی۔ کیسی پیپ سی حالت ہو رہی تھی۔ جیسے سو چنے

کی ساری صلاحیت کسی نے چھین لی ہو۔ کیا یہ میں ہوں؟ اس نے اپنے آپ سے
 پوچھا اور پھر اپنی آواز سن کر حیران رہ گئی۔ حد ہے دیوانگی کی، وہ کس سے پوچھ رہی تھی۔

ٹہیلے ٹہیلے وہ ایک بار مرطی تو جمیل بھیا بت کی طرح ہے جس و حرکت کھڑے تھے
 وہ اور تیزی سے ٹہیلنے لگی۔ اب یہ کیا کہنے آئے ہیں، انھوں نے اپنا وعدہ کھلا دیا۔
 ”کیا سچ سچ تم نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“ انھوں نے دھیرے سے پوچھا۔
 ”ہاں“ اس نے ٹہیلے ہوئے جواب دیا۔

”تم یہاں سے جا کر غلطی کر دو گی، تم نے ایک بار کہا تھا ناکہ دور رہ کر یادیں
 بہت اذیت ناک ہو جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم وہاں خوش نہ رہو گی۔“
 ”میں ہر جگہ خوش رہوں گی، مگر آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھ سے کبھی
 کچھ نہ کہیں گے۔“

”میں کیا کہہ رہا ہوں؟“
 ”کچھ نہیں۔“

”تم میری مقروض ہو، یاد رکھنا کہ تم کو یہ قرض چکانا ہو گا۔ وہ جانے کے
 لئے مرے۔“ تم وہاں خوش رہو گی نا؟“ انھوں نے رک کر پوچھا۔
 وہ چپ رہی۔ جمیل بھیا تھوڑی دیر کھڑے رہے اور کھپ چلے گئے اور اس
 نے محسوس کیا کہ اس وقت وہ سب کچھ کھو بیٹھی ہے۔
 بڑی دیر تک پوچھی ٹہیلنے کے بعد جب وہ جھک گئی تو پھیکی کو خدا دیکھنے بیٹھ
 گئی۔ اسے یہاں سے جانے کی اطلاع دینی تھی۔

(۱۲۶)

یہ رات پہاڑوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، کوئی اسے گزار دے۔ کوئی
 صبح ہونے کا پیغام سنا دے اسے صبح ہونے کا انتظار ہے۔ صبح وہ چلی جائے گی

اور اسی کرم سے نجات حاصل کر لے گی۔

سب بول رہے ہیں، باتیں کر رہے ہیں، پھر بھی کیا سناٹا چھایا ہوا ہے چاند
کی کونسی تاریخ ہے۔ اب تک چاند نہیں نکلا۔ چھالیہ کاٹنے کاٹنے عالمیہ نے سب کی
طرف دیکھا۔ جمیل بھیا سب کی باتوں سے بے نیاز اپنی کرسی پر بیٹھے ایک ساڑھ
گنگنائے جا رہے تھے۔

مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری

میری موت سے ہونگی مرے غم کی ترجمانی

جمیل بھیا آج ساڑھن باہر نہیں نکلے تھے آج ان کو فرصت ہی فرصت تھی

جیسے سارے کام ختم ہو گئے اور اب انہیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔

”بڑی بھائی، میں تو جا رہی ہوں مگر آپ میری ایک بات یاد رکھیے گا کہ

اگر آپ نے بڑے بھیا اور جمیل میان کو قابو میں نہ کیا تو آپ کی ساری عمر بے فہمی
گزر جائے گی۔ اب تو آزاد خیال گئی، اب کون سا بہانہ رہ گیا ہے جو یونہی ساڑھ
دن دونوں باپ بیٹے آوارہ پھرتے ہیں۔ اماں بڑی چچی کو سمجھا رہی تھیں۔

”مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری۔“

ادھوری۔ جمیل بھیا اسی ایک شعر کو رٹے جا رہے تھے۔

اس شعر کو بار بار پڑھ کر وہ کیا جتنا چاہتے ہیں۔ وہ اس سے کیا کہہ رہے

ہیں؟ عالمیہ کا سرد تہ ٹیری سے چھالیہ کاٹنے لگا۔ اللہ میاں اگر اس وقت

اسے بہرا کر دے تو پھر کتنا اچھا ہو۔

چھوٹی دلہن ایسا جان پڑتا ہے کہ کلیہ منہ کو آیا جاتا ہے، بھرا پراگھر

تھا۔ دیکھتے دیکھتے سب بڑی بڑی ہو گئے زمانے زمانے کی بات ہے کہ کئی کچھ

نہیں کر سکتا، قربان جاؤں اس مالک کے جس نے ایک ملک کے دو ملک
 دیے، اپنے مسلمانوں کی حکومت ہو گئی، پر ہم اکیلے رہ گئے۔“ کہیں بوا جدا کی
 کے صدمے سے نڈھال۔۔۔۔۔ ہو رہی تھیں۔

”تم بھی چلو کہیں بوا“ اماں نے بڑے خلوص سے کہا۔

”اب تو یہی دعا کریں چھوٹی داہن کہ اس گھر سے لاش نکلے میری،

آج یہاں سے تلی جاؤں تو مرنے کے بعد ماکن مرحومہ کو کیا منہ دکھاؤں گی“

وہ اپنے جیتے جی جہاں بٹھا گئیں وہاں سے کیوں کر پاؤں نکالوں“

ستیانے رام کی کھنچی ہوئی لکیر سے باہر قدم رکھا تھا تو راون اٹھا

سے گیا تھا۔ ستیانے جیتے جاگتے رام کی حکم عدولی کی تھی، مگر تم کہیں بوا مر

ہوئی ماکن کا حکم نہیں ٹال سکتیں پھر بھی ستیا ستیا رہیں اور تم کہیں

بوا رہو گی، تم کو کون جانے گا، تمہارا قصہ کون لکھے گا۔

عالیہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کہیں بوا کو دیکھا۔ لالین کی مدد

زرد روشنی میں جدائیوں کے دکھ کتنے اجاگر ہو رہے تھے۔

”چھوٹی داہن اب بھی اپنا فیصلہ بدل دو، مت جاؤ چھوٹی داہن“

بڑی چچی کی آواز بھاری بھاری تھی۔

”مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستان ادھوری۔ جیل بھیا

ساری باتوں سے بے نیاز ہو کر جیسے اس ایک شعر کی کیفیت میں ڈوب

کر رہ گئے تھے۔

اسد کوئی تو اس رات کو گزار دے ورنہ آج وہ اپنی جان سے گزر

جائے گی۔ عالیہ نے سروتہ رکھ کر ادھر ادھر دیکھا چاند نکل رہا تھا

آسمان روشن ہوتا جا رہا تھا۔

”چھٹی کا خط آیا تھا، اس نے کیا لکھا تھا عالیہ؟“ بڑی چچی نے پوچھا۔
 ”اس نے لکھا ہے کہ پاکستان جانا مبارک ہو، ضرور جائیے۔ اس
 پاک سرزمین کو میری طرف سے چڑھے گا اور وہاں کی تھوڑی سی مٹی بھی
 دیکھے گا۔ میں اسے اپنی مانگ میں لگاؤں گی، میں بد نصیب تو وہاں کبھی نہیں
 جا سکتی، اور سب کو سلام دعا لکھی ہے۔“ عالیہ کو جتنا یاد تھا سب سنا دیا۔
 ”اور کبھی کچھ لکھا ہے؟“ بڑی چچی نے پوچھا۔

”بس یہی سلام دعا، خط اوپر رکھا ہے۔“

”مری موت سے نہ ہوگی مرے غم کی تر جہانی۔۔۔ جیل بھی اب کبھی
 سب سے بے نیاز تھے۔“

”جانے ہمارے مسلمانوں کا ملک کیسا ہوگا، مکان کبھی مل جائے گا۔
 جلدی سے کہ نہیں، ہوٹل میں نہ کھڑنا چھوٹی دلہن۔ صحت خراب ہو جائے
 گی وہاں کے کھانے سے۔“ کرمین بوا کو اب آگے کی فکری ستار ہی تھی۔
 ”تم پریشان نہ ہو کرمین بوا، میں جانتے ہی خط لکھ دوں گی“ اماں
 نے کہا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ رات سرد ہوتی جا رہی تھی مگر سب لوگ
 بیٹھے تھے، عالیہ کا جی پاہ رہا تھا کہ بس اب کسی طرح اوپر کھاگ جائے۔
 ”اچھا کبھی اب سونے کو چل دے، خدا حافظ۔“ جیل بھی کرمین
 سے اٹھ پڑے۔

”مجھے اور زندگی دے۔۔۔ وہ کمرے میں چلے گئے۔“

بٹھیک کے دروازے کھلے اور بند ہو گئے۔ بڑے چچا ایک ذرا دیر کو
بھا اندر نہ آئے۔ عالیہ انتظار کرتی رہ گئی۔

گلی میں آوازہ گتے بھونک بھونک کر رو رہے تھے۔ کاش بند
آجائے اس کی آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں۔ ایک دن جب
وہ یہاں آئی تھی اور پہلی رات اس کمرے میں گزارا تھی تو ساری رات سونہ
سکی تھی اور آج جب وہ یہاں سے جا رہی ہے تو پھر بند نے ساتھ چھوڑ دیا
تھا۔ کتنی بہت سی باتیں اس کا کلیم نوچ رہی تھیں۔ جمیل بھیا نے اس
سے ایک بات بھی نہ کی، کیا جاتے جاتے وہ اب اس سے کچھ نہ کہیں گے، کیا
اب کچھ کہنے کو باقی نہیں رہ گیا۔ اللہ بڑے چچا کیا سوچ رہے ہوں گے، وہ
بڑے چچا کو چھوڑ کر جا رہی ہے اور چھپی خدا کمرے سے پاکستان آنا نہیں
ہو جائے۔

جاگتے جاگتے صبح ہو گئی۔ سبھی منزل سے برتنوں کے کھڑکنے اور باتیں
کمرے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے کمرے پر ایک وداعی نظر ڈالی اور
پھر نیچے آگئی۔

ناشتہ تیار تھا وہ اماں اور بڑی چچی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کمرے کے
کیلے دروازوں سے اس نے دیکھا کہ جمیل بھیا اب تک چادر تانے سو رہے
تھے۔

حد ہو گئی بے مروتی کی، وہ جا رہی ہے اور ان کی آنکھ بھی نہیں کھلتی
جیسے موت کی نیند آگئی ہے۔ عالیہ کو کیسی ٹھیس لگ رہی تھی ان کے یوں
گھاٹ سے سو رہے پڑے۔ وہ چلی جاتی تو پھر سو لیتے۔

ناشتے کے بعد اماں نے اپنے سارے سامان کا جائزہ لینا شروع
 کر دیا۔ کپڑوں اور ہلکے پھلکے روکبلوں کے سوا تمام سامان چھوٹے کمرے
 میں بھر دیا گیا تھا کہ جب اچھا وقت آئے گا تو پھر آکر سب کچھ لے جائیں گے۔
 دوتاگے آگے ہیں، اسرار میاں نے باہر سے آواز لگائی تو وہ جلد

سے بیٹھک کی طرف بھاگی، کیا آج بڑے چچا بھی سوتے رہیں گے؟

”تھارے بڑے چچا تو تڑپ کے ہی کہیں اچلے گئے کہہتے تھے کہ کام ہے
 اور یہ بھی کہتے تھے کہ میں سب کو جاتے نہ دیکھ سکوں گا“ کہہ کر مین بوانے
 بڑی رقت سے بتایا۔

”یہ کہونا کر مین بوا کہ وقت نہیں تھا جو رخصت کرنے بیٹھے رہتے۔“

اماں نے بڑا سامنے بنایا، بڑی بھابی، میرا سامان حفاظت سے رکھنے گا۔

اس کمرے میں تالا لگا دیکھے گا، اماں نے ایک بار پھر ہدایت دی۔

اللہ آج کی سیٹیں ریزرو نہ ہوتی، آج وہ رک سکتی، بڑے چچا

سے بغیر وہ کس طرح جا سکتی ہے۔ وہ جیسے تھک کر بیٹھ گئی۔

”اٹھ جاؤ جمیل، تمہاری بہن اور چچی جا رہی ہیں، انہیں رخصت

تو کرو“ بڑی چچی نے تیسری بار جمیل بھیا کو آواز دی مگر وہ ٹس سے مس

نہ ہوئے۔

جلدی کرو کہ مین بوا، ہوا کی جہاز کسی کا انتظار نہیں کرتا وقت

پر اڑ جائے گا اسرار میاں نے پھر صدا لگائی۔

خدا نہ کرے۔ میرا بھائی آج لاہور کے ہونٹیا اڈے پر انتظار کرے

گا۔ جو ہم لوگوں کو نہ پایا تو کلیجہ کھٹے جائے گا۔ اماں نے بڑھاکر

برقع اوڑھ لیا، اب تم بھی جلدی کرو تا۔۔۔ انہوں نے جھلا کر عالیہ کی طرف
دیکھا جو اب تک بے سدھ سی بیٹھی تھی۔

”بہت وقت ہو رہا ہے، پہلے سے پہنچنا اچھا ہوتا ہے۔“ اسرار میاں کی
آواز رکتی ہی نہ تھی۔

”ارے کوئی اس اسرار میاں کو بھی پاکستان بھیدو،“ کریمین بواکلیجہ
چھاڑ کر رو دیں۔

کریمین بوا اور بڑی چچی اماں سے مل مل کر رو رہی تھیں مگر وہ دم بخود
کھڑی رہی اسے تو رونا بھی نہیں آ رہا تھا۔

”اگر مشکل وہاں ملے تو خط ضرور لکھنا،“ بڑی چچی نے عالیہ کو لپٹا کر سرگوشی
کی، ”مجھے یاد رکھنا، جاؤ خدا کو سونپا۔۔۔“ ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

ارے اے جمیل۔ اب تو اٹھ جا۔ بڑی چچی نے زور سے پکارا۔

میں جا رہی ہوں، خود مل لوں گی، عالیہ نے کہا۔

”کیوں مل لوں گی؟ وہ تو مارے نفرت کے ملنا نہیں چاہتا،“ اماں نے تیور بول

پر بل ڈال لئے، ”بس اب چلو جلدی۔“

”میں جا رہی ہوں، خدا حافظ،“ عالیہ نے جمیل بھیا کے منہ پر سے چادر
کھینچ لی اور پھر جھک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بھیگی اور سو جی ہوئی آنکھوں
میں ایک داستان دم توڑ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر
کبھی وہ آنکھیں تو اس کی آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں۔

”تم جانتیں کیوں نہیں بے وقوف لڑکے؟ کیا یہی دیکھنے کے لئے مجھے جگانے آئی؟“

تھیں؟ خدا حافظ انہوں نے منہ چھپا لیا۔

”جلدی چلو عالیہ“ اماں کی آواز آئی۔ تب عالیہ کو خیال آیا کہ اسے جانا ہے۔ باہر تانگہ کھڑا ہے۔ مگر اس کے پاؤں کیوں نہیں اٹھتے، اب وہ جانی کیوں نہیں اور یہ کمرے میں اتنا اندھیرا کیوں چھا رہا ہے۔

لڑکھین بوجلدی کو بہت دیر ہو رہی ہے، اور چھوٹی داہن سے اور عالیہ جی جی سے میری دعا کہہ دو کہ — اسرار میاں کی آواز رک گئی۔

”خدا کرے تمہاری زبان تھک جائے اسرار میاں۔“ کریمین بوائے تڑپ کر دعا مانگی۔

عالیہ سب کچھ سن رہی تھی مگر اس کے پاؤں نہیں اٹھ رہے تھے، اے بوجی اے کھینچ کر بھاگے جائے۔ وہ اس کمرے سے تو نکل جائے۔

”تم اس لئے دیر کہہ رہی ہو کہ بھائی جہاز نہ ہم کو چھوڑ کر آؤ جائے۔ تیرے بھائی کے ٹکٹوں کے دام غارت جائیں اور وہ ہمیں اس جہاز میں نہ پا کر پاگل ہو جائے۔“ اماں جانے اور کیا کہتی کہ عالیہ رشتیوں کی طرح بجاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

”آپ کے بھائی اور بھانجے سے اتنا بھی نہ بولا کہ چار یا پنج دن ہماری وجہ سے کٹھن جاتے۔ ہمارے ساتھ سفر کر لیتے اور اب ہمارے لئے پاگل ہو جائیں گے۔ انہ!“ عالیہ زور سے بولی اور پھر بڑی چچی سے لپٹ کر — سیکنے لگی۔

(۴۷)

ناہور آکر تین چار دن ماموں کے ساتھ ان کی سرکاری کوٹھی میں

گزارنے پڑے۔ وہ بھی اس طرح کہ سا یادن ایک چھوٹے سے کمرے میں بند
 پڑی رہتی۔ وہ ہر وقت یہ سوچتی رہتی کہ اس بیزار کن ماحول میں کس طرح
 زندگی گزارنے گی۔ ہاں اماں بہت خوش تھیں۔ بھائی اور انگریز بھواد
 کے ساتھ رہنے کی بڑی پرافی آرنہ و اب پوری ہوئی تھی۔ انھوں نے زندگی
 بھر ساتھ رہنے کے پروگرام بنائے تھے اور عالیہ سے خفا تھیں کہ وہ سب سے
 الگ تھلگ پڑی رہتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو اپنی ممانی سے فرار انگریز بولنے
 کی مشق ہی کرتے مگر اس نے تو ان چار دنوں میں صرف ایک ہی کام کیا تھا کہ
 بڑی چچی اور بڑے چچا کو کئی کئی صفوں کے خط لکھے تھے۔

پانچویں بن ماموں نے ایک چھوٹی سی کوٹھی کا تال تر ڈو آکر اماں کو ان کے
 گھر جانے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے اماں کو چپکے چپکے سمجھایا کہ انگریز عورتیں تو
 اپنی ماں کے ساتھ بھی رہنا پسند نہیں کرتیں۔

اماں نے عالیہ سے یہ باتیں چھپانی چاہیں مگر جب وہ اپنے نئے گھر جا رہی
 تھی تو ممانی نے ٹوٹی پھوٹی اور وہ میں سمجھا ہی دیا کہ سب کا الگ الگ
 رہنا ٹھیک ہوتا ہے ساتھ رہنے میں بہت گڑبڑ ہوتی ہے۔

کوٹھی میں ایک ایک چیز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ کھانے کی نیر پر برتن
 قرینے سے لگے ہوئے تھے۔ اور برتنوں کے نقش و نگار دھول نے چھپا دیے
 تھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بس ابھی پر دے کے پیچھے سے نکل کر کوئی آئے گا۔
 اور کھانے کے لئے بیٹھ جائے گا۔ باورچی خانے میں پیتل کے برتن الٹا
 میں لگے تھے اور چند برتن زمین پر لٹکے پڑے تھے۔ ڈرائینگ روم کے
 قالین اور صوفے سب پر دھول ہی دھول براجمان تھی اور گلہ ان میں لگے

ہوئے پھول چھڑ کر مینر پر بکھرے ہوئے تھے۔ صرف کالی کالی سوکھی شاخیں
اب تک گلدان میں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ سونے کے کمرے میں بستروں پر
پینگ پوش چھے ہوئے تھے اور سر ہانے تپائی پر رکھا ہوا پیپا اٹھا
پڑا تھا۔ اس کمرے کے ساتھ چھوٹے سے کمرے میں آشدان پر کرشن مہاراج
کی سوزنی رکھی تھی۔ مالا کے پھول چھڑ کر آس پاس بکھرے ہوئے تھے اور
گلے میں صرف پیلا ڈورا دکھارہ گیا تھا۔

”بھئی اسے تو یہاں سے ہٹاؤ، باہر بچوں کو دیدو، کھیلے گے۔“ جب
سے اماں یہاں آئی تھیں انھوں نے کئی بار کہا تھا۔

عالیہ نے اماں کو کوئی جواب نہ دیا۔ سورتی کئی دن تک یوں ہی رکھی
رہی۔ پھر جب اس کمرے کو استعمال کیے بغیر اماں کا گزارہ ناممکن ہو گیا
تو عالیہ نے سورتی کو اٹھا کر اپنے بکس میں چھپا لیا۔

دن بڑی بے کیفی سے گزر رہے تھے۔ بیکار بیٹھے بیٹھے اکتا گئی تھی۔ اس
کے خطبوں کے جواب بھی نہ آئے تھے۔ کون کہتا ہے کہ دور رہ کر یاد میں بہت
اذیت ناک ہو جاتی ہیں، اسے تو سب بھول گئے یاد میں صرف اس کے لئے اذیت
ناک ہو رہی ہیں۔

شاہیں غدا ب کی طرح کٹتیں، امدادی کمیٹیاں گھر گھر چکر لگاتی پھرتیں، اپنے
مہاجر بھائیوں کی مدد کرو، قافلے آرہے ہیں، مدد کرو۔ اور اماں بڑی رقت
سے بتاتی تھیں کہ ہم تو خود مہاجر ہیں۔ لوگ چلے جاتے مگر عالیہ کا دل چاہتا کہ وہ اماں
کی آنکھوں میں دھول جھونک کر سب کچھ انھیں دیدے۔

ناموں اور ان کی بیگم کبھی کبھی شام کو آنکھلتے تو عالیہ کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کون

سے چوہیا کے بل میں جا چھپے ، اماں بوکھلا جاتیں اور ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ اپنی بھالی
کو کس کے سر آنکھوں پر بٹھا دیں ،

چند دن خاموش بیٹھے رہنے کے بعد اس نے ایک ہائی اسکول میں ملازمت
کی درخواست دیدی جو جلد ہی منظور ہو گئی اور مصروفیت نے اسے بہت سے غذاؤں
اور دکھوں سے بچا لیا پھر بھی جب وہ اسکول سے واپس آتی تو بڑے چچا اور بڑی چچی
کے خط کے لئے پوچھتی۔ اماں اس روز روز کے پوچھنے سے تنگ آچکی تھیں وہ ہمیشہ
جھنجھلا کر جواب دیتی۔

ایک دن ماموں اکیلے آئے تو انھوں نے بتایا کہ کوٹھی اماں کے نام الاٹ کراری ہو
اب کسی بھی صورت چھوڑنا نہیں۔ پھر انھوں نے فرینچر وغیرہ کی چند رسیدیں دیں
کہ اگر کوئی پوچھے تو یہ دکھا دینا کہ ہم نے یہاں آکر خریدا ہے۔ اس کوٹھی میں تو بس کباڑ
بھرا تھا۔

اماں اپنے بھائی کے کارناموں پر خوش ہوتی رہیں۔ "بھائی ہو تو ایسا جو میرے
آرام کے لئے اس نے کیا نہیں کیا اب انگریزوں میں یہ قاعدہ نہیں کہ سب ہر وقت سر
پر نازل رہیں اگر ہمارے ہاں جیسا قاعدہ ہوتا تو بھائی ایک مندر کو جدا نہ کرتا۔
عالمیہ چپ چاپ کچھ سنتی رہی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سب کیا ہو رہا ہے۔
کس کا حق کون اڑا لے لے سجا رہا ہے۔ یہ رسیدیں کہاں سے آگئیں ، یہ کوٹھی اس کی
کس طرح ہو گئی۔ مگر عالمیہ یہ سب کچھ کس سے پوچھتی اماں صرف اماں تھیں اس کی تنخواہ
ملنے اور کوٹھی کی مالک بننے کے بعد پہلی جیسی مغرور اور خود پسند۔

وقت گھٹ گھٹ کر گزر رہا تھا۔ اسکول سے آکر وہ پریشان پھر آتی۔ اس

پاس کی کوٹھیدوں میں بھی کسی سے ملنا جلنا نہ تھا۔ جاہل جگہاں سے لوگ آکر بس رہے ہیں

کسی کو کسی سنی خبر نہ تھی۔

اماں کو اتنی فرصت ہی نہ ملتی کہ اس کی طرف بھی دیکھ سکتی، سارا دن کوٹھی کی دیکھ بھال میں گزار جاتا، س روپے پھینے پر رکھی ہوئی مائی اگر کسی چیز کو ذرا زور سے رکھ دیتی تو اماں کا کیلجہ دکھ جاتا۔ یہ اتنی اتنی منہنگی چیزیں خریدی ہیں اور تم آپے میں نہیں رہتیں۔ ذرا ہوش سے کام کیا کرو۔

بہت دن نہیں گزرے تھے کہ ماموں کو اچھی تبدیلی ہو گئی، جب وہ رخصت ہو رہے تھے تو اماں کا زور و کر بڑا حال ہو گیا، ان کی بھابی اس بیقراری کو دیکھ کر مسکراتی رہیں۔ ہمارا تو بچہ لوگ بھی بہت ڈور ڈور چلا جاتا ہے مگر کوئی نہیں روٹا۔

عالیہ کو ان کے جانے کا نہ صدمہ ہوا نہ خوشی، چلے گئے تو چلے گئے۔ اس کا ان لوگوں سے اسطرح ہی کیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد ماموں نے کئی بار کہا بھی تھا کہ عالیہ اپنے باپ کی طرح دل سے اٹھیں ناپسند کرتی ہے۔

وہ یہ سب کچھ سن کر ہنس دی۔ اس وقت اسے ابا کتنی شدت سے یاد آتے تھے، مگر اب تو وہ ان کی قبر تک کو دوسرے ملک میں چھوڑ آئی تھی۔ وہاں سے ناتہ ٹوٹ گیا تھا۔ کسی نے اس کے خط کا جواب تک نہ دیا تھا۔

(۲۸)

فساد ختم ہو گئے تھے بس کہیں آکا، تاکا، وادات کی خبر پڑھنے میں آجاتی۔ اب وادوں ملک بھائی چارہ قائم کرنے پر زور دے رہے تھے عالیہ کو ان خبروں سے ذرا بھی دل چسپی نہ ہوتی۔ بھلا ایسی بھی مصیبت کس کام کی۔

ماموں کے جانے کے بعد عالیہ نے پردہ چھوڑ دیا تھا۔ یہاں اسے کون جانتا تھا جو اپنی پرانی روایات کو پکڑے بیٹھی رہتی۔ خالی وقت گزارنے کے لئے اس نے والٹس کیمپ جانا شروع کر دیا تھا۔ اسکول سے آکر وہ تھوڑی دیر آرام کرتی اور پھر بس سے چلی جاتی۔ وہاں بچوں کو سفت میں پڑھا کر اسے عجیب سا سکون ملتا۔ مصروفیت کی دھول نے کھپلی یادوں کو دھندلا دیا تھا۔

اماں اس کے والٹن کیمپ جانے کی وجہ سے سخت اکھڑی اکھڑی رہتی جب بھی وہ وہاں سے واپس آتی کوئی نہ کوئی ناخوشگوار بات ہو جاتی۔ ایسے موقع پر وہ چپ رہتی۔ وہ اپنی طرف سے بات نہ بڑھانا چاہتی تھی۔

آج پھر بچے شام جب وہ واپس آئی تو اماں اُجاڑ لانا میں کرسی پر بیٹھی جیسے اسی کا انتظار کر رہی تھیں۔

”تم وہاں کس لئے جاتی ہو؟ تم کو اس بے کار کام میں کیا مل جاتا ہے؟“ انھوں نے سختی سے سوال کیا۔

”سکون ملتا ہے۔“ اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

”وہی باپ اور چچا والی باتیں، کیا اب تم مجھے تباہ کرنا چاہتی ہو؟“

”بچوں کو پڑھانے سے اگر آپ تباہ ہوتی ہیں تو میں مجبور ہوں۔“ اس نے

تنگ آکر جواب دیا۔

”تم مجبور ہو؟“ اماں نے غصے سے پوچھا۔

”ہاں میں مجبور ہوں۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اس نے پلٹ کر کبھی نہ دیکھا

کہ اماں پلو میں منہ چھپا کر رو رہی تھیں۔

کمرے میں تنہا پڑ کر وہ دیر تک سوچتی رہی کہ وہ کیا کرے۔ وہ اماں کو

خوش نہیں رکھ سکتی۔ انہیں خوش رکھنے کے لئے اسے پرانے گھر میں پڑا رہتا ہوگا۔ تنہائی اور بیکاری میں جو جذبے اسے ستائیں گے ان سے کس طرح بچھا چھڑائے گی اور جو یادوں کے بھوت اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں ان سے بچکر وہ کہاں بھاگے گی۔ وقت یوں نہیں گزر سکتا، اسے سہارے کی ضرورت ہے۔ اور پھر اس خیال کے ساتھ ہی جانے کیسے اسکو والٹن کیپ کے ڈاٹھ کا خیال آگیا۔ اچھا آدمی ہے بچارا۔

رات اماں نے اکیلے کھانا کھا لیا۔ اس نے بھی شکایت نہ کی۔

آج جیسا وہ اسکول سے واپس آئی تو ادا اس تھی۔ آپ ہی آپ اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جی بیٹھا جا رہا ہے۔ سر دیاں دم توڑ رہی تھیں پھر بھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسے سخت سرری لگ رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ آج وہ آرام کرے گی، آج کہیں نہ جائے گی۔

کھانے کے بعد کمرہ بنا کر کے ور سونے کے لئے لیٹ گئی۔ کتنی دیر کھڑکی بدلتی رہی مگر نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔ اکتا کر اس نے اخبار اٹھا لیا۔ آج تو صبح جانے سے پہلے اس نے اخبار کو سرسری طور پر بھی نہ دیکھا تھا۔ یہی نہ چاہا۔

دو تین موٹی موٹی سرخیاں دیکھنے کے بعد ایک جبر پر اس کی نظر میں خیم کو رہ گئیں۔ مسلمان کا انگوٹھی لیدر کو کسی شخص نے مار دیا۔ نہرو کا اظہارِ افسوس۔ مرحوم کے خاندان کے لئے تین ہزار روپیہ کا عطیہ۔ مسلمان منافق کی شدید مذمت۔

بڑے چچا کا نام پڑھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ وہ

پانگلوں کی طرح اٹھی اور پھر اپنے بستر پر گر پڑی۔ اسے اپنے دل میں درد سا
 ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے وہ تو بڑے چچا سے مل کر بھی نہ آئی تھی اور وہ
 ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ وہ اپنے پانگلوں کی پٹی سے سر چمک چمک کر
 بڑی دیر تک روتی رہی۔ اب وہ بڑے چچا سے کبھی نہ مل سکے گی۔ اس احساس
 نے اسے اس طرح تڑپایا کہ اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکتی تھی۔

شام ہو گئی۔ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ روتے روتے وہ تھک چکی
 تھی۔ اماں کسی بار دروازہ کھٹکھٹا کر لوٹ چکی تھیں۔ اس نے سُوجی ہوئی آنکھوں
 کو بہ مشکل کھولا اور کمرے میں بکھرے ہوئے اخبار کے صفحوں کو روندتی باہر
 نکل گئی۔

”اسے تم کو کیا ہوا ہے؟“ اماں اس کے مُرخ چہرے، اور سُوجی ہوئی آنکھوں
 کو دیکھ کر گھبرا گئی تھیں۔

”بڑے چچا کر کسی ہندو نے چپکے سے مار دیا!“ اس نے بڑے سکون سے
 کہا۔ اتنا روچکنے کے بعد اسے صبر آ گیا تھا۔

”ہے، سارا ہی زندگی ہندو کی غلامی کرنے کے بعد بہ بدلا ہوا؟“ اماں
 کی آواز بھرا رہی تھی۔ آنکھوں نے پاؤں میں آنسو خشک کر لئے۔
 چاری جبری بھایا، کہا کیا حال ہو گا، آنکھوں نے تو ہم لوگوں کو اطلاع تک نہ دی۔
 عالیہ اماں کو ان کے حال میں چھوڑ کر باہر لان میں چلی آئی۔ بس
 بڑے چچا! اتنی شاندار زندگی کا یہی انجام ہونا تھا؟۔۔۔ تین سو روپے
 کا عطیہ اور اظہارِ افسوس؟ پتہ نہیں کپڑے کی دکالوں کے لئے وہیں کپڑے
 ہزار روپے ملتے تھے یا نہیں؟ بجلی کا کنکشن بحال ہوا تھا یا نہیں؟ کیا اسی لالین

کی پیلی پیلی روشنی میں بڑے چمپا کی لاش رکھ کر سب روتے رہے ہوں گے؟ پتہ
 نہیں جمیل بھیا کا کیا حال ہوگا؟ موت نے سارے اختلافات مٹا دیے ہوں گے؟
 نہیں؟

سات لیمپ کی روشنی میں میز پر چمکی وہ بڑی دیر تک بڑی چمپی کو خط لکھتی رہی
 اور اماں بائیں کمرتی رہیں۔۔۔

”جانے کیا حال ہوگا بڑی بھابی کا، بڑے بھیا مرحوم نے نہ زندگی بھر خود
 چین لیا نہ دوسروں کو لینے دیا۔ بھرے پڑے گھر تباہ کر دیے، کیا مل گیا اچھین؟
 جن کا ساتھ دیا انھوں نے ہی پر دیس میں موت کی نیند سلا دیا۔ ہائے چلے
 ہی آئے ان کافروں کے ملک سے بھلا کیا ضرورت تھی وہاں رہنے کی۔ اور اب
 وہ جمیل میاں ہیں وہ بھی ویسے ہی شاندار نہ کئے۔

خط ختم کر کے اس نے لفافے میں بند کر دیا۔

”سو جائے اماں“ وہ لیمپ بچھا کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ذرا دیر بعد
 اماں کے خراٹے لینے کی آواز آنے لگی مگر وہ آنکھیں کھولے اس اندھیر میں کیا
 کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔ یہ بڑے چمپا کی کھنائی ہر ٹی لاش یہاں اتنی دور لانا کہ
 کون رکھ گیا۔ اسرار میاں تم بڑے چمپا کو ہاتھ نہ لگانا کہ میں بوجھنا ہوں ہو جائیں
 گی۔ کہ میں بوجھنا تو دور سے قرآن شریف، نہ پڑھو، موت کا احساس اور
 بھی شدید ہو جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بڑے چمپا نہیں مرے ایک
 دنیا مر گئی، چپکے چپکے پڑھو کہ میں بوجھنا۔ اس نے گھر آکر آنکھیں بند کر
 لیں مگر وہ اپنے کانوں کو کیسے بند کر لیتی۔ اتنی دور سے بڑے چمپا کے ملک
 سے کہ میں بوجھنا قرآن شریف پڑھنے کی آواز برابر آئے جا رہی تھی۔ اور

بڑی چچی کے بین کی آواز اس کے کانوں کے پھڑے پھاڑے دے رہی تھی۔
 "اے اللہ اس رات کو گزار دے" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کہتے ہیں کہ سولی
 پر کبھی نیند آجاتی ہے، پھر آخر اسے نیند کیوں نہیں آ رہی، کیسی کیسی غلط کہاو
 مشہور ہو گئیں اور آج تک کسی نے صحیح نہ کیں۔

صبح وہ اٹھی تو تھکن اور صدمے سے نہ ٹھہرا حال ہو رہی تھی۔ برآمدے میں
 اہواں آگئی تھی اور اماں مائی کے ساتھ ناشتے کی تیاری میں مصروف تھیں۔
 وہ حسب معمول اسکول جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔ اماں نے اس کی طرف
 اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ بھلا اتنے صدمے کی کیا ضرورت ہے
 وہ اماں اور مائی کے بے حد اصرار کے باوجود ناشتہ کیے بغیر اسکول
 چلی گئی۔

ایک بچے جب وہ اسکول سے واپس آئی تو دھوپ میں پڑی ہوئی آرام
 کرسی پر خود کو جیسے گرایا اور جب مائی نے اس کے سامنے کھانا رکھ دیا تو وہ اس
 طرح کھانے لگی جیسے کڑوی روٹی ٹنگل رہی ہو۔ اماں اب تک اپنے کام میں مصروف
 تھیں۔ وہ سارا دن گزر جاتا ہے مگر کام ختم نہیں ہوتا، کوٹھیوں میں کتنا
 کام ہوتا ہے، مائی برآمدے میں رکھے ہوئے گلوں میں پانی ڈال دو سوکھے جا رہے
 ہیں۔۔۔ اماں برابر بوجہ جا رہی تھیں۔۔۔ مائی تم نے کمرے میں میز پر
 کھانا کیوں نہیں لگایا؟ میز کرسی ہو تو آدمی کیا مزے سے کھانا کھاتا ہے، اپنے ہاتھ
 کا بھی کیا برابر واج تھا کہ سخت پر مٹی کھا رہے ہیں۔

آج مرے کل دو سردن، مرنے والے کو کون روتا ہے۔ آج اماں پر اپنے
 ہاتھ کے رواجوں کے عیبوں کا انکشاف ہو رہا تھا۔ اگر یہ کوٹھی نہ ملتی تو پھر یہ

اتنے بہت سے راز کیسے کھلتے۔

کھانا کھا کر والٹن کیمپ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی، اماں نے اسے
 حڑک کر دیکھا اور کوئی اعتراض کے بغیر پھر کام میں مشغول ہو گئیں۔

شام جب وہ والٹن کیمپ سے واپس آئی تو کسی قدر زبردست تھی۔

والٹن کیمپ میں ڈاکٹر نے اسے کتنے مدھم اور پیارے لہجے میں سمجھایا تھا۔
 اسے تسلی دی تھی اسے وہاں سے جلدی چلے جانے پر مجبور کیا تھا اور پھر نیند کی
 دو گولیاں دے کر ہدایت کی تھی کہ رات کو ضرور کھالے، ایسے نیند کی سخت
 ضرورت ہے۔

وہ اچھا اور مہربان آدمی ہے۔۔۔۔۔ رات سونے سے پہلے عالیہ نے

نیند کی گولیاں کھاتے ہوئے فیصلہ کیا۔

(۲۸)

اسکول سے آنے کے بعد اس نے دیکھا کہ بستر پر لفافہ پڑا ہے۔ کتنے دن

بعد بڑی چچی نے جواب دیا تھا۔ وہ تو ان کے خط سے مایوس ہو گئی تھی

لفافہ کھول کر وہ جلدی جلدی پڑھنے لگی۔ پیاری عالیہ۔ تمہارا

خط ملا۔ دل قابو میں نہ تھا۔ جو تم کو جواب دے سکتی۔ تم نے دیکھا، تمہارے

بڑے چچا کتنے بے روت نکلے، میں نے زندگی بھر ان کا ساتھ دیا اور وہ مجھے

تنہا چھوڑ گئے۔ تم کو کیسے بتاؤ کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ میں تمہارے بڑے

چچا کو برابر منع کر رہی تھی کہ دلی مت جاؤ۔ کیا پتہ کہ کبھی کیا عالم ہو۔ مگر

وہ نہیں مانے اور نہرو سے ملنے چلے گئے وہاں کسی ہندو نے چپکے سے شہید

کر دیا۔ ہنستے بولتے گئے تھے اور جب آئے تو ہونٹوں پر تالا پڑ چکا تھا وہ
 تو شکر ہے کہ وہاں کے جاہل والوں نے لاش پہچان لی اور عزت کے ساتھ
 گھر لے آئے ورنہ آخری دینار کو بھی ترستی رہ جاتی۔ یہی خدا سے دیا کر دکر
 اب وہ تمھاری چچی کی لاج رکھ لے اور جلدی سے اٹھالے۔

پہرے تین ہزار روپے دینے کا اعلان کیا تھا مگر تمھارے جمیل بھیا
 نے یہ امداد لینے سے انکار کر دیا تمھارے جمیل بھیا بہت دن تک بیکار رہے
 نماز مت ڈھونڈے نہ ملی۔ گھر میں فاقے پڑنے لگے، وہ خدا بھلا کرے
 تمھارے بڑے چچا کے کانگریسی دوستوں کا جنھوں نے تمھارے جمیل بھیا کو
 زبردستی اس سٹنڈ جیلر کرا دیا بڑی سفارش سے یہ نوکری ہاتھ لگی اور
 وہ بھی تمھارے چچا کی خدمت کے صلے میں مل گئی ہے خدا "ان" کے دوستوں
 کو اجر دے۔

کتنے دن ہو گئے تمھارے بڑے چچا کو سدھارے، مگر اب بھی ایسا محسوس
 ہوتا ہے کہ پیٹھک سے نکلے چلے آ رہے ہیں۔ کمیرا بوا تم کو اور دہن کو بہت
 یاد کرتی ہیں، بہت لٹ گئی ہیں۔ تمھارے بڑے چچا کے عمرے کی خبر سنتے
 ہی انھوں نے اسرار میاں کو دھکے دیکر نکال دیا تھا پتہ نہیں کہاں چلے گئے
 آج تک نہ لوٹے،

اگر نکلیں کہیں ملے تو ماں کے کالجے کا حال سنا دینا۔ اب کتنے دن اور
 جینا کی عالیہ ایک بلا نو اس کی صورت بھی دیکھ لیتی۔

حیدرآباد دکن پر عہدہ دستاں کا قبضہ ہوتے ہی تمھارے ظفر چچا
 کراچیا چلے گئے، ان کا خط آتا ہے کہ ابھی بیٹھنے کا ٹھکانا بھی نہیں ملا۔ اللہ

اپنا رحم کرس۔ تمھاری نجمہ کبھی اپنے بگھر خوش نہیں ہیں۔ طلاق لینے کی سوچ رہی
ہیں۔ بہت سمجھایا مگر نہیں مانتیں، کہتی ہیں کہ ان کا میاں جاہل ہے، انگریزی کے درد
لفظ صحیح نہیں بول سکتا۔ انھیں سخت شرم آتی ہے کہ ان کا شوہر ایسا ہو۔ ان
کی سہیلی نے دھوکے سے شادی کرادی۔ نجمہ کے میاں تو صرف بارہ جماعتیں
پڑھے ہیں۔

چھوٹی دہن کو بہت بہت دعا کہو۔ بس اب جیتی ہوں یہ دنیا ظالم نہیں چھو
در نہ تمھارے بڑے چچا کے ساتھ ہی لاشن اکھٹی۔ خط لکھتی رہا کہو۔

تمھاری بڑی چچی

خط پڑھ کر اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹیک دیا۔ بڑے چچا اسراہ میاں
کو کبھی اپنے ساتھ دلی لے گئے ہوتے شاید کسی کو رحم آجاتا اور ایک تیز چھپرا ان کی
گردن پر کبھی پھیر دیتا۔

اماں سے آنسو چھپانے کے لئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”کس کا خط ہے؟“ اماں نے پوچھا۔

”بڑی چچی کا، آپ کو دعا لکھی ہے۔“

”حدر کر دی اتنے دن بعد جواب دیا ہے، وہ ہمیں ایسا سمجھی کب ہیں، سناؤ

کیا لکھا ہے؟“

”خود پڑھ لیجئے اماں، بہت شک گئی ہوں۔“ اس نے آنکھیں کھولے بغیر جواب

دیا۔

اماں نے خط پڑھ کر رکھ دیا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ کیسی

بے توفی کی کرتین ہزار روپے واپس کر دیئے، ایک دکان میں لگا دیتے تو چل نکلتے۔

اب تم کہاں جاؤ گے اسرار میاں بہ عالیہ دل ہی دل میں پوچھ رہی تھی۔
 ”خیر کو یمن لو انے یہ کام خوب کیا کہ اسرار مسٹنڈے کو گھر سے نکال دیا مفت
 خور کسی کام کا بھی نہ تھا، کھا گیا منوس سب کو۔“

”اماں“ عالیہ نے سُرخ سُرخ آنکھیں کھول کر اماں کو پکارا

”کیا ہے؟“

”کچھ نہیں“ اس نے پسر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے
 گھر کی تباہی کے لئے پوچھے کہ وہ کون لایا تھا۔ وہاں کون سے اسرار میاں تھے۔
 ابا کو مسرت کے لئے کون ترسا تا رہا، مگر وہ یہ سب نہ پوچھ سکی۔ آخر وہ اس کی
 ماں ہیں۔

وہ پڑے پڑے ٹھنڈی سانسیں بھرتی رہی۔ اماں لوٹوں سے بھر بھر کر کیا ریلوں
 میں پانی ڈالنے لگیں۔

جیل بھیا کیا بھول گئے، اس کے خط کا جواب بھی نہ دیا۔ مگر اب وہ شاکی
 کبروں ہے۔ ٹھیک ہے جواب نہیں دیا، یاد نہیں آتی ہوگی، دُوری سب کچھ بھلا دیتی
 ہے۔۔۔۔۔ کوئی جذبہ اس کے کلیجے کو نوچنے لگا۔

اماں کی آواز پر وہ کھانا کھانے کے لئے اٹھ گئی۔ بڑی چھپانے چھپی کیلئے
 کچھ لکھا ہی نہیں جانے اس کا کیا حال ہوگا۔ اس کی بیٹیا تو اب مزے سے بیٹھنے لگی
 ہوگی۔

کھانا کھا کر وہ والٹن کیمپ جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اللہ جانے ظفر چچا
 حیدر آباد کی جنت سے نکل کر کس حال میں ہوں گے۔

”یہ کہتی ہوں کہ کسوا دن گھر بھی بیٹھو، آخر یہ جہ ہو رہے۔ سلسلہ کب تک چلتا

رہے گا، لوٹا رکھ کر اماں ایک دم بگڑ اٹھیں۔

”یہ بے ہودہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا، اس نے بڑی سختی سے جواب دیا۔
اماں بہر وقت اپنے حال میں مگن رہتی ہیں، یہ تک نہیں دیکھتیں کہ آج بڑی سچی
کا خط آیا ہے، آج اس کے دل پر چھریاں چل رہی ہیں۔“

”سکون؟ تم کو سکون ملتا ہے؟ وہ تم کو کیا دیدیتے ہیں جو اس طرح
ماری پھر رہی ہو؟ مارے غصے کے اماں کا منہ سُرخ ہو رہا تھا۔“

”مجھے ان سے کچھ نہیں چاہئے۔ وہ لٹے ہوئے غریب مجھے کیا دے
سکتے ہیں، ان کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے، اس وقت تو میں سار
دنیا کو بھول جاتی ہوں، عالمیہ نے جیسے بھر پور مسرت سے آنکھیں موند
لیں اسے اس وقت وہ بچی یاد آ رہی تھی، جس کی کتابیں امرت سر میں رہ
گئی تھیں اور ان کتابوں کو یاد کر کے اب بھی روتی ہے۔ اس کے بدلے میں
اس کو کئی کتابیں مگر وہ ان کتابوں کو نہیں بھولتی۔“

”ہوں! تمہارے باپ کبھی یہی کہتا تھا کہ مجھے فلاں کام میں مسرت ہوتی
ہے، مجھے سکون ملتا ہے، اور تمہارا چچا بھی یہی کہتا تھا، اماں اسے گھور
رہی تھیں۔“

”میں آبا نہیں ہوں اور نہ میں بڑے چچا کی طرح بن سکتی ہوں۔ آپ ان
کا نام نہ لیا کریں تو بہتر ہوگا آپ نے مجھ کو اپنی بیٹی سمجھئے اور بس، وہ تیر
سے باہر نکلنے لگی تو اماں نے پھر سے لوٹا اٹھا لیا۔“

بہا نے مرجھائے ہوئے پوروں میں جان ڈال دی تھی، ننھی ننھی کونپلیں
پھوٹ رہی تھیں اور گلاب کے پورے میں دو بڑے بڑے پھول جھول رہے

تھے۔ عالمیہ کو ایک دم یاد آیا کہ ایک بار اس نے کپاری سے ایک پھول توڑ کر اپنے بالوں میں لگا لیا تھا مگر جب جمیل بھیا نے اسے ٹہمے اشتیاق سے دیکھا تھا تو اس نے اپنے بالوں سے پھول کھوٹ کر کپاری میں پھینک دیا تھا۔

پھاٹک سے باہر جاتے جاتے اس نے ایک پھول توڑ کر بالوں میں لگا لیا۔ شام جب والٹن کیمپ سے واپس آئی تو کپڑے تبدیل کر کے لان میں آ بیٹھی۔ اماں تو سخت ناراض تھیں انہوں نے اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا تھا۔ پھاٹک کے اس پار بڑک پرکاریں اور تانگے شور مچاتے گزر رہے تھے پھر بھی حال یہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہر طرف سناٹا طاری ہے۔ وہ گھبرا کر ٹہلنے لگی۔ خزاں میں جھڑے ہوئے خشک پتے اب تک گھاس پر پڑے تھے جو اس کی چپلوں کے نیچے آ کر خزاں کی یاد دلا رہے تھے۔

”کیا آج یہیں بیٹھی رہو گی؟“ جب اندھیرا چھانے لگا تو اماں نے براؤن میں آ کر کہا اور پھر اٹھ بیروں واپس چلی گئی۔

اب اماں کا موڈ ٹھیک ہو رہا ہے۔ وہ مگر کنڈوں کی پرانی گمسی پر تھک کر بیٹھ گئی۔ اب خاصا اندھیرا چھا گیا تھا۔ پھر بھی اس نے اٹھنے کا نام نہ لیا۔ اب یہ خط و کتابت کا سلسلہ بھی ختم ہو جانا چاہیے۔ کیا فائدہ کہ مسلسل اڑھت سہتی رہے، یاد میں سب سے زیادہ ظالم ہوتی ہیں اور۔۔۔ اچانک پھاٹک زور سے کھلا اور کوئی بے تمasha بھاگتا ہوا اندر آ گیا۔

”کون ہے، اس نے گھبرا کر پوچھا۔“

بھاگنے والا ایک لمبے کورک گیا۔ ”آپ میری ماں ہیں، میری بہن ہیں مجھے چھپ جانے دیکھئے میں غریب ہاجر، ہوں، وہ ظالم پولیس مجھے خواہ مخواہ کپڑے

رہی ہے، میں ابھی چلا جاؤں گا۔ آدمی دوڑ کر، میز کے پیچھے چھپ گیا۔
 عالیہ خوف کے مارے کرسی میں جم کر رہ گئی۔ اس نے اماں کو آواز دینا
 چاہی مگر ساری جان کا زور لگانے کے بعد بھی وہ ہونٹ تک نہ کر سکی۔
 اسی لمحے اماں نے آکر برآمدے کا بلب روشن کر دیا۔ کھانا کھا لو اگر
 اماں کے لہجے میں اب تک سختی تھی۔

روشنی میں اس نے ہر طرف دیکھا پھر کبھی اس سے کچھ نہ پوچھا گیا۔ اماں پھر
 چلی گئیں اور وہ ہاتھ بڑھا کر رہ گئی۔ اس نے اٹھ کر اندر بھاگنا چاہا تو پیروں
 نے جواب دیدیا۔

سج کے پیچھے بالکل خاموشی تھی۔ عالیہ کا دل زور زور سے دھڑک رہا
 تھا۔ پتہ نہیں کون سا ڈاکو آجھا پا ہو، وہ بڑی شکل سے اٹھی اور اندر جانا
 چاہتی تھی کہ ایک دم کھڑے ہوئی اور وہ آدمی نکل آیا وہ باہر بھاگنے والا تھا
 کہ عالیہ سے اس کی آنکھیں چارہ ہو گئیں۔ "ارے عالیہ بچیا آپ؟" شکیل
 نے اپنی ننگی ننگی سرخ آنکھیں جو کالیں۔ انھوں نے مجھے شریب جان کر گروہ
 کٹ سمجھ لیا، میں ایسا نہیں ہوں بچیا۔"

عالیہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ سامنے شکیل کھڑا تھا اس
 کی قمیض شانے سے کھٹی ہوئی تھی اور بڑے ہوئے بان مانتے پر بکھرے ہونے
 تھے۔

"اب میں جاتا ہوں بچیا، کہیں وہ مجھے تلاش کرتے اندر نہ آجائیں۔"
 "تم کہاں جاؤ گے شکیل، میرے بچیا، عالیہ بے قرار ہو کر اس کے لپٹ
 گئی اور پھر اسے اپنی کرسی پر بٹھا کر جلدی سے برآمدے کی تہی بچھا آئی۔"

اب تم کہیں نہ جاؤ۔ کہیں وہ ظالم تم کو پکڑ نہ لیں، تم میرے کمرے میں چلو۔
وہ اسے کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے آئی اور برآمدے میں کھلنے والا
دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

”مجھے جانے دیجئے بھیا! وہ اب تک گھبرایا ہوا تھا۔

”میں تم کو کہیں نہ جانے دوں گی، یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔

میرے بھیا! وہ شکیل کے پھٹے پٹروں اور لاغر چہرے کو دیکھ کر جیسے بلکی
جا رہی تھی۔ تم یہاں اس حالت میں پھر رہے ہو اور وہاں بڑی چچی تمہارے
لے آدھ موٹی ہو گئیں۔ اس نے شکیل کو پلنگ پر بٹھا دیا۔

”اچھا! اماں مجھے یاد کرتی تھیں؟ مجھے اور کون کون یاد کرتا تھا؟ ابا
تو مجھے خاک یاد کرتے ہوں گے۔ وہ تو کسی سے مطلب ہی نہ رکھتے تھے، اور
چچی اور جمیل بھیا، وہ تو میری خوب برائیاں کرتے ہونگے اس کی آنکھوں
میں اشتیاق تھا۔ میں سخت بھوکا ہوں بھیا، کل سے میں نے کچھ نہیں
کھایا۔

”بڑے چچا تم کو خاک یاد کرتے ہوں گے، ٹھیک ہے شکیل میرے بھیا!
عالیہ کا گلا زرد دھننے لگا۔ ”چلو تم کو کھانا کھلاؤں پھر باتیں ہو گی۔ اس نے
شکیل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”آپ یہاں کب آئیں بھیا؟“ ساتھ چلتے ہوئے شکیل نے پوچھا۔

”پاکستان بننے کے تھوڑے دن بعد آگئی تھی۔“

وہ اسے کھانے کے کمرے میں لے گئی جہاں اماں روتی روتی کھلی بیٹھی بڑی
نراکت سے کھانا کھا رہی تھیں اور مائی آنکھیں پھاڑے شکیل کو دیکھ رہی

تھی۔ اماں نے نظریں بھی نہ اٹھائیں۔

”اماں شکیل آیا ہے۔“

”کون شکیل؟“ اماں نے نظریں اٹھائیں۔ ”ارے تم کب آئے پاکستان؟“

اماں نے خوش ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”تھوڑے دن ہوئے چھوٹی چچی، اور وہ سب غلط ہے، وہ وہاں ہیات

لوگ یونہی خواہ مخواہ پر دیسی جان کر۔۔۔ شکیل اماں کے سامنے بھی اپنی

صفائی پیش کر رہا تھا۔ شاید اسے خیال ہو گا کہ عالیہ ضرور سب کچھ تباہی

مگر عالیہ۔۔۔ تو جلدی سے اس کی بات کاٹ دی، ”اماں شکیل بیچارہ قاضیوں

کے ساتھ آیا ہے اور دور شہر کے اندر کہیں ٹھہرا ہے، ابھی تو بیچارے کو کچھ

پتہ نہیں اس لیے اور اور محنت مزدوری کر کے پیٹ بھر رہا ہے۔ اپنا

کوئی نہ ہو تو پھر یہی حالت ہو جاتی ہے۔“ اس نے شکیل کے لیے کوئی کھینچ

دی۔

”اب اگر ہمارے پاس جگہ ہوتی تو دیدیے، اتنی سی کوٹھی ہے۔“ اماں

نے چھکروں کی کوٹھی کو اشارا بنا دیا، ان کے لہجے میں سخت بے اعتنائی تھی۔

وہ شکیل کو ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”اب یہ کافی عرصے یہیں میرے پاس ٹھہرے گا۔ عالیہ نے سخت اور فیصلہ

کن لہجے میں کہا۔

اماں نے گھور کر عالیہ کو دیکھا اور بے تعلقی سے کھانا کھانے لگیں شکیل

مکھکوں کی طرح جلدی جلدی کھا رہا تھا۔ وہ روٹی اس طرح اٹھاتا جیسے

چھوٹے رہا ہو۔۔۔ بہت دن بعد گھر کا کھانا ملا ہے۔ ”آگیا بھیا۔“

اماں سب سے پہلے اٹھ کر چلی گئیں، جاتے ہوئے انہوں نے شکیل اور عالیہ کی طرف دیکھنا بھی گزارہ نہ کیا۔ عالیہ بیٹھی شکیل کو کھاتے دیکھتی رہی اور یہ سوچ سوچ کمرہ دہتی رہی کہ اگر اس وقت پولیس اسے پکڑ ہی لیتی تو کیا ہوتا۔ کھانے کے بعد وہ شکیل کو اپنے کمرے میں لے آئی۔

”دروازہ بند کر لیجئے بجیا مجھے ڈر لگتا ہے“ شکیل بڑے آرام سے عالیہ کے بستر پر لیٹ گیا۔

”یہ تمہارا کمرہ ہے، ٹھیک رہے گا نہ؟“ اس نے پوچھا۔
 ”اب تو ابا کا ملک آزاد ہو گیا، اب وہ کیا کہتے ہیں نہرو نے ان کو کون سی جاگیر دیدی؟“ شکیل نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں کتنی نفرت تھی۔
 ”بڑے چچا؟“ عالیہ کی آواز کانپ گئی۔ ”وہ تو اس دنیا سے سدھار گئے شکیل، میرے بھیت انہیں تو کسی ہندو نے فساد میں شہید کر دیا۔“
 ”کیا؟“ اس نے تکیے میں منہ چھپا لیا اور اس کا سارا جسم ہولے ہولے لرزنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد عالیہ نے اپنے آنسو پوچھ کر اس کا سر اٹھایا اور سارا بکیرہ بھیگا ہوا تھا۔

مجھے اس وقت اماں یاد آ رہی ہیں بجیا۔ وہ دو سال کے بچوں کی طرح متناہا۔

”اب تم ان کے پاس چلے جاؤ شکیل، ان کی زندگی میں بہار آجائے گی۔ بڑے چچا کی موت نے ان کو کہیں کا نہیں رکھا، تمہیں دیکھ کر وہ تھوڑے دن اور جھالیں گی۔“

”ابا کا مر جانا ہی ٹھیک ہوا بچیا! آنکھوں نے کسی کے لئے کچھ نہ کیا، اب میں گھر جا کر کیا کروں۔ وہ جمیل بچیا مجھے طعنے دیدے کہ زندگی حرام کر دیں گے، میرے لئے تو اب بھی اس گھر میں کچھ نہ ہو گا یہاں کھا کما لوں گا“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

مگر اس طرح تو نہ کماؤ کر لو لیں تمہارے پیچھے پیچھے پھرے۔ تم بہت بے رحم ہو شکیل میرے بچیا!

”میں کچھ نہیں کرتا بچیا، پولیس بہت بے رحم ہے وہ غریبوں کو جینے نہیں دیتی۔ مجھے اماں یاد آ رہی ہیں“

”اگر تم بڑی چچی کے پاس نہیں جاتے تو پھر میرے پاس رہنا ہو گا، میں تم کو اب کہیں نہ جانے دوں گی اب میں ملازم ہو گئی ہوں“ میں تم کو بھی اسکو میں داخل کرادوں گی۔ تم آرام سے پڑھو، اس طرح زندگی بن جائے گی میں کل ہی بڑی چچی کو لکھ دوں گی کہ شکیل میرے پاس ہے، ہم بھائی بہن بڑے زلے سے رہتے ہیں“

”اب کیا پڑھوں گا بچیا، جو پڑھا تھا وہ کبھی بھلا دیا۔ اور بچیا، ہمارے گھر کے سامنے والا اسکول تو اسی طرح تھا نا؟“

”ہاں اسی طرح تھا۔ جب پڑھنا شروع کرو گے تو سب یاد آ جائے گا۔“

”اب صبح باتیں ہو گی بچیا، مجھے نیند آ رہی ہے“ وہ پھر لیٹ گیا۔

بس اب آپ اٹھ جائیے میں اندر سے دروازہ بند کر لوں“

”دروازہ بند کر لو گے تو گرمی نہیں لگے گی؟“

”نہیں بچیا میں دروازہ بند کروں گا، مجھے ڈر لگتا ہے“

عالمیہ آکر برآمدے میں لیٹ گئی۔ پاس کے پلنگ پر اماں بڑھی ہے
خبر سوراہی تھیں۔ اسے ان پر رحم آنے لگا۔ خواہ مخواہ آج ان سے بد
زبانی کی۔

وہ بڑی دیر تک یوں ہی لیٹی رہی اندھیرے میں اور ادھر ادھر دیکھتی
رہی۔ شکلیں کے بھاگ کر آنے اور چھپنے کے منظر نے اس کی بیند کو لوٹ
لیا تھا۔ وہ سب سمجھ گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کسی کبھی صورت
میں تشکیل کو نہ جانے دیگی، چاہے اس سلسلے میں اماں سے کتنی ہی دشمنی
مول لینی پڑے۔

رات گئے، وہ سو گئی اور جب صبح اٹھی تو تشکیل کے کمرے کا دروازہ
کھلا ہوا تھا۔ "کیا تشکیل غسل خانے میں ہے؟" اس نے اماں سے پوچھا۔
"میں نے تو صبح اٹھ کر اسے دیکھا نہیں، شاید چلا ہی گیا۔ کام جو
کرنا ہوا، مزدور آدمی ٹھہرا۔ اماں نے بڑے سکون سے جواب دیا۔
سب بھوٹا ہے۔ صبح اس نے جانے کو کہا ہو گا اور اماں نے اسے
اجازت دیدی ہو گی۔" اس نے آپ سے جانے کو کہا ہو گا۔ اور آپ نے
خوش ہو کر اجازت دیدی ہو گی۔" عالمیہ نے غصے سے کہا۔

"تم بولا گئی ہو، مجھ سے بات مت کرو، ورنہ اپنا سر کھوپڑیوں کی۔
اماں باورچی خانے میں چلی گئی۔"

پتہ نہیں اب کب آئے گا، اماں کی اجازت سے کتنا مایوس ہو کر
گیا ہو گا۔ اماں نے کیسا ظلم کیا۔ ان کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔
وہ نفوٹری دیر تک پلنگ سے پاؤں لٹکائے گم سم بیٹھی رہی۔

منہ ہاتھ دھو کر جب وہ اپنے کمرے میں گئی تو کپڑے تبدیل کرنے کے لئے اسے الماری کا تالا کھولنے کی ضرورت نہ پڑی۔ ٹوٹا ہوا تالا چھوڑ ہی کھل گیا۔ پرس کھلا پڑا تھا اور اس کی جمع جتنی سے پاس روپے غائب تھے۔

شکیل میرے بھیا، تم سے اب کبھی ملاقات نہ ہوگی۔ اب تم سدا کے لئے کھو گئے، اب تم کو کون پاسکتا ہے؟“

(۲۹)

بڑی چچی کا خط سامنے پڑا تھا اور وہ نئے حادثے پر لمبول بیٹھی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اب چچی کی زندگی کا کیا بنے گا۔ آخر اس نے اپنی ساس اور اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان آنے سے بیوں انکار کیا۔ آخر اسے یہ کیا سوچھی تھی۔ جس پاکستان کے لئے وہ انہوں نے اپنی چھل چھل کر فرے لگاتی تھی اس پاکستان میں وہ کیوں نہ آئی؟“

اس نے ایک بار بھر خط اٹھا لیا اور اس حصے کو پڑھنے لگی جس پر چچی کے متعلق لکھا تھا۔ چچی نے اپنے میاں کے ساتھ پاکستان جانے سے انکار کر دیا اور جب اس سے ضد کی تو لڑائی پر آمادہ ہو گئی۔ جھگڑا یہاں تک بڑھا کہ چچی نے اپنی ساس کو بال پکڑ کر خوب مارا اور اس کی ساس نے اپنے بیٹے سے اتنی دم ملاق و لودا کر مع لڑکی کے یہاں بھجوا دیا۔ انہوں نے جانے سے پہلے نیچے پیغام بھجوا دیا تھا کہ اب اپنی اس بے لگام لڑکی کا کسی بھنگی سے کالج کر دو ہمارے بیٹے کو تو کراچی میں چاند جیسی دلہن مل جائے گی۔ اب چچی جب سے یہاں

ہے بالکل چپا ہے، اپنی بچی کو سینے سے لگائے دم بخود پڑی رہتی ہے۔ اس چھچی نے ہمیشہ اپنے ساتھ دشمنی کی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا انجام ہوگا میں اسے دیکھتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

”اماں چھچی کو طلاق دیکر اس کے میاں کراچی آگئے، اماں کو قریب آتے دیکھ کر عالیہ نے اطلاع دی۔“

”اسی“ اماں نے حیرت سے عالیہ کی طرف دیکھا اور پھر خط اٹھا کر پڑھنے لگیں اب بیچاری چھچی کیا کرے گی۔ عالیہ سوچ رہی تھی۔

”ٹھیک ہی کیا ان لوگوں نے، بھلا ایسی بڑی سے کوئی نباہ کر سکتا تھا غضب خدا کا، اور ساس میاں دونوں کو پیٹ کر رکھ دیا، اماں نے خط میز پر ڈال دیا اور کمرے کا تڑی بڑی سامان ٹھیک کرنے لگیں۔“

”ہوں!“ عالیہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ والٹن کیمپ سے آکر اس نے کپڑے بھی نہ تبدیل کئے تھے۔ مائے نے اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی پکڑا دی تو وہ کھڑے کھڑے پینے لگی۔۔۔ اسے کیا ہو گیا ہے کمرے میں ہر چیز بکھیر دیتی ہے اور اماں ٹھیک کرتی پھرتی ہیں۔ اتنی لا پرواہی بھی کس کام کی، اماں کیا سوچتی ہوگی۔ چائے کی خالی پیالی مائے کو تھما کر وہ لان میں آگئی جون کی شام بھی کس قدر تپ رہی تھی۔ اونچے اونچے درخت بالکل ساکت کھڑے تھے۔ ایک پتہ تک نہ ہل رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے خشک گھاس پر ٹپلنے لگی۔ اب تو تنہائی اور اُداسی کا شدید احساس ہر وقت ستانے لگا تھا۔ وہ اپنی اس لگی بند زندگی سے کس قدر عاجز آگئی تھی۔

اس وقت بھی جب وہ چھچی کی برباد زندگی کا ماتم کر چکی تھی تو پھر اپنی برباد

زندگی کے لئے سوچنے لگی تھی۔ اب وہ کیا کرے؟ زندگی کس طرح کیے۔
 سوچتے سوچتے اسے چند لمحوں کے لئے ڈاکٹر کا خیال آ گیا۔ عالیہ نے اس کی آچکی
 باتوں کو یاد کرنے کی کوشش کی اور پھر اس طرح جی اچاٹ ہو گیا جیسے کوئی
 عجیب سی حرکت کرنے جا رہی ہو۔ وہ باتیں ہی کیا کرتا ہے۔ ٹھیک ہے
 وہ اچھا آدمی ہے مگر اسے باتیں کرنی ہی کب آئی ہیں؟ کوٹھی، کار، پریکٹس کا حال
 اور بس۔ کوٹھی تو ماموں نے اسے بھی دلا دی، اور رہی کار تو وہ روز
 بس پر جاتی ہے۔ بس یہی فرق ہے تاکہ وہ کار سے بڑی ہوتی ہے۔ اور کسی ایک
 شخص کی ملکیت نہیں ہوتی۔

”اب کھانا کھا لو، یہاں اندھیرے میں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟“
 اماں اس کے پاس آئی کھڑی ہوئیں تو اسے احساس ہوا کہ واقعی اندھیرا پھیل گیا
 ہے وہ اماں کے ساتھ ہوئی۔

”تم ہر وقت چپ رہتی ہو، میں نے تمہارے ماموں کو لکھ دیا ہے کہ۔“
 اماں نے چلتے ہوئے کہا کہ اب تمہاری شادی کا بندوبست کر دیں۔“

”اچھا، مجھے آج معلوم ہوا کہ میں اسی لئے آداس رہتی ہوں۔“ وہ اس
 سچائی پر جھلا گئی۔ مگر آپ نے ماموں کو یہ حق کب سے دیدیا؟ میں تو ان کو مانوں
 بھی نہیں مانتی، مجھے ان سے کوئی مطلب نہیں۔ میں شادی نہیں کرؤنگی۔“

اماں نے اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا مگر چپ رہی۔ ادھر
 کچھ دنوں سے انہوں نے عالیہ کو ڈانڈنا دینا اور اس سے لڑنا چھوڑ دیا تھا۔
 دونوں خاموشی سے کھانا کھاتی رہیں۔ عالیہ کا جی بھر رہا تھا۔ پھر کبھی وہ
 ضبط کیے بیٹھی کھاتی رہی اور اماں جانے کیا سوچتی رہیں۔

(۵۰)

اسکول سے واپسی پر اس نے دیکھا کہ میز پر چھٹی کا خط پڑا ہے۔ جسے اماں
کھول کر پڑھ چکی تھیں۔ خط کا ایک صفحہ کمرے کے فرش پر پڑا تھا اسے ذرا سا
غصہ آیا اور پھر جلدی جلدی خط پڑھنے لگی۔

پیارے بیبا تسلیم۔ آپ کو گئے ایک سال ہونے کو آ رہا ہے مگر آپ نے کبھی
مجھے یاد نہ کیا۔ ٹھیک ہے میرے بھی آپ کو خط نہ لکھا۔ مگر میں آپ کو کبھی نہ
بھولی۔ میں نے تو آپ کو ہر دھوکہ اور خوشی میں یاد کیا اور جب میں بہت خوش
ہوں، میری زندگی میں بہار آگئی ہے تب بھی میں آپ کو یاد کر رہی ہوں بیبا
کاش آپ یہاں ہوتیں تو دیکھتیں کہ میں کتنا خوش ہوں۔ آپ کے جمیل بھیانے
مجھے اپنا بنا لیا ہے، مجھے اب تک یقین نہیں آتا کہ میں ان کی بن گئی ہوں طلاق
کے بعد جب میں اس گھر میں آکر پڑ گئی تھی تو ایسی بات سوچ بھی نہ سکتی تھی۔
بہت دن پہلے جب انہوں نے مجھ سے آنکھیں پھیر لی تھیں تو مجھے اپنی بد نصیبی
کا یقین ہو گیا تھا۔ بیبا اب آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں اسی لئے پاکستان
نہیں گئی تھی۔ وہ مجھے اتنی دورے جا رہے تھے جہاں سے پلٹ کر پھر میں جمیل
کو نہ دیکھ سکتی۔ وہ ظالم لوگ مجھ سے سب کچھ چھیننے لے رہے تھے۔

بیبا، مزے کی بات تو یہ ہے کہ بڑی چچی جمیل کے لئے رشتہ تلاش کر رہی
تھیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جمیل کی دلہن کی خدمت کر کے زندگی گزار لوں
گی، کبھی تو جمیل کو احساس ہوگا، وہ پتیا کیں گے، انہیں افسوس ہوگا اس
وقت میں سمجھوں گی کہ مجھے محبت میں کامیاب ہو گئی۔ میں نے انہیں پال لیا۔

مگر اس کی نوبت نہ آئی بچیا اور اس دن جب بڑی چچی لڑکی کے گھر آخری
 جواب لینے جا رہی تھیں تو رات کو جمیل بچیا میرے پاس آ بیٹھے اور میری
 جیا کو گود میں لے کر کھلانے لگے۔ میں چپ بیٹھی رہی۔ جب سے طلاق لے کر
 آئی تھی انہوں نے مجھ سے بات بھی نہ کی تھی۔ میں کیا منہ لے کر ان سے بات
 کرتی۔ آپ ہی پوچھنے لگے کہ تم پاکستان کیوں نہیں گمیں؟ بچیا، میں
 انہیں کیا جواب دیتی۔ مارے دکھ کے کلیجہ کھٹ رہا تھا کہ جس کی خاطر
 اتنا سب کچھ کیا وہ یہ بھی نہیں جانتا میں رونے لگی تو وہ ایک دم بے چین
 ہو گئے۔ اور مجھے لپٹا لیا اور میری بچیا سے پوچھنے لگے کہ تیرا باپ بن جاؤں؟
 پھر مجھ سے بولے کہ چھی تمہاری محبت مجھ پر قرض ہے۔ اب اس قرض سے تجا
 پاؤں گا۔ وہ میرے آنسو پوچھ کر نیچے چلے گئے اور دوسرے دن بڑی
 چچی نے میرے ہاتھوں میں منہدی لکھا مجھے داہن بنا دیا۔

اب میں بہت خوش ہوں بچیا، جمیل میری فکر رکھتے ہیں میری بچیا کو
 بہت چاہتے ہیں، بچیا، آپ کو ایک بات بتاؤں۔ جب بچیا ہوئی تھی تو میں نے
 یہ سوچا ہی نہ تھا کہ یہ جمیل کی بیٹی نہیں ہے۔

بڑی چچی بہت خوش ہیں، میں ان کی خوب خدمت کرتی ہوں کہ زمین بوا
 بھی بہت خوش ہیں۔ کہتی ہیں کہ اپنا خون اپنوں میں آ گیا۔ ہر دم بچیا کو لپٹا
 پھرتی ہیں آپ کو بہت یاد کرتی ہیں اب گھر کی بڑی اچھی حالت ہے بس بڑی
 چچی کو شکیل بہت یاد آتا ہے۔ اچھا بچیا اب رخصت ہوتی ہوں۔ اللہ کے
 میری بچیا کو بھی چاند بچیا دو اہلے بچیا اب آپ بھی جلدی سے شادی کر لیجئے۔
 چھوٹی چچی کو آداب کہئے۔
 آپ کی پیاری چھی

خط ختم کر کے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت کتنی خالی اور ویران ہو رہی تھی۔ "بڑا اچھا ہوا چھمی کا زندگی بن گئی۔" اس نے ایسی آواز میں کہا جو اس کی اپنی نہیں تھی۔

"اور کیا ملتا جمیل میاں کو، برتی ہوئی چھمی ہی ملنا تھی" اماں نے بڑے سکون سے کہا۔

عالیہ خاموشی سے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی اور یوں ہی بے مقصد ادھر ادھر دیکھنے لگی پھر تھوڑی دیر بعد اٹھ کر والٹن کیمپ جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔

(۱۵)

آج ڈاکٹر نے اس سے بڑی التجا سے شادی کی درخواست کی تھی۔ زمین سکون سب اس کے نام لکھنے کے لئے کہا تھا۔ ساری زندگی اس کے قدموں پر گزارنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور جب وہ یہ سب کر رہا تھا تو ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ وہ ہاں کہہ دے، وہ اس سائے تلے بیٹھ جائے مگر جب وہ افراد کرنا چاہتی تھی تو اسے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ کار، کوٹھی، بینک بیلنس اور یہ ڈاکٹر جو والٹن کیمپ میں لے جئے ان انوں کا علاج کمرے کے روپے کا تلبے۔ بس اس نے یہی چاہا تھا؟ کیا اس کا معیار یہی شخص تھا؟ اور وہ جانے کس جذبے کے تحت وہاں سے "نہیں نہیں" کہتی بھاگ آئی تھی اور اب اپنے گھر میں پڑی سوچ رہی تھی کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے اور ہر تو اتنے دن ہو گئے تھے کہ اسے جمیل بھیا کی یاد کبھی نہ آئی تھی اس نے بڑی چھپی کے خطوں کا جواب

کبھی نہ دیا تھا۔ اس تو وہاں سے تمام رشتے توڑ لئے تھے اسے اب کوئی دلچسپی نہ محسوس ہوتی تھی۔

بادل ٹہرے زور سے گھر کو آگئے تھے۔ وہ کمرے سے نکلا، باہر لان میں آگئی بارشوں نے گھاس کو گھنا اور سبز کر دیا تھا۔ بھگی بھگی ہوا میں ٹہلتے ٹہلتے اس نے دیکھا کہ پھاٹک کے پاس کوئی شخص کھڑا ایسے دیکھ رہا ہے۔

”میں اندر آ جاؤں عالیہ بی بی؟“ وہ آگے بڑھنے لگا۔

چالیس بیالیس سال کی ایک پرکشش شخصیت اس کے سامنے کھڑی تھی عالیہ نے اسے حیران نظروں سے دیکھا۔ جانے کہاں دیکھا ہے، کس سے ملتی صورت ہے۔ اس نے اپنے ذہن پر زور ڈالا۔ ”آپ کون ہیں؟“ آخر اس نے پوچھا۔

”میں صفدر ہوں۔ تم نے پہچانا نہیں عالیہ بی بی؟ یہ سامنے والی کوٹھی میں آتا جاتا تھا آج انھوں نے تمہارے ماموں کا ذکر کیا اور بتایا کہ ان کی بہن یہاں سامنے رہتی ہیں۔ میں ضبط نہ کر سکا تم سے ملنے کو تڑپ گیا۔ چچی کہاں ہیں؟ مگر خیر انھیں میرے آنے کی اطلاع نہ دو،“ وہ منمنائے۔

”صفدر بھائی!“ عالیہ نے مشکل آواز نکالی۔ ماضی اس کے سامنے ماتم کرتا آگیا۔ ”اچھا تو آپ اب آئے ہیں بیٹھ جائیے، آپ کو کیا کام ہے؟“ عالیہ نے سر دھری سے کہا۔

”عالیہ بی بی، اتنی مدت گزر گئی۔ بارہ تیرہ سال کا عرصہ، اس کے بعد ابھی میرے لئے تمہارے دل سے نفرت نہ گئی۔ مگر میں غلط کہہ رہا ہوں تم تو مجھ سے نفرت نہ کرتی تھیں۔ تمہیں یاد ہے نہ؟ تم بھولیں تو نہیں؟“

بارہ تیرہ سال گزرنے کے بعد بھی ان کی آواز میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہی لجاجت وہی بیچارگی۔

آپ کہاں رہتے ہیں؟ آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟ "عالمیہ نے پوچھا وہ ان سے باتیں کرنے پر مجبور ہو کر گئی تھی۔ ان کی آواز کی لجاجت نے جیسے اس کا دل پگھلا دیا تھا۔ اسے یاد آ رہا ہے کہ کبھی اس شخص نے اس کے گھر میں زندگی کے بدترین دن گزارے ہیں۔

"میرا بیوی بچے؟" وہ بے بسی سے منہ سے "تہمینہ کے بعد میری زندگی میں کوئی عورت داخل نہیں ہوئی مجھے اس کے لئے تباہ و عالمیہ لیا جی۔" جب آپ تہمینہ آپ کو چھوڑ کر چلے گئے اور جب آپ نے اسے کبھی نہ پوچھا اور نہ صرف ایک خط لکھ کر اسے مر جانے پر مجبور کر دیا تو اب میں آپ کو کیا تباہوں اب آپ یہ معلوم کر کے غوش ہونا چاہتے ہیں کہ اس نے نہ ہر کھا لیا تھا۔ جمیل بھیا کی بننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بے وقوف تھی اس لئے مر گئی آپ دانا تھے اس لئے زندہ رہے اور آج اتنی مدت بعد مجھے ماضی کی یاد دلانے کے لئے میرے سامنے بیٹھے ہیں۔"

"میں زندہ ضرور ہوں مگر مرے سے کبھی بدتر تمہارا خیال ہے کہ اگر میں وہاں ہوتا تو مجھے چچی اپنا بنانا پسند کرتیں؟ ایسا ناممکن تھا بھرا پراگر تباہ ہو جانا اسی لئے میں راہ سے ہٹ گیا۔ میں نے روپے لینا بھی بند کر دیئے تھے۔ تم سوچ نہیں سکتیں کہ اس کے بعد زندہ رہنے کے لئے مجھے کیا کچھ کرنا پڑا۔ بہر حال میرا ضمیر صاف ہے۔ میں سب کام کرتا رہا اور اس کے بدلے میں بڑا چپا کی طرح جیل کا مٹا رہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تہمینہ مجھے بھولے گی نہیں

اور جان دے دیگی۔۔۔ ان کی آرزیاؤں کے بوجھ سے کانپنے لگی تو وہ خاموش ہو گئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

”اب آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کچھ تو اپنے لئے بتائیے۔ پرانی باتوں کو نہ اُکھیریں، اب مجھ میں برداشت کی طاقت نہیں رہی۔ وہ اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

ذرا دیر کے لئے بالکل خاموشی چھا گئی۔ عالیہ سر جھکائے بیٹھی تھی جیسے ہر زمانے کی ایک بات اسے یاد آ رہی تھی اسے خورہ مخورہ صفحہ دکھائی دے بے پناہ ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ آخر ان کا کیا قصور تھا۔ آپا کمزور تھیں وہ اپنی بات نہ منوا سکتی تھیں اس لئے اماں نے گھر کو تباہ کر دیا۔ عالیہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو صفحہ دکھائی اسے بڑے اشتیاق اور پیار سے دیکھ رہے تھے کچھ اس طرح عالیہ کی نظر میں جھک گئیں۔ اور وہ بکرا گھرا گئے۔

”مجھے اپنے لئے بتائیے۔ اس نے پھر کہا۔

”میں اپنے لئے کیا بتاؤں؟ یہاں آنے کے بعد دوبارہ سیفی ایکٹ کے تحت جیل جا چکا ہوں اور اب تنگ سا گیا ہوں۔ پر اب بھی میں یہی ہمتا ہوں کہ شکوں نہیں، زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرتا رہوں اور۔۔۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

ذرا دیر کے لئے پھر خاموشی چھا گئی۔ بڑی بے ڈھنگی سے خاموشی، جیسے

کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا بات کہے۔ آج عالیہ کے سامنے وہ شخص بیٹھا تھا جس نے مدتوں اس گھر میں عذاب سہمے تھے گناہوں سے پہلے وہ نہ

کے مزے بھیل لئے تھے ، جیسے چھپڑوں کا قیمہ اور ڈھیروں پانی ملا دو دھر دیا جاتا جسے کئی کئی دقتوں کا باسی سڑا ہوا کھانا کھلا کر اس کی موت کی دعائیں مانگی جاتیں۔ اس کا تصور صرف یہی تھا کہ وہ شریب باپ کا بیٹا تھا کہتے ہیں کہ حشر کے روز ماں کے نام سے پکارا جائے گا۔ کاش صفدر بھائی کے لئے رکھی یہ دنیا نہ روز حشر تھی رہتی ، انہیں جاگیر دار کی بیٹی سلمہ پھر کھی کے نام سے یاد کیا جاتا۔ پھر تو یقیناً ان کی قیمت بڑھ جاتی۔

سوچتے سوچتے اس نے صفدر بھائی کی طرف دیکھا ، وہ آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے سر ہٹیکے جانے کیا سوچ رہے تھے۔ اس وقت وہ اسے بڑے منظوم نظر آ رہے تھے۔ بالکل پہلے جیسے صفدر بھائی۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ گھر کے لڑائی جھگڑوں سے ہراساں ہو کر منہ بسورتی پھرتی تو یہی صفدر بھائی اس کو خوشیوں کی راہ دکھاتے اور اس کی خاطر اماں کی تیز گورتی نظروں کے تیر اپنے کلیجے کے پار کر لیتے۔

اس نے پھر ان کی طرف دیکھا تو وہ اسے بڑے پیار سے تک رہے تھے کچھ ایسی بچی سی نظروں کہ وہ بوکھلا کر رہ گئی اور صفدر بھائی بھینپ گئے۔ عالیہ بی بی مجھے آج بھی تہنیز سے اسی طرح محبت ہے " آج جب یہاں بیٹھا ہوں تو جانے کیا کیا یاد آ رہا ہے۔ تم تو بڑی ہو کر بالکل تہنیز جیسی لگنے لگی ہو ا ہو بہو تہنیز تمہیں دیکھ کر خیال ہی نہیں آتا کہ وہ مر گئی ہے "۔

وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ بادلوں سے لدی پھندی شام اور اس لگ رہی تھی۔ اس نے صفدر بھائی کو غور سے دیکھا جن کی آنکھوں سے دو آنسو لڑھک کر رخساروں پر بہ رہے تھے کیا سچ سچ صفدر بھائی آج۔

تک تہمینہ کو اسی طرح چاہتے ہیں؟ اور کیا اسی لئے ان کی زندگی میں کوئی عورت نہ آسکی؟ اور آج وہ اس کو صرف اس لئے اتنے پیار سے دیکھ رہے ہیں کہ وہ تہمینہ جیسی دکھائی دیتی ہے؟ عالیہ کو یاد آیا کہ صفدر بھائی تہمینہ کو ایسی نظر و نسبے چھپے چوری دکھا کرتے تھے کیا محبت اتنے دنوں تک بھی زندہ رہتی ہے؟ اب صفدر بھائی کتنے تنگ چکے ہیں، کتنے بہت سے بال سفید ہو گئے ہیں۔ شاید انہوں نے کبھی سکھ کی سانس نہ لی ہوگی۔“

صفدر بھائی کیا سچ سچ میں تہمینہ آپا جیسی لگتی ہوں؟ اس نے اچانک سوال کیا اور پھر اپنے سوال پر خود ہی گھبرا گئی۔

”ہاں بالکل اسی جیسی“۔ وہ پھر اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں بار بار کھول جاتا ہوں کہ تم وہ نہیں ہو مگر تم تہمینہ ہو میں تو مجھے اپنے دل میں چھپا لیتیں، مجھے زندگی کی خوشیاں دیدیتیں۔“ وہ جیسے خواب میں بولنے لگے۔ تم تہمینہ بن جاؤ، عالیہ، تم میری بن جاؤ، میں تنگ کیا ہوں۔“ وہ اٹھ کر اس پر جھک گئے۔ تم میرا ساتھ دیدو، تہمینہ کہتی تھی کہ میں جو کچھ بھی کروں گا وہ میرا ساتھ دے گی اور کیا کچھ کہتی تھی۔ وہ جیسے ہوش میں آکر بیٹھ گئے۔

عالیہ نے آنکھیں موند لیں، وہ کچھ ایسی کیفیت میں ڈوبی ہوئی تھی جیسے کسی گدہن کو پہلی بار اس کے دولہا کے کمرے میں لے جایا جا رہا ہو۔ اس کے کانوں میں آندھیوں جیسی سائیس سائیس ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں صفدر بھائی کرسی پر بیٹھنے کے بعد اور کیا کہتے رہے اس نے سنا ہی نہیں۔ وہ بالکل بہری ہو رہی تھی۔

”کیا آج اٹھنے کا ارادہ نہیں؟“ اماں برآمدے میں آکر کہہ رہی تھیں۔“

اور یہ کون بیٹھا ہے وہاں وہ پاس آگئیں۔
عالیہ نے ہوش میں آکر ان کی طرف دیکھا۔ وہ صفدر بھائی کو پہنچانے کی
کوشش کر رہی تھیں۔

”السلام علیکم چچی، صفدر بھائی منمنائے، ان کے چہرے پر ہوا میاں اڑ
رہی تھیں۔“

”تم۔۔۔؟ اماں پہچان کر زور سے ہاتھ منگانے لگیں۔ تم یہاں کس لئے آئے
ہو۔ اس گھر کا بیٹھا نہیں چھوڑو گے کبھی؟ سب کچھ تم باہر ہو گیا۔ تم نے اب کیا
چھوڑا ہے؟“

”میں۔۔۔ میں ملنے آیا ہوں، آپ لوگوں کو دیکھنے کے لئے بھی چاہ رہا تھا، ابھی
چلا جاؤں گا چچی۔ انہوں نے عالیہ کو الوداعی نظروں سے دیکھا تو اسے اپنا کلیجہ
پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔“

”یہ نہیں جائیں گے اماں، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ ہمیشہ میرے پاس
رہیں گے، آپ ہم دونوں کو ایک کر دیجئے۔“ عالیہ نے نظریں جھکا کر بڑے
عزم سے کہا۔

”افوہ! لعنتی، تم اتنی دیر سے یہاں بیٹھے عالیہ کو کون سی پٹی پڑھا رہا ہے
۔۔۔ مارے غصے کے اماں کی آنکھیں ابل پڑ رہی تھیں۔“ تم ابھی یہاں
سے نکل جاؤ۔“

”میں تمہیں آپا کی طرح گونگی نہیں ہوں اماں، یہ نہیں جائیں گے، عالیہ کو
اپنے گلے میں کانٹے چھبے معلوم ہو رہے تھے۔“

”اماں نے پٹی پٹی نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھا۔ کیا تم نے اسی دن کے

لئے لکھا پڑھا تھا؟

”میں کوئی بڑا کام نہیں کر رہی ہوں“ اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

اس کے سامنے صفدر بھائی بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ عالیہ نے پیار سے ان کی طرف دیکھا۔ ساری زندگی دنیا کے لئے وقف کر رکھی مگر ان کا کوئی نہ بنا کسی نے ساتھ نہ دیا۔ اب وہ ضرور ساتھ دے گی۔

”تم ضرور شادی کرو، میری طرف سے اجازت ہے، میں کل اپنے بھائی کے گھر چلی جاؤں گی میں مرتے ہوئے تم کو دودھ نہ بنھوں گی۔ مجھے اس وقت بڑی خوشی ہو گی کہ تم میری زندگی میں سلمہ کی طرح نباہ ہو جاؤ۔ یہ شخص جیلوں میں زندگی گزارے اور تم گھر میں پڑی تڑپو۔“

میں ان کا انتظار کیا کروں گی اماں، میں تڑپوں گی نہیں، میں سلمہ بھوپھی

کی طرح بھی نہیں مرونگی۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

اماں نے ساری کا آنچل اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ ان کا جسم لہ نہ رہا

تھا۔

”چچی آپ کہیں نہیں جائیں گی“ صفدر بھائی نے التجا کی۔ ”میں آپ

کی خدمت کروں گا“ میں نے اپنی زندگی کی ٹوکر کو بدل دیا ہے، دنیا تباہ ہوتی

ہے تو ہو جائے۔ مجھے کوئی مطلب نہیں میں اب صرف دولت کماؤں گا، عیش

کرونگا، میں اب کار، کوٹھی کے خواب پورے کرونگا میں اب جیل نہیں جاسکتا،

میں اب امپورٹ ایکسپورٹ کا لائی سنس لینے کی کوشش کر رہا ہوں بہت

جدل جائیگا، چچی میں اب بڑا آدمی بن جاؤں گا۔ آپ مجھے قبول کر لیجئے۔“

”ہیں!“ عالیہ نے اجنبیوں کی طرح صفدر بھائی کی طرف دیکھا۔ ارے

بس آپکی زندگی کا یہی مقصد رہ گیا ہے۔ بس اتنی سی بات۔ عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ بہت دور سے رتیلے میدانوں میں سے چل کر آرہی ہے۔ تھکن سے بڑھ کر حال جنم جنم کی پیاسی۔ ادرے کوئی تو اس کے حلق میں ایک قطرہ پانی کا ٹپکائے۔ پہلے کچھ بن کر دکھاؤ پھر میں عالیہ کی خواہش پوری کروں گی۔ اماں نے ٹری چالاک سے معاملے کو ٹالنے سے لے کہا۔

میں شادی نہیں کروں گی اماں۔ آپ بھی سن لیجئے صفر بھائی، میں شادی نہیں کروں گی۔ وہ کہہ سی سے اٹھی۔ اب جب آپ یہاں آئیں تو سوچ لیجئے گا کہ مجھے تمہیں اپنا یاد آتی ہیں، میں اس یاد سے چھٹکارہ چاہتی ہوں۔ وہ تیز تیز کہنے سے اپنے کمرے کی طرف بھاگنے لگی۔ خدا حافظ۔

جب وہ اپنے کمرے میں بے سُدھو ٹری تھی تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ چھپی اس کے سینے پر دھم دھم کرتی گزر گئی۔ میں نے آپ کو ہرا دیا بھیا، میں نے آپ کو ہرا دیا بھیا۔

اس نے دونوں ہاتھ زور سے اپنے سینے پر باندھ لئے۔

(تکام شد)

لائبریری ایدرٹیشن کی دیگر طبوعات

- | | | |
|------|-----------------|------------------|
| 4/50 | شکت صدیقی | خدا کی بیتی |
| 21- | رتبہ۔ رضی کاظمی | انتخاب اودھ پرنج |
| 2/25 | خلیل الرحمان | عذرا |

کھنڈ کتاب دنیا۔